

# تذکرہ معاصرین

## جلد اول

مالک رام

مکتبہ جاتی دہلی

اشتراک

پیشکش کنندہ: مکتبہ جاتی دہلی

# تذکرہ معاصرین

جلداول

مالک رام

مکتبہ جامعہ ملیہ  
دہلی

اشتراک

پیشکش کنندہ: مولانا ابوالکلام آزاد

Rs. 136/-



## فصل دفتري

011-26987295 

مکتبہ جامعہ لٹریچر، جامعہ محمدیہ، نئی دہلی۔ 110025

**Email:** [monthlykitabnuma@gmail.com](mailto:monthlykitabnuma@gmail.com)

## خلاصہ

011-23260668 

مکتبہ جامعہ لیتل وائٹ و پازار، جامع مسجد علی۔ 110006

022-23774837 

کتابخانه ملی، پرنس ہڈنگ، ممبئی۔ 400003

0571-2706142 

مکتبہ جامعہ لیتھو، ہونیوررٹی پارک، علی گڑھ۔ 202002

011-26987295 

کتب خانہ لیبز، بھوبالی گراؤنڈ، جامعہ گریجویٹ ہائی۔ 110025

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

قیمت: 136 روپے

1100 2000 3000 4000 5000 6000 7000 8000 9000 10000 11000 12000 13000 14000 15000 16000 17000 18000 19000 20000 21000 22000 23000 24000 25000 26000 27000 28000 29000 30000 31000 32000 33000 34000 35000 36000 37000 38000 39000 40000 41000 42000 43000 44000 45000 46000 47000 48000 49000 50000 51000 52000 53000 54000 55000 56000 57000 58000 59000 60000 61000 62000 63000 64000 65000 66000 67000 68000 69000 70000 71000 72000 73000 74000 75000 76000 77000 78000 79000 80000 81000 82000 83000 84000 85000 86000 87000 88000 89000 90000 91000 92000 93000 94000 95000 96000 97000 98000 99000 100000 101000 102000 103000 104000 105000 106000 107000 108000 109000 110000 111000 112000 113000 114000 115000 116000 117000 118000 119000 120000 121000 122000 123000 124000 125000 126000 127000 128000 129000 130000 131000 132000 133000 134000 135000 136000 137000 138000 139000 140000 141000 142000 143000 144000 145000 146000 147000 148000 149000 150000 151000 152000 153000 154000 155000 156000 157000 158000 159000 160000 161000 162000 163000 164000 165000 166000 167000 168000 169000 170000 171000 172000 173000 174000 175000 176000 177000 178000 179000 180000 181000 182000 183000 184000 185000 186000 187000 188000 189000 190000 191000 192000 193000 194000 195000 196000 197000 198000 199000 200000 201000 202000 203000 204000 205000 206000 207000 208000 209000 210000 211000 212000 213000 214000 215000 216000 217000 218000 219000 220000 221000 222000 223000 224000 225000 226000 227000 228000 229000 230000 231000 232000 233000 234000 235000 236000 237000 238000 239000 240000 241000 242000 243000 244000 245000 246000 247000 248000 249000 250000 251000 252000 253000 254000 255000 256000 257000 258000 259000 260000 261000 262000 263000 264000 265000 266000 267000 268000 269000 270000 271000 272000 273000 274000 275000 276000 277000 278000 279000 280000 281000 282000 283000 284000 285000 286000 287000 288000 289000 290000 291000 292000 293000 294000 295000 296000 297000 298000 299000 300000 301000 302000 303000 304000 305000 306000 307000 308000 309000 310000 311000 312000 313000 314000 315000 316000 317000 318000 319000 320000 321000 322000 323000 324000 325000 326000 327000 328000 329000 330000 331000 332000 333000 334000 335000 336000 337000 338000 339000 340000 341000 342000 343000 344000 345000 346000 347000 348000 349000 350000 351000 352000 353000 354000 355000 356000 357000 358000 359000 360000 361000 362000 363000 364000 365000 366000 367000 368000 369000 370000 371000 372000 373000 374000 375000 376000 377000 378000 379000 380000 381000 382000 383000 384000 385000 386000 387000 388000 389000 390000 391000 392000 393000 394000 395000 396000 397000 398000 399000 400000 401000 402000 403000 404000 405000 406000 407000 408000 409000 410000 411000 412000 413000 414000 415000 416000 417000 418000 419000 420000 421000 422000 423000 424000 425000 426000 427000 428000 429000 430000 431000 432000 433000 434000 435000 436000 437000 438000 439000 440000 441000 442000 443000 444000 445000 446000 447000 448000 449000 450000 451000 452000 453000 454000 455000 456000 457000 458000 459000 460000 461000 462000 463000 464000 465000 466000 467000 468000 469000 470000 471000 472000 473000 474000 475000 476000 477000 478000 479000 480000 481000 482000 483000 484000 485000 486000 487000 488000 489000 490000 491000 492000 493000 494000 495000 496000 497000 498000 499000 500000 501000 502000 503000 504000 505000 506000 507000 508000 509000 510000 511000 512000 513000 514000 515000 516000 517000 518000 519000 520000 521000 522000 523000 524000 525000 526000 527000 528000 529000 530000 531000 532000 533000 534000 535000 536000 537000 538000 539000 540000 541000 542000 543000 544000 545000 546000 547000 548000 549000 550000 551000 552000 553000 554000 555000 556000 557000 558000 559000 560000 561000 562000 563000 564000 565000 566000 567000 568000 569000 570000 571000 572000 573000 574000 575000 576000 577000 578000 579000 580000 581000 582000 583000 584000 585000 586000 587000 588000 589000 590000 591000 592000 593000 594000 595000 596000 597000 598000 599000 600000 6010

2011 12/15

1541-1542

ISBN : 978-81-7587-658-3

تاریخ: ۱۱/۰۲/۱۴۰۲ قادیان کی قتل عام کے شہداء کی یاد میں، قادیان کی قتل عام کے شہداء کی یاد میں، قادیان کی قتل عام کے شہداء کی یاد میں۔ ۱۱/۰۲/۱۴۰۲

49539099: 49539000:

ای میل: urduocouncil@gmail.com : ویب سائٹ: www.urduocouncil.nic.in

طالع جلاله اسحقك سكرتير الفيس برون C-718 في مركز المشرق لبريد عمان، طي. 110635

اس کتاب کی مصداقی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

## معروضات

کارمین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لیڈنڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں، حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سہاگہ بن کر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کئی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی پیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلباء کے لیے ”دری کتب“ اور ”معیاری میر“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ دوسرے چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ قسط پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کیا اب بلکہ نایاب ہوتی جاری تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناکامیوں سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین اور جامعہ طیبہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ڈائریکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لیڈنڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عمل اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آج سے بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

شیجنگ ڈائریکٹر، مکتبہ جامعہ لیڈنڈ



# تعارف

بعض احباب کے تعاون سے ۱۹۶۶ء کے اواخر میں دلی میں علمی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے اصلی مقصد یہ تھا کہ ہم لوگ کبھی کبھی مل بیٹھیں، جب کسی علمی یا تحقیقی موضوع پر تبادلہ خیالات کیا جاسکے۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ مجلس اپنا رسالہ بھی شائع کرے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق کتابی، اتھریا، ۱۹۶۷ء میں جاری کیا گیا؛ اس کی ترتیب میرے سپرد ہوئی۔ ابھی ایک ہی شمارہ شائع ہوا تھا کہ لکھنؤ میں میرزا جعفر علی خاں اثر لا انتقال ہو گیا۔ میر ان کے برسوں کے تعلقات تھے جب میں آئی کہ ان کے مختصر حالات تحریر میں شائع کر دوں۔ ابھی ادا وہ کر رہا تھا کہ رفیق مارہروی کے بھی انتقال کی خبر موصول ہوئی؛ یہ بھی میرے ملنے والے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ اچھا، ان کے بھی سہی۔ ہمتی سے وہ کتابی ختم ہوتے ہوئے چار پانچ صاحب دماغ مفارقت دے گئے؛ اور میں نے ۱۹۶۷ء کی دوسری کتابی کے شمارے میں ان سب کے مختصر حالات شائع کر دیے۔ یوں گویا تحریر میں دفیات کے مستقل باب کا اضافہ ہو گیا۔

یہ فیصلہ کسی ٹری سی ٹری گھڑی میں ہوا تھا۔ وہ دن، اور آج کا دن؛ اس کے بعد شاید یہ کوئی کتابی ایسی گذری ہو، جس میں کسی نہ کسی مرحوم کے حالات مجھے نہ لکھنا پڑے ہوں۔ جب خیال کرتا ہوں کہ ان پانچ برس میں ستر سے زیادہ اہل علم و قلم ہم سے جدا ہو گئے

ہیں تو کچھ مزہ کو آتا ہے۔ جو جاتا ہو، اپنی جگہ کچھ اس طرح سے خالی کر جاتا ہے کہ پھر کوئی اسے کا حقہ پر نہیں کر سکتا۔ کہنے کو قضا بہ خست کے بغیر کوئی کام بند نہیں۔ اور یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ موت ابن آدم کی میراث ہے؛ جو پیدا ہوا ہے، اسے ایک نہ ایک دن ضرور مرنا ہے۔ آج وہ اکل ہمارا بادی ہے۔ لیکن ہم میں سے کس کی خواہش نہیں ہوتی کہ کاش غائب کوئی دن اور زندہ رہتے، تاکہ نہ صرف ہم خود ان سے مستفید ہو سکے، بلکہ وہ اپنے علم و فضل، اختیار و کردار سے نئی نسل کو بھی روشنی دکھاتے، جس سے ہماری ذہنی اور اخلاقی اقدار اور زندگی کا تسلسل قائم رہتا۔ اس سے نہ صرف ان کی جذباتی اور موت کے صدمے کی شدت کم ہو جاتی، بلکہ یہ اطمینان بھی رہتا کہ جس کام کے لیے وہ بنے، اور جو راہ انہوں نے دکھائی، اس کام کے کرنے والے اور اس راہ پر چلنے والے اب بھی موجود ہیں۔

میں نے حتی الوسع حالات کی صورت سے متعلق اطمینان کر لیا ہے۔ میری اپنی یادداشت تو ہے ہی کیونکہ خوش قسمتی سے اس دور کے بہت سے اصحاب سے میرے ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ کم و بیش یادداشتیں بھی رکھی رکھی ہیں۔ اس کے باوجود میں نے بالعموم مرحومین کے پسندگان اور دوست احباب سے بھی استمداد کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ بے حیب اور غلطی سے ستر اذات تو صرف خدا کی ہے، اس لیے کاٹا صحت کا دعویٰ غلط ہو گا۔ لیکن اس طرح سے جتنا کچھ جمع کر سکا ہوں، مجھے یقین ہے کہ اس میں سقم کے راہ پا جائے گا۔ امکان بہت کم رہ گیا ہے۔

اور میں تذکرہ نمبر کسی کی ردایت بہت پرانی ہے۔ شروع میں ان تذکروں کی حیثیت بیاض سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ تذکرہ نگار کی بیشتر توجہ اشعار کے جمع کرنے پر رہتی تھا۔ اکتاف ضحّا اور وہ بھی ایک آدھ سطر میں لکھ دیے جاتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، حالانکہ مستقل تر ہوتے چلے گئے۔ لیکن قدیم تذکروں کی وہی مختصر یادداشتیں آج تاریخ اور

کا خام مواد ثابت ہو رہا ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر کہیں قدمائے یمن کے مرتبہ ذکیے ہوتے، تو تاریخ ادب کی تکمیل کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔

ادھر بہت دن سے کوئی قابلِ قدر تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ معاصرین کے حالات سے خاص کر بے توجہی برتی جا رہی ہے۔ میرے علم میں ان کے مصدقہ حالات کہیں جمع نہیں ہو رہے ہیں۔ اس طرح جو خلا پیدا ہو رہا ہے، اس کے اثرات آج تو نہیں، زمانہ گزرنے کے ساتھ عکس ہو گئے، جب مؤرخ ادب اس دور کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کریگا۔ اس وقت اسے ان اصحاب کے حالات جمع کرنے میں جو وقت پیش آئیگی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اساتذہ متقدمین دسترس میں سے متعلق کتنی معلومات اور تفصیلات ہیں، جن کی کھوج میں آج ہم سرگرداں ہیں۔ اگر حسن اتفاق سے کہیں سے کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی ہے، تو ہمیں کتنی مسرت ہوتی ہے، اور دریافت کرنے والے کو کتنا فخر۔ جو سائیاں ہیں میسر ہیں، وہ بعد کے مؤرخ کی دسترس سے باہر ہونگی۔ اس سے بھی ہماری ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔

اسی خیال سے میں نے مروجین کے حالات، جہاں تک ہو سکا، پوری تفصیل سے قلمبند کر دیے ہیں۔ ممکن ہے، کسی صاحب کے نزدیک بعض تفصیلات غیر ضروری ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والا مؤرخ ان کی قدر کو گھاؤ مارے گا۔ اس کا کام بہت آسان ہو جائیگا۔ دنیات میں شائع شدہ حالات کے کتابی شکل میں منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا، تو میں نے ان پر نظر ثانی کی۔ جہاں کہیں کوئی کھانچا نظر آیا، اُسے پر کرنے کی کوشش کی۔ جن اصحاب کی نظر سے یہ مضمون، تحریر، اس گزر چکے ہیں، وہ بھی مقابلہ کرنے پر بہت فرق پائیگی، انہیں کئی مقامات پر اضافہ ملے گا، اجمال کی جگہ تفصیل نظر آئیگی۔ دو ایک نام کا اضافہ بھی ہو جائے گا۔ جن کے حالات پہلے لکھنے سے رہ گئے تھے، نیز میں نے خیال کیا کہ ان میں جو شاعر حضرات تھے، اگر ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کر دیا جائے، تو اس سے

استغفارے اور لمبھی کا دائرہ وسیع تر ہو جائیگا۔ یہ بجائے خود بہت محنت طلب کام تھا۔  
بارے پر بھی ہو گیا۔ غار شد۔

میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مختلف شعرا کے حالات اور دوا دین چٹیا  
کرنے میں مدد فرمائی۔

مالک رام

نئی دہلی

۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء

# فہرست

## بترتیب حروف تہجی

۲۸۰	باسط اوجہی، نیاز محمد خان	۱۹۳	آبرہی، آرتھرمیان
۳۱۰	بشیر احمد (میاں)	۲۷۱	آغا گلش، طفیل احمد
۱۳۲	بنجور، عباس علی خان	۳۸	آفتاب پانی پتی، انوپ چند
۲۵۱	بیدل بیکانیری، شیخ محمد عبداللہ	۲۸	اثر لکھنوی، جعفر علی خان
		۹۵	احمد شجاع، حکیم
۹۴	پرہیز شاہدی، محمد اکرام حسین	۳۲۳	اختر تلمیری، اختر علی
		۲۰	انگلر فیروز چودی، نند کشور
۱۹۲	ناج لاہوری، امتیاز علی	۲۶۳	اسرار احمد، آناد
۳۲۷	نکسین قریشی، محمد حسین	۳۷۳	افقر مولانی، وارث، تید محمد حسین
		۱۲۳	الم مظفر نگری، محمد اسحاق
۱۸۱	جامی حید آبادی، خود شیدا احمد	۸۰	امین حزی، محمد سیح پال
		۱۵۸	انتظام اللہ شہابی، مفتی

۳۲۸	حبیب اشرف دہلوی، حبیب احمد	۱۰۹	شار، نیش کار
۲۳۶	حق حسین برٹھی، توفیق الحق	۲۸۳	شاعلی جمپوری، احقر ام الدین
۲۵۲	غیر محمودی، ابوالخیر	۲۳۸	شاعلی قادری، محمد شاعلی
۲۷۵	دیا بریلوی، ارارائن داس ٹنڈن	۲۵	شاہد احمد دہلوی
۹۷	ذاکر حسین، ذاکٹر	۷۲	شفا گوایاری، محمد حسن
۲۵۵	راز بگرامی، سید شریف الحسن	۱۹۹	شکیل بدایونی، شکیل احمد
۱۵۳	راز پانڈپوری، محمد صادق	۵۳	صولت ٹوٹی، محمود الحسن مرہ
۲۲	رفیق ابرہوی، رفیق احمد	۲۱۸	ضیاء القادری، بدایونی، محمد یعقوب
۲۹۷	روح صدیقی، شاہد عزیز	۲۵۷	طالب کشمیری، ندلال کول
۱۷۰	رکس احمد جعفری	۲۸۹	حابد لاہوری، حابد علی
۲۷۰	سامی، مہادیو پرشاد	۲۹۲	عارف عباسی بیلاوی، محمد عثمان
۳۲	سدرشن (مہاشہ)، ہدی ناتھ	۱۸۸	عبد الشکور
۳۳	سراج لکھنوی، سراج الحسن	۳۱۳	عبد القادر سردری
۲۳۸	سلیمان اریب، محمد	۲۰۵	عتیق جعفری، عتیق احمد
۲۸۲	سید عبداللطیف	۲۹	علی بہادر خان (حافظ)
۳۰۷	تیدین، خواجہ غلام الہدی	۱۹۱	علی عباس حسینی

تذکرہ معاصرین

۸۹	محمد مقتدی خان شیرانی	۱۳۲	عندلیب شادانی، دجاہت حسین
۲۵۷	صطفی زیدی، صطفی حسین		
۳۶۷	منظر صدیقی، ششاد حسین	۵۹	فرحت دلہوی، پریم شکر
۲۰۸	منتہ لکھنوی، بشیشور پرشاد	۷۰	فقیر سید وحید الدین
۳۹۸	مہر، غلام رسول	۱۷	فلک لاہوری، نال چند
۲۶۶	ناشاد کانپوری، مری دھر پرشاد گم	۳۱۹	قیس بناری، شیلو مودت لال
۱۱۷	ناظم گل و ٹھوی، تیدا بوالحسن		
۱۳۱	ناظم اکوردی، شیر احمد طوی	۲۲۸	ناظم لکھنوی، میرزا محمد اقبال
۸۵	نجیب اشرف ندوی	۱۶۸	محمد اعلیٰ خان، پردیس
۴۵	نذر تاجا حید	۳۳۶	محمد حبیب، پردیس
		۵۱	محمد عبد الباقی
۱۷۵	واقف مراد آبادی، یعقوب الحسن	۱۳۷	محمد محمد دم کی الدین، ابو سعید

وکیل اشتر، وکیل اسماعیل خان ۲۰۷

# فہرست بترتیب تاریخ وفات

نام / شخص	مقام وفات	تاریخ وفات	صفحہ
نملک، لالہ لال چند	دلی	۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء	۱۷
اعلیٰ فیروز پوری، تند کشور	فیروز پور	۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء	۲۰
شاہد احمد دہلوی	کمرچی	شب ۲۶/۷ مئی ۱۹۶۷ء	۲۵
اثر لکھنوی، میرزا جعفر علی خان	لکھنؤ	۶ جون ۱۹۶۷ء	۲۸
نذر تاجا حیدر	بمبئی	۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء	۳۵
علی بیادری خان، حافظ	دلی	شب ۶/۵ نومبر ۱۹۶۷ء	۳۹
مہاشہ سرداش، بدلی ناتھ	بمبئی	۱۶ دسمبر ۱۹۶۷ء	۳۲
سراج لکھنوی، سراج الحسن	لکھنؤ	۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء	۴۳
آفتاب پانی پتی، انوپ چند	پانی پت	۹ فروری ۱۹۶۸ء	۴۸



# سنگریہ سامراج

۵۱	۶۱۹۶۸	۲۳	فروری	دلی	محمد عبدالباقی
۵۳	۶۱۹۶۸	۲۹	اپریل	ٹونک	صولت ٹونگی، محمود الحسن عرب
۵۹	۶۱۹۶۸	۲۰	اپریل	میرٹھ	فرحت دہلوی، پریم شنکر
۶۲	۶۱۹۶۸	۵	مئی	کلکتہ	پرویز شاہدی، محمد اکرام حسین
۷۰	۶۱۹۶۸	۲۰	جولائی	کمرہا	فقیر تید و حید الدین
۷۲	۶۱۹۶۸	۲۳	جولائی	بھوپال	شفا گوایاری، تید محمد حسن
۸۰	۶۱۹۶۸	۱۳	اگست	سیالکوٹ	امین حزیں، ثواب محمد مسیح پال
۸۵	۶۱۹۶۸	۵	ستمبر	بمبئی	نجیب اشرف ندوی (تید)
۸۹	۱۹۶۸	۶	دسمبر	علی گڑھ	محمد مقدی خان شروانی

۹۵	۶۱۹۶۹	۳	جنوری	لاہور	نجیم احمد شجاع
۹۷	۶۱۹۶۹	۳	مئی	نئی دہلی	ڈاکٹر فاکر حسین
۱۰۹	۶۱۹۶۹	شب ۲۱/۸	مئی	نئی دہلی	شاد خورشید کمار
۱۱۷	۶۱۹۶۹	شب ۲۶/۲۷	مئی	ناگپور	ناظم محلہ لاٹھوی، تید ابوالحسن
۱۲۳	۶۱۹۶۹	۲۸	مئی	منظفر گڑھ	المظفر مجری، محمد اسحق
۱۳۱	۶۱۹۶۹	۱۷	جولائی	لکھنؤ	ناظر کاکوروی، بشیر احمد طوی
۱۳۳	۶۱۹۶۹	۲۹	جولائی	ڈھاکا	عندلیب شادانی، دجاہت حسین
۱۳۴	۶۱۹۶۹	۶	اگست	کلکتہ	بینود، عباس علی خان
۱۳۷	۶۱۹۶۹	۲۵	اگست	دلی	ابوسعید محمد مقدم محی الدین
۱۵۳	۶۱۹۶۹	۲۵	اگست	چاندپور	راز چاند پوری، محمد صادق
۱۵۸	۶۱۹۶۹	۸	ستمبر	کمرہا	انتظام اللہ شہبانی، مفتی

سزکرو ساعری

۱۶۱	۱۹۶۹ء	۲۷ ستمبر	کھنٹو	علی عباس سیٹی دیتہ
۱۶۳	۱۹۶۹ء	۲ اکتوبر	اگسٹو	آرہری، آرتر جان پرویسر
۱۶۸	۱۹۶۹ء	۱۸ اکتوبر	نئی دلی	محمد اعلیٰ خان، پروفیسر
۱۷۰	۱۹۶۹ء	۲۸ اکتوبر	لاہور	رکس احمد جعفری
۱۷۵	۱۹۶۹ء	شب ۱۶/۱۵ دسمبر	دلی	دافت مراد آبادی، سید یعقوب حسن

۱۸۱	۱۹۷۰ء	۸ مارچ	حیدرآباد	جامی حیدر آبادی، خورشید احمد
۱۸۸	۱۹۷۰ء	۱۸ مارچ	بریلی	عبدالشکور، پروفیسر
۱۹۲	۱۹۷۰ء	۱۹ اپریل	لاہور	ساج، سید امتیاز علی
۱۹۹	۱۹۷۰ء	۲۰ اپریل	بہمنی	گلگیر بدایونی، گلگیر احمد
۲۰۸	۱۹۷۰ء	۲۳ مئی	دلی	منور گھنوی، بشیشود پرشاد
۲۱۸	۱۹۷۰ء	۱۵ اگست	کراچی	فیاض القادری، بدایونی، محمد یعقوب
۲۲۸	۱۹۷۰ء	۲۶ اگست	کھنٹو	اجپ گھنوی، میرزا محمد اقبال
۲۳۸	۱۹۷۰ء	۷ ستمبر	حیدرآباد	سلیمان اربیب حیدر آبادی
۲۳۶	۱۹۷۰ء	۲۰ ستمبر	میرٹھ	محمی حزمین میرٹھی، توفیق الحق
۲۵۱	۱۹۷۰ء	۲ اکتوبر	بیکانیر	بیدل بیکانیری، شیخ محمد عبداللہ
۲۵۷	۱۹۷۰ء	شب ۱۳/۱۲ اکتوبر	کراچی	مصطفیٰ زیدی، مصطفیٰ حسین
۲۶۳	۱۹۷۰ء	۲۰ نومبر	ڈیرہ دکن	اسرار احمد آزاد
۲۶۶	۱۹۷۰ء	۵ دسمبر	کانپور	ناباشاد کانپوری، سری دھرم پرشاد گم
۲۷۱	۱۹۷۰ء	۱۶ دسمبر	بہمنی	آغا خلیل کا شیریں، طفیل احمد
۲۷۵	۱۹۷۰ء	۱۶ دسمبر	بریلی	دیبا بریلوی، نارائن داس ٹنڈن

# تذکرہ معاصرین

باسط اویسی، نیاز محمد خان | ادیبین | ۱۷ دسمبر | ۱۹۷۰ء | ۲۸۰

۲۸۳	۱۹۷۱ء	۱۸ جنوری	بیپو	شاغل بیپوری، احترام الدین احمد شانی
۲۸۹	۱۹۷۱ء	۲۰ جنوری	لاہور	عابد لاہوری، سید عابد علی
۲۹۷	۱۹۷۱ء	۲ جنوری	شاہ جہاں پور	روش صدیقی، شاہ عزیز
۳۰۵	۱۹۷۱ء	شب ۲۹/۳۰ جنوری	کراچی	عتیق جعفری، سید عتیق احمد
۳۰۷	۱۹۷۱ء	۹ فروری	ملکت	دکیل اختر، دکیل احمد اختر خان
۳۱۰	۱۹۷۱ء	۲ مارچ	لاہور	میاں بشیر احمد
۳۱۳	۱۹۷۱ء	۱۱ مارچ	سرینگر	عبدالقادر سردوری، پردیس
۳۱۹	۱۹۷۱ء	۲ اپریل	بنارس	قیس بناری، منشی شیخ مودت لال
۳۲۳	۱۹۷۱ء	۲۱ اپریل	لکھنؤ	اختر تلہری، سید اختر علی
۳۲۸	۱۹۷۱ء	۱۵ جون	لاہور	حبیب اشعرولی، حکیم حبیب احمد
۳۳۱	۱۹۷۱ء	۲۲ جون	علی گڑھ	محمد حبیب، پردیس
۳۳۷	۱۹۷۱ء	۲۳ جون	آگرہ	تسکین قریشی، محمد حسین
۳۳۸	۱۹۷۱ء	۱۹ جولائی	پنجواہ	شاغل قادی، سید محمد شاغل
۳۵۳	۱۹۷۱ء	۱۷ جولائی	بہارہ	غیر مجبوری، ابوالخیر
۳۵۵	۱۹۷۱ء	۱۰ اگست	بلگرام	راز بلگرامی، سید شریف الحسن
۳۵۷	۱۹۷۱ء	۱۳ ستمبر	سرینگر	طالب شمیری، پنڈت نند لال کول
۳۶۲	۱۹۷۱ء	۲۶ ستمبر	میرٹھ	عادت عباسی، محمد عثمان بیادی
۳۶۷	۱۹۷۱ء	۲ اکتوبر	کراچی	منظر صدیقی، شمسار حسین
۳۷۰	۱۹۷۱ء	۲ اکتوبر	جلیپور	سامی، ہادیو پرشار

# سید کریم دہلوی

۳۷۳	۶۱۹۷۱	۲	نمبر	لکھنؤ	افتخار سوانی دارق، سید محمد حسین
۳۸۲	۶۱۹۷۱	۳	نمبر	حیدرآباد	سید عبداللطیف، ڈاکٹر
۳۹۸	۶۱۹۷۱	۱۶	نمبر	لاہور	مہر، مولانا غلام رسول
۴۰۰	۶۱۹۷۱	۱۹	نمبر	نئی دہلی	سیدین، خواجہ غلام السیدین

## فلک، لالہ لال چند

۱۳ جنوری ۱۸۸۷ء کو اپنے آبائی وطن یعنی ضلع گوجرانوالہ (پنجاب پاکستان) کے مشہور قصبے حافظ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کی لاہور میں غلے اور اناج کی دکان تھی۔ چنانچہ ان کا بچپن اور تعلیمی زمانہ یہیں گزرا۔ ۱۹۰۳ء میں دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد کسب معاش کے لیے ملازمت اختیار کی اور چیف انجینئر کے دفتر میں جگہ مل گئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگریز افسرانے ایسی ماتحتوں سے بہت درستی اور فرعونیت کا برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے آئے دن اس طرح کے ناخوشگوار حالات دیکھے تو ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس پر وہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور پھر ساری عمر سرکاری نوکری کے نزدیک نہیں گئے۔

کانگریس کی سیاسی تحریک اب اردو ذہن تیز تر ہو رہی تھی۔ لالہ چند فلک بھی اس میں شامل ہو گئے۔ پُر جوش تقریریں اور نظمیں پڑھنے لگے۔ نوبت قید و بند تک پہنچی۔ جون، ۱۹۱۷ء میں ہجرم بناوٹ ۲۰ سال کے لیے

کالے پانی (جزیرہ اشدیمان) کی سزا ہوئی جو بعد کو ۱۴ سال کی قید میں تبدیل کر دی گئی۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء میں دستور کی اصلاحات کا نفاذ ہوا تو تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے، وہی میں انھیں بھی رہائی ملی۔ لیکن ان کا نشہ ایسا نہیں تھا کہ تعزیر و تعذیب کی ترشی اُسے اتار دیتی، ان کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔

شعر پر اصلاح منشی دودار کا پرشاد افق لکھنوی سے ملی۔ اسی زمانے میں ان کی قوی نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے تھے، جامِ فلک، پیامِ فلک، کلامِ فلک۔ مہاجرات بھی بطور تاول نشر میں نکلی تھی۔ ان کا یہ مصرع ضرب المثل بن چکا ہے۔

تو بھی بدل، فلک، کہ زمانہ بدل گیا

اس بزرگ قوم پرست شاعر کا ۱۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ ۸۰ سال کی عمر پائی۔

افسوس، کوشش کے وجود ان کے کلام کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہوا۔ مندرجہ ذیل چند شعری کوششوں سے متیا کر سکا ہوں۔ ان کا کلام آپ مبتی اور دلی جذبات کا آئینہ ہے۔

اُگ میں بڑا کر بھی سونے کی دنگ جاتی نہیں

کاٹ دینے سے بھی ہیرے کی چمک جاتی نہیں

بل پہ گھس دینے سے بھی جاتی نہیں چندن کی بو

پھول کی استی میں مل کر بھی، ہلک جاتی نہیں

رنج میں آتا نہیں نیکوں کی پیشانی پہ بک

دھوپ کی تیزی میں سبزے کی ہلک جاتی نہیں

مذکورہ معاصرین

جا نہیں سکتی کہڑوں میں بھی شیروں کی دھار  
دستِ گلچیں میں بھی غنچوں کی چٹک جاتی نہیں  
صاحبِ مہمت نہیں دبتا مخالف سے کبھی  
زور سے آندھنی کے آتش کی بھڑک جاتی نہیں  
نعرہ زن رہتا ہے آفات و حوادث میں دلیر  
بادلوں میں گھر کے بھلی کی کڑواک جاتی نہیں  
ملک کی الفت کا جذبہ دل سے مٹ سکتا نہیں  
قوم کی خدمت کی خواہش اے فلک جاتی نہیں  
دل سے بھگیں نہ مگر کبھی وطن کی الفت  
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئیگی  
میں اٹھا لو نکلا بڑے خوشی سے اس گھر  
خاکِ زمانے کے لیے بادِ صبا آئیگی  
اندگانی میں تو ملنے سے بھکتی ہے فلک  
خلق کو یاد مری بعدِ فنا آئیگی  
وطن کی پچائش جس دل میں گڑی ہو خوشی سے وہ اٹھاتا ہر کڑی ہے  
عین کا ابرا ہے رحمت کا بادل گھٹا آفت کی سادہ کی جھڑی ہے

---

## اٹکر فیروز پوری، نند کشور

۲۶ اگست ۱۹۰۱ء کو فیروز پور کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ جگن ناتھ کا شہر کے سربراہ اور وہ اصحاب میں شمار تھا۔ اکھی ۲۲ برس کے تھے کہ انگریزی حکومت نے انہیں آزریری مجسٹریٹ بنا دیا۔ وہ کوئی ۴۰ سال اس عہدے پر فائز رہے۔ لکھنے پڑھنے کا بھی نشوق تھا۔ ان کی تصنیف ”بھگوت گیتا کی شرح“ مطبوعہ موجود ہے۔

اٹکر صاحب نے بی اے اور ایل ایل بی کی اسناد پانے کے بعد فیروز پور میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔

والد لالہ جگن ناتھ کا ۱۹۳۱ء میں انتقال ہو گیا، اور گھر کی ذمہ داری اٹکر صاحب پر آپڑی۔ ۱۹۳۸ء میں آپ بھی آزریری مجسٹریٹ بنے اور آزادی (۱۹۴۷ء) تک پوری دیانتداری اور تندہی سے اس کے فرائض سرانجام کرتے رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنی ذاتی وکالت بھی ترک کر دی تھی، تاکہ دونوں میں کسی جگہ ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ شہر کے رفاہ عامہ کے کاموں سے بھی گھری دم بچھی تھی۔ انہیں امداد قیدیوں کے اعسرازی سکڑتے تھے۔ نیز مقامی اسکول کی مجلسِ منتظرہ کے نائب صدر تھے۔



آخری چند سال میں اپنا کاروبار کر لیا تھا۔ فیروز پور کا سینما ہاں، شملہ، اکینر  
ناہی انھیں کی ملکیت تھا۔ ۳۰ اپریل، ۱۹۶۶ء کو فیروز پور ہی میں رحلت کی۔  
طالسعلی کے زمانے ہی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جب بخیہ گئے  
شعر کہنے لگے، تو خواجہ عبدالرؤف عشرت مکنوی سے اصلاح لینے لگے۔ اس  
طرح انھوں نے کئی سالوں تک شعر کہنے میں ترقی پزیر رہے۔

انھوں نے کئی زمانے میں گیتا کا منظوم ترجمہ شروع کیا تھا اور اس کا کچھ حصہ  
دوسری حالت کے عنوان سے چھپا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ آخری ایام میں انھوں نے  
اسے مکمل کر لیا تھا۔ معلوم نہیں اس کا مسودہ کہاں ہے، یہ چھپ جانا چاہیے  
تاکہ محفوظ ہو جائے۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تمام عمر رے دل کے زخم بھرنے کے	مرے نصیب وہ بگڑے کہ پھر سنوڑ کے
ترے بغیر سہا یا نہ کوئی آنکھوں میں	ہزار نقش آتارے مگر اتر نہ سکے
تھاری یاد میں کچھ بھی رہا نہ یاد ہیں	کہاں کہاں تھیں ٹھونڈا یاد کرنے کے
عبث ہیں دُک کے لئے جہنم میں اے بلبل!	لگا وہ آگ کہ گلچیں بھی گلی کتر نہ سکے
شرف ملا نہ جنھیں تیری باریابی کا	گزر کے بھی ترے کوچے سے وہ گزرتے
شبیبہ گنج تو دی ہے معشوروں نے مری	مگر وہ دردِ محبت کا رنگ بھرنے کے

د بھر غم میں دل زار سرفراز ہو،  
یہ وہ نصیب نہ ہو جو ڈوب کر ابھرنے کے

صد حیف اسے تو نے جدا چھوڑ دیا ہے  
دیکھا رہے مفضل کو عنایت کی نظر بھی  
جس نے بھی کچھ تیرے سوا چھوڑ دیا ہو  
تم نے تو فقط تیرا دوا چھوڑ دیا ہو  
اللہ کے ساتھی! وہ تیری شوخ نگاہی  
دامنِ غم نے بھی مضمونِ خدا چھوڑ دیا ہو

— تذکرہ معاصرین —

اے تارکِ دنیا! تجھے جنت کی ہوس کیوں  
چھوڑا دیا ہے تو نے تو کیا چھوڑ دیا ہے  
اس ترکِ ثنّا کی کوئی حد کبھی ہے آخر!  
کیوں حلقہٴ اربابِ وفا چھوڑ دیا ہے؟

## رباعیات

مظلوم ہیں ہر طرح خطاوار افسوس! اب صاحبِ قدرت ہیں ستارِ افسوس!  
منظور ہے ہر کسی کو طاعتِ ذر کی مجلسِ کا نہیں کوئی بھی غوارِ افسوس!

لڑتے ہیں ہم دگر برادرِ افسوس! سران کا پھر گیا ہے سراپا افسوس!  
خوشیوں کی نگاہ سے تھلاتے ہیں غیروں کی وہ کھار ہے ہیں ٹھوکرِ افسوس!

چھٹ گئی آہ! وطن پرستی افسوس! ہو گئی آہ! ذلیل ہستی، افسوس!  
ہر گھر میں بپا ہے ایک بزمِ ماتم دیرانہ سی ہو گئی ہو بستی، افسوس!

---

## رفیق مارہروی، رفیق احمد

احسن مارہروی مرحوم کے صاحبزادے، ۲۲ مئی، ۱۹۲۷ء کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے بدایوں اسپتال میں انتقال ہوا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۱۶ء کو مارہرہ میں پیدا ہوئے تھے، گویا اہ برس کی عمر مائی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رفیق ان کا تخلص تھا حال آنکہ یہ صحیح نہیں ہے؛ وہ محض اپنا نام اس طرح لکھتے تھے، نہ تخلص تھا، نہ کبھی انھوں نے شعر کہا۔ نشر میں البتہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب اسلام اور نظریۂ شرافت تھی۔ چونکہ ان کے والد احسن مرحوم داغ کے محبوب شاگردوں میں تھے، اس لیے ان کے خاندان میں داغ سے متعلق بہت مواد تھا۔ اسی کا ثمرہ رفیق مرحوم کی دو کتابیں زبان داغ اور زبیر داغ تھیں۔ وہ داغ کی سوانح عمری بھی مرتب کر رہے تھے؛ خد معلوم، یہ کس مرحلے پر تھی۔ ان کی ایک کتاب ”ہندوؤں میں اودھ“ اگرچہ غلط اور عدم توازن سے خالی نہیں تاہم قابل قدر ہے۔ اپنے والد احسن مرحوم کے کلام کا انتخاب جلوۂ احسن کے عنوان سے شائع کیا اور اس کے

شروع میں ان کی اچھی بسوٹ سوانح عمری شامل کر دی تھی۔ تعلیم دسویں درجے تک تھی۔ وہ ساری عمر معمولی ملازم رہے۔ کنبہ بھی بڑا تھا، اس لیے کبھی ذرا کام نہ دیکھا۔ یکم مئی کو پیٹے میں گرفتار ہو گئے۔ دو روز ہسپتال میں رہ کر دماغ میں اپنے مسکن پر آئے۔ لیکن حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ بڑائیوں میں سول سرجن کا علاج ہو۔ اسی دوران میں ویجاہٹیس کے پرانے مرض نے غلبہ پایا جب کوئی افاق نہ ہوا تو ۲۴ مئی کو ہسپتال میں داخل کیے گئے۔ اسی شام اللہ کو پیارے ہو گئے۔

## شاہد احمد دہلوی

مترجم قرآن شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی (ف ۱۹۱۲ء) کے پوتے اور واقعات دارالحکومت دہلی کے مؤلف مولوی بشیر الدین احمد (ف ۱۹۲۷ء) کے بیٹے شاہد احمد دہلوی کا، ۲۴ مئی ۱۹۶۷ء کی درمیانی شب میں پونے بارہ بجے پعارضہ، قلعہ کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ۲۵ مئی ۱۹۰۶ء کو اپنے خاندانی مکان دہلی میں پیدا ہوئے تھے، گویا ۶۱ سال کی عمر پائی۔ خدا منعمت کرے۔

ان کے والد مولوی بشیر الدین احمد ان کے بچپن کے زمانے میں ریاست حیدرآباد (دکن) میں ملازم تھے، اس لیے شاہد صاحب کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی۔ اس کے بعد پہلے علی گڑھ اور پھر دہلی آئے۔ دسویں درجے کی سند انھوں نے عربیہ اسکول سے لی تھی۔ اس کے بعد لاہور جا کر فورین کرپشن کالج میں داخلہ لیا۔ ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا، لیکن ایف ایس سی کرنے کے بعد جب یہ میڈیکل کالج میں پہنچے، تو یہاں مردہ لاشوں کی چیر بھڑ سے طبیعت شکنی کئی ہوئی کہ بھاگ نکلتے۔ بالآخر سان پیٹنس کالج کوئی سے انگریزی ادبیات میں

ہاے آئندہ کی زندگی اور پھر یہی دلی یونیورسٹی سے فارسی ادبیات میں ایم اے کیا۔ ادب کے علاوہ انھیں موسیقی سے بھی گہرا شغف تھا۔ انھوں نے سولہ برس کی عمر سے مختلف گھرانوں کے ٹائینڈہ گائیوں کی خدمت میں رہ کر کلاسیکی موسیقی میں کامل درجہ حاصل کیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی معلومات اتنی وسیع اور جوتیاں تک پر دسترس تھیں کہ وہ اس موضوع پر گفتگوں صاحب فن اور بالغ نظر مبصر کی حیثیت سے گفتگو کر سکتے تھے۔

مولوی نذیر احمد حیدر آباد میں صوبہ دار رہے تھے اور مولوی بشیر الدین احمد تعلق داراول۔ دونوں مجاز رس اور دورا عیش بزرگ تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے والد اچھا خاصا شاعر و محاورہ مرے تھے۔ تینوں بھائیوں کے لیے پچاس پچاس ہزار روپیہ نقد اور متعدد مکانات جن کے کرایے سے دودھو کی ماہانہ آمدنی آگے تھی، ہندو شاہ صاحب کو بہر اوقات کے لیے کسی ملازمت کی ضرورت نہ تھی۔ خاندانی ماحول میں انھیں کھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہو گیا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے اپنے ایک دور کے عزیز انصار ناصر بن کے مشورے سے ہوشوں سے ملاقات کی تقریب پیدا کرنے کے لیے جنوری ۱۹۳۰ء میں دلی سے امیتھ ساقی جاری کیا، اور اسی کے ساتھ ساقی بک ڈپو بھی قائم کر دیا۔ اس ادارے کی طرف سے تقریباً دو سو کتابیں شائع ہوئیں۔ ساقی اردو کا بہت کامیاب پرچہ ثابت ہوا۔ اس کے ذریعے سے انھوں نے اردو علم و ادب کی بڑی وسیع خدمات سرانجام دیں۔ وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور مدد کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان چلے گئے، دس بیسے لاہور میں قیام کرنے کے بعد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں نے اپنا ذاتی مکان خرید لیا اور

ساتی بھی دوبارہ جاری کر دیا۔ لیکن زمانہ بہت ناموافق رہا! اسے جاری رکھنے کے لیے انھیں کیا کیا جتن نہیں کرنا پڑے! ان حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ ہاری نہیں مانے۔ جس استقلال سے وہ آخری دم تک جُٹے رہے، بیان کا قابلِ تعریف و تقلید کا نامہ ہے۔ یہاں انھوں نے آخرت پر مضمون لکھے، ریڈیو کی ملازمت کی، جہاں وہ ایس احمد کے نام سے موسیقی کے پروگرام کے نگران اور ہدایت کار تھے۔ اور اس طرح جو کچھ کیا، اسے ساتی کے تنور میں جھونکے رہے۔ پاکستان میں ان کا بہت بڑا کارنامہ ”پاکستان رائٹرز گلڈ“ کی تاسیس تھی، جسے انھوں نے ۱۹۵۹ء کے اوائل میں سات اور ادیب دوستوں کے ساتھ مل کر قائم کیا، انھیں دلی کی بحالی زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے کم و بیش پچاس کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔ ان میں دلی کی ہمت، گنجینہ گوہر اور فاؤسٹ بہت مشہور ہیں۔

۱۹۶۶ء میں وہ بیمار ہو گئے، ان کی ٹانگ کا آپریشن ہوا، اور بالکل ٹھیک ہو گئے۔ اب وہ چلنے پھرنے لگے تھے، اور ان کی صحت بھی بتدریج عود کرنے لگی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلسل محنت اور مکر و بات کی یورش نے ان کی تندرستی کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ ۱۰ فروری ۱۹۶۷ء کو دل پر حملہ ہوا۔ پندرہ بیس دن ہسپتال میں رہے اور بظاہر صحتیاب ہو کر گھر آ گئے۔ لیکن یہ سنبھالا ثابت ہوا۔ ۲۷ مئی کو وہ دن بھر چھے رہے۔ شب میں کچھ جھپٹی کا اظہار کیا، ٹینڈ بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔ یکا یک کھانسی کا دورہ پڑا۔ فوراً ڈاکٹر بلا یا گیا، لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے وہ جان بحق ہو چکے تھے۔ ان کی وفات سے ایک اردو کا شیدائی، دلی کی تہذیب اور وضع و عمارت و شرافت کا نمونہ ہم سے جدا ہو گیا، حق منہضت کرے۔

## آثر لکھنوی، میرزا جعفر علی خان

حضرت آثر بہت دن سے بیمار چلے آتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، جس سے وہ زیادہ نقل و حرکت کے قابل نہیں رہے تھے۔ ادھر حافظہ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ نظر آ رہا تھا کہ اب وہ برسوں کے نہیں، سقڑے اور دنوں کے جہان ہیں۔ چنانچہ وقت موعود آن پہنچا، اور منگل کے دن ۱۶ جون ۱۹۶۷ء صبح کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آثر صاحب کا خاندان ایرانی تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ میرزا محمد شفیع اصفہان سے آگرے آئے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ طبیب تھے۔ آگرے میں ان کی خداقت نے ایسی شہرت حاصل کی کہ نواب وزیر شجاع الدولہ نے انھیں خلیفہ آباد طلب کر لیا، مناسب قدر و منزلت ہوئی اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے، حکیم محمد شفیع کے صاحبزادے میرزا محمد سمیع ذرہ تخلص (ف۔ ۱۳۳۷ھ) کو بلا چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ وہی حکیم محمد سمیع ذرہ ہیں، جن کی یہ رباعی بہت مشہور ہے۔



گر با بگذاشت دایں دل زارِ جمال      سر با بگذاشت دایں دل زارِ جمال  
 القصد ہزار گرم و سردِ عالم      بر با بگذاشت دایں دل زارِ جمال  
 خان علامہ تنفصل حسین خان (ف ۱۸۸۷ء) بھی اسی خاندان سے تھے۔  
 حکیم محمد سمیع ذرہ کے بیٹے حکیم میرزا علی خان جو والدہ ہی کے ساتھ کر بلا گئے تھے  
 ان کے انتقال کے بعد کھٹو چلے آئے، یہاں انھیں شاہی میں حکیم الملک  
 خطاب ملا اور بڑا عروج پایا۔ انھیں کی اولاد میں اثر مرحوم کے والدِ بزرگوار  
 حکیم میرزا افضل حسین خان تھے۔

اثر اپنے خاندانی مکان کٹرہ البتواب خاں (کھٹو) میں ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو  
 پیدا ہوئے، سنہ میں روایتی چاندی کا چھپ نہیں، سونے کا چھپ لیے ہوئے بدلے  
 ہوئے حالات کے اقتضا سے خاندان کی روایات کے برخلاف، ان کی تعلیم  
 مغربی طرز پر ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں بی اے کی سند لی، ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹر  
 بنا دیے گئے، اور ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں  
 ڈپٹی کمشنر اور کمشنر اور دوسرے ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۳۵ء میں  
 کلکٹری پر منتقل ہوئے، ۱۹۶۴ء میں پنشن کے بعد اولڈ کشمیر میں وزیر مال اور  
 پھر وہیں چندے وزیر اعظم بھی رہے۔ خدماتِ جلیلہ کے لیے حکومت کی  
 طرف سے ۱۹۳۶ء میں خطاب خان بہادر اور ۱۹۳۹ء میں ایم بی ای، ملا۔  
 ۱۹۴۳ء میں زیارات مقاماتِ مقدسہ کی غرض سے عراق کا سفر کیا۔

۶ جون ۱۹۶۷ء کو وقتِ صبح رہ گراے عالمِ جاودانی ہوئے۔ اسی شام جنازہ  
 اٹھا اور کر بلا سے خدائیش (مال کوثرہ) میں دفن ہوئے۔

شاعری کا شوق ادائیں سے تھا اور اس میں میرزا محمد ہادی عربیہ لکھنوی (ف ۱۹۵۷ء)  
 سے تمذہباً، عزیز کے بعض دوسرے شاگردوں کے انہوٹاک ردیے کے ہاں

اثر آفرینک استاد کے احسانات کے معترف رہے۔ کثرۃ ابوترباب کی سکونت سے ان کا خاندان اپنی زبان دانی کے باعث "ثقافت کثرہ" کے عرف سے مشہور تھا۔ اثر کو بھی زبان و بیان اور فن شعر میں غیر معمولی جہاد اور قدرت حاصل تھی جس کی شہادت ان کی تالیف "فرہنگ اثر" سے بھی ملتی ہے۔ اس میں انھوں نے نودائیات کی تعمیری تنقید اور اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب پر انھیں یوپی حکومت کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔ حکومت ہند نے انھیں خطاب "پدم شری" سے نوازا تھا۔

ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "بھان بن" اور "آثر کے تنقیدی مضامین" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ غالب کے کچھ اشعار کے مطابق "مطالعہ غالب" کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ انیس سے متعلق بھی ایک مجموعہ مضامین انیس کی مرثیہ نگاری کے نام سے ہو۔ ان کی غزلیات کے چار مجموعے شائع ہوئے: اثرستان، بہارستان، بہاراں، نوہاراں، ایک جلد (عروسِ فطرت) میں نکلیں ہیں۔ ایک اور مجموعہ لالہ دگل کے نام سے بھی چھپ چکا ہے۔ لکھنوی ہوتے ہوئے بھی وہ تیر کے عاشق تھے، انھوں نے اس کے کلیات کا ایک نمائندہ انتخاب بھی مزامیر کے نام سے کیا، جو دو حصوں میں چھپ چکا ہے۔ دوسری زبانوں کے نظموں کے تراجم اور مختارات کا ایک مجموعہ (دنگ بست) بھی ان سے یادگار ہے بھگوت گیتا کا ترجمہ، انعامِ خداوندی کے نام سے کیا تھا۔ دو ڈرامے۔ "دنگاری بیگم" (منظوم)، اور "ہلاک فریب"۔ بھی چھپ چکے ہیں۔ پہلا فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہے۔ دوسرا پشتانی مصنف سگند کرانسی کے ڈرامے کا آزاد ترجمہ

غرض شعر و ادب اور علم و فن میں ان کی تحریریں وسیع اور پابدار حیثیت

کی مانگ اور سہاری ادنیٰ تا ریخ کا قابلِ قدر حصہ ہیں۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہوا

کہتے ہی شکوے زباں پر آئے، اک رہ گئے

کچھ نہ کہتے بن پڑا، گردن جھکا کر رہ گئے

کیسی تکیں، بیقراری میں اضافہ ہو گیا

ہاتھ وہ نزدیک دل کے لائے، لا کر رہ گئے

اور جو کچھ ہوا، یہ اندھیر نہ ہونے پائے

یاس امید کا بیڑا نہ ڈوبنے پائے

تسل کی یہ باتیں ہیں کہ تڑپانے کی باتیں ہیں

غوشی، پھر تبسم، پھر خطاب آہستہ آہستہ

جست، رواہ کرتی ہے یہ بھی محبوب کے دل کی

کہ جیسے نشہ کرتی ہو شراب آہستہ آہستہ

جاووں نے اثر کے پھر ہنگامہ کیا، بر پا

منہ پھر کے پھر کہ دو دیوانے کو کیا کہئے

تری گفتگو جو سن لے، تو ہو موجِ موز و نقصاں

وہ ہے کیفِ خامشی میں کہ ہو غرقِ مے ترنم

کیا جانئے، کس نے اسے یہ بات سکھا دی

جب تم کو پکارا ہے، مرے دل نے صدا دی

محبت اور انظاہر محبت یہی قوایں ہیں، دیوانے پن میں

دل کا ہے رونا، نکھیل نہیں ہوا، نہ کو کلیجہ آئے دو

تھمتے ہی تھمتے، اشک تھینکے، ناصح کو سمجھانے دو

کہتے ہی کہتے حال اکہینچے ایسی ہمتیں جلدی کیا ہے؟  
 دل تو تھکانے ہوئے دو، اور آپ میں ہم کو آنے دو  
 شکوہ کیا از راہ الفت، طنز سمجھ کر روٹھے ہو  
 ہم بھی ہیں نا دم اپنی خطا پر، آؤ تم بھی جانے دو  
 صورتِ منزل کیا نظر آنے، ثرت ہیں دل پر نقشِ خودی  
 عقل ہے دشمنِ نفس ہے، ہزن، ٹھو کریں کچھ نہ کھانے دو  
 دل کو اثر کے لٹ لیا ہے، شوخ نگاہ کا فرسے  
 کوئی نہ اس کو روکنے سے روکو، آگ لگی ہو بجھانے دو  
 ظہورِ عشق حقیقت طراز تھی ورنہ یہ دلکشی کہیں وار ورس میں آئی ہو  
 کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھر نار اتوں کو  
 جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں، عشق و جنوں کی باتوں کو  
 بات یہ اور ہے اشوق کے ہاتھوں خونِ دل عاشق ہو جا  
 کام نہیں کچھ خوریزی سے اتیرے خالی ہاتھوں کو  
 کیا کیا ہم پر لطف و کرم ہے، کیسی کیسی سہر و وفا  
 تلخ اگر سن سکتے نہیں، تو کیوں پھیڑ دان باتوں کو  
 ہونہ ہو اسب اپنی ہمتی، لاکھ کر دیکھا رُخِ آخر !  
 غنید آنکھوں کی اڑاتے ہو، کہہ کہہ کے فسادِ آؤں کو  
 دل کو ہلاکِ شوق تھا، اب ہے حسن کی دنیا، کیا کہنا !  
 جو شہِ طرب ہو، ترکِ طلب میں، ترکِ طلب کا کیا کہنا  
 آئینہ دارِ عشرتِ دریا، قطرہ بھی شعلہ دریا ہے  
 کیسی جدائی، وصل کہاں کا، ایک ہے نقشا، کیا کہنا

جیف اثر کا کھویا سار ہنا، اور کبھی جو بات بھی کی  
طنز سے تیرا سنس کر کہنا: آپ کی سننا، کیا کہنا!  
 آغازِ محبت کی لذت، انجام میں پاتا مشکل ہے  
 جب دل کو موسے رستے تھے، اب ہاتھ لگانا مشکل ہے  
 ہم نے دور و کے رات کا قی ہے آشوں پر یہ رنگ تب آیا  
 جیف نہیں فرصت ہی نہیں ہو، ورنہ کیا کیا حسرت تھی  
 حال ہمارا سن لیتے، اور اپنا حال سناتے تم  
 جان کو روگ ہیں دنیا بھر کے ہم تو پھٹائے محبت کر کے  
 سوئے مستقبل رواں ہو شہرِ رواں پر حال کے  
 بھول جائی کو، لاش کہنے اک مدفن میں ہے  
 زینہ، بام کا سیال کا، ہیں یہ ناکا سیال  
 سس سے باز آئے ہر گز جان جب تک تن میں ہے  
 اپنی ہستی بھوک دے گشتِ دہا پر جسد میں  
 بارِ زہر ہوتا نہیں وہ دانہ، جو خرمن میں ہے  
 دل میں جنت ہوا اگر، اور استوار ی حرم میں  
 موم سے بھی پھر اثر ا بڑھ کر گدا آہن میں ہے  
 کسی کا ہے، یہ کہنا اثر سے وقتِ وداع  
 جو ہو سکے، تو ہیں دل سے تم بھلا دینا  
 حال بھی اپنا سناؤ بھائیوں اک عودِ دل تو ٹھہر جانے  
 دیکھو نہ آنکھ پھر کے کسی کی طرف بھی  
 تم کو خبر نہیں، جو تمہاری نظر میں ہے

نہیں شہر طابتہ کی، نہیں قید انتہا کی  
 ہے لطیف قصہ تم، اسے پھیڑ دو جہاں سے  
 برق شرمندہ ادھر، میں ہوں پشیمان ادھر  
 چار تنکوں کے سوا، خاک نشین میں نہیں  
 ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں  
 درد آلودہ جبینِ مہر گ ہو جائیگی  
 جوش رہتا ہے بس اتنا دمِ تحریک جنوں  
 جیسے چھینے لیے جاتا ہے گریباں کوئی  
 اس قدر بے اعتباری پر ہے اتنا اعتبار  
 یوں! یہ ترے وعدے میں عجب تاخیر ہے  
 اک بات بھلا پوچھیں، کس طرح مناؤ گے؟  
 جیسے کوئی روٹھا ہے، اور تم کو منانا ہے  
 دیکھنا ظریف کہ باد صفت ہزاراں مستی  
 رازِ میخانے کا عفو کا ہے میخانے میں  
 آکے زرا میری قسم آزما تجھ سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہو  
 ہنگامہ ہستی کی بس اتنی حقیقت ہے  
 اک موج تھی جو اٹھ کر پھر مل گئی دریا میں

## نذر سجاد حیدر

نذر سجاد حیدر جنہیں کسی نے اردو کی جبین آشن کہا ہے، ۱۱ اتر پرودیش کے ایک قدیم زمیندار گھرانے کی امام بیوا تھیں۔ ان کے پردادا میر معصوم علی (مصنف اشک معصوم) سلطنت اودھ میں نانظم اور کچلہ دار تھے۔ ۱۸۵۵ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے پنجاب کا نظم و نسق چلانے کے لیے جن اصحاب کا یوپی سے انتخاب کیا تھا، ان میں میر معصوم علی کے صاحبزادے خان بہادر میر قائم علی بھی تھے۔ انھوں نے پنجاب کے قانون راضی کی تشکیل اور تنظیم میں نمایاں حصہ لیا۔ میر قائم علی کے پوتے اور میر منظر علی کے بیٹے خان بہادر میر نذر الباقر مدتوں فوج کے رسد (پلائی) کے ٹکے میں ایجنٹ کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں تعینات رہے۔ یہیں ان کے ۱۸۹۴ء میں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے نذر زہرا بیگم رکھا۔ یہ لڑکی اپنے خاندانی ماحول کے اثرات کے تحت بہت جلد لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گئی، اور اس کے مضمون بنت نذر الباقر کے قلمی نام سے

سید مشاّد علی مرحوم کے ماہر رسالے تہذیب نسواں میں چھپنے لگے۔ ۸۰ء میں جب اس کی غرض شکل سے ۴ سال کی ہو گئی، اس کا پہلا ناول "اختر النساء" دارالاشاعت لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

تہذیب نسواں کے علاوہ ان کے مضمون، تچوں کے ہفتہ وار پھول اور دوسرے رسائل میں بھی شائع ہو رہے تھے۔ ان کا معیار اتنا بلند تھا کہ محض کی دھوم مچ گئی۔ شدہ شدہ اس کی اطلاع کو اب بیگم بھوپال تک پہنچی، اور انھوں نے انھیں اپنا سکریٹری مقرر کرنے کی دعوت دی؛ لیکن میرزا دانی نے اپنی ساری روشن خیالی کے باوجود بیٹی کو یہ ملازمت قبول کرنے کی اجازت نہ دی۔ میرزا دانی قریح و رتوں کے روایتی پردے کے قائل نہیں تھے؛ لہذا ان کے گھر میں بھی اس کا رواج نہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیا، وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ لڑکیاں شرم دیا کو بالائے طاق رکھ کر جہاں چاہیں اکیلی پھرتی رہیں۔

۱۹۱۳ء میں نذر سہرا بیگم کی شادی سید تاجا حیدر یلدرم سے ہو گئی، جو اردو ادب میں رومانی افسانے اور مضمون نگاری کے بانیوں میں سے ہیں۔ یلدرم انگریزی ملازمت کے سلسلے میں بہت دن تک قسطنطنیہ اور بغداد میں مقیم رہے تھے اور وہاں سے واپسی پر امیر کابل کے نائب پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہو کر سواری میں رہنے لگے تھے۔ جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی تو ۱۹۲۰ء میں اس کے چیرمین (سجیل) مقرر ہوئے۔ شادی کے بعد نذر بیگم نے اپنا قلمی نام نذر اباقریب کو نذر تاجا حیدر رکھ لیا۔ انھوں نے ہر طرح یلدرم کا ہاتھ بٹایا۔ یونیورسٹی فنڈ میں چندہ جمع کرنے کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؛ بلکہ وہ اس کی یو۔ پی کی صوبائی شاخ کی سکریٹری بھی



میں۔ پھر کھدر پر چار میں پوری گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اسلامی ملکوں کی سیاحت بھی کی تھی۔ اس کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ انھوں نے آخر انسانا بیگم کے علاوہ اور بھی متعدد ناول لکھے جن میں سے حرمیں نصیب اور منظر ہاں، انجہ، اجانبان، ثریا، مذہب اور عشق وغیرہ نے خاصی شہرت حاصل کی۔

انھیں ۲۰-۲۵ برس سے فشارِ دم (دلہائی بلڈ پریشر) کا عارضہ تھا؛ ۱۹۶۱ء میں علاج کے لیے لندن بھی گئی تھیں۔ عمر کے ساتھ کچھ اور بچیدگیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ آخر ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ممبئی میں انتقال ہو گیا۔ اٹنا عشری آرام گاہِ ارحمت آباد (ممبئی) میں دفن ہوئیں۔

اس سلسلے میں دو ایک اور باتوں کا ذکر دل چاہی کا باعث ہو گا۔  
مذہر سجاد حیدر کے دادا میر منظر علی یا نکوٹ میں تحصیلدار تھے۔ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد (عرف میاں نتھو) ان کے گھر پر بیٹھ کر کپڑے سینے اور رفو کا کام کیا کرتے تھے۔ اقبال اپنی طالبِ علمی کے زمانے میں میر منظر علی کے تینوں بیٹوں کے ساتھ اسکول جایا کرتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ اقبال نے اپنے خطوں میں مذہر سجاد حیدر کو "آقا زادی" کے لقب سے خطاب کیا ہے۔

اردو کے ایک مصنف میر افضل علی ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب "تخیلات" آج سے ۵۰-۵۵ برس پہلے اچھی خاصی شہور رہی ہے۔ وہ کسی زمانے میں پنجاب میں انکم ٹکس کے تحکے میں ملازم تھے۔ اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ نسبتاً جوان عمری میں ان کا ۱۹۳۷ء میں انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت وہ غالباً لاہور میں اڈیشنل انکم ٹکس کمشنر تھے۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے

احمدی تھے۔ تو خیر، میر فضل علی، مرحومہ نذر سجاد حیدر کے ماموں زاد دادا،  
 چھوٹی زاد بھائی تھے، ان کی والدہ اکبری بیگم ان کی چھوٹی تھیں میر فضل علی  
 کی شادی ثروت آرا بیگم یعنی نذر سجاد حیدر کی چھوٹی بہن سے ہوئی تھی۔  
 خود اکبری بیگم کا مشہور ناول ”گودڑ کا لالہ“ غالباً ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا  
 تھا۔

قرۃ العین حیدر جنھیں اس سال (۱۹۶۷ء) افسانوں کے مجموعے ”پت بھر کی آواز“ پر  
 سہتیہ اکادمی کا انعام ملا ہے، نذر سجاد حیدر کی صاحبزادی ہیں۔

## علی بہادر خان، حافظ

ان کا خاندان مراد آباد کا رہنے والا تھا۔ علی بہادر خان ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا ان کی بہت کم عمری میں انتقال ہو گیا، جب کہ ہنوز ان کی تعلیم شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے ان کی تربیت کا بار بڑی مردانگی سے اٹھایا اور انھیں اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ان کا تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ دسویں درجے میں صوبے بھر کے اعلیٰ درجے کے طلبہ میں تھے؛ وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ پہنچے؛ ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر نوکر حسین مرحوم ان کے مناصر تھے۔ یہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی ایس سی کی امتحان سہلی۔ ایم ایس سی میں تعلیم پڑ ہے تھے کہ ملک میں قومی تحریک اور عدم تعاون کے ہنگامے میں کالج کو خیر باد کہہ دیا؛ اور کانگریس اور خلافت کے سرگرم رکن بن گئے۔

اب انھوں نے صحافت کی طرف رخ کیا۔ تاج اہلپور اور مدینہ بھٹو اور نصرت بھٹی کی ادارت سے وابستہ رہے، اور اس میں اپنی کامیابی حاصل

کی کمر کزی جمیعت خلافت کے اخبار خلافت بمبئی کی ادارت ان کے سپرد کر دی گئی۔ اس عہدے پر چار برس تک کام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا مفتے دار "اتحاد" اور جوائین کے لیے "معین نسواں" جاری کیے۔ اسی کے ساتھ روزنامہ "ہلال" جاری کیا، جو آج تک زندہ ہے۔ اسی دوران میں قید و بند کے امتلا سے بھی دو چار ہونا پڑا۔

وسیع معلومات کے مالک تھے اور متعدد ذرا بڑے جانتے تھے۔ قلم میں زور تھا اس لیے ان کی تحریر سے دلوق اور دقت کا اظہار ہوتا تھا۔ صحافتی سرگرمیوں کے علاوہ بعض کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔ مثلاً محمود غزنوی، حکومت الہیہ، پردہ اور اسلام، ترکی زبان وغیرہ۔ بعض انگریزی کتابیں اور مختصر رسالے بھی شائع ہوئے؛ انگریزی میں بعض پرچے بھی چھاپے۔ وفات سے پہلے اردو مفتے دار "دور جدید" کے اڈیٹر تھے۔

حکمت قلب کے بند ہو جانے سے ۵/۶ نومبر ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب دلی میں انتقال کیا۔ اگلے دن جنازہ اٹھا اور جسدِ خاکی فیروز شاہ کوٹلہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ تخلص ہلال تھا۔ ایک غزل کے چند شعر دیکھیے:

ستم سے کھیلنے والے، جفا سے کھیلنے والے

جفا تو کیا، مسلمان ہیں قضا سے کھیلنے والے  
مسلمان خاک و خون میں جان پر کھیلے ہیں نہیں  
خبر نہیں ہو تجھے، رقص و غنا سے کھیلنے والے!

جہادِ زندگی ہے کس قدر مجبورہ! افسردہ

بقا کا لطف، پاتے ہیں، فنا سے کھیلنے والے

-مذکورہ معاصرین

تعب کیا، بنائیں بھیلوں میں آسٹیاں اپنا  
چمن میں جلوہ برق و قاسم سے کھیلنے والے  
کبھی تو خاک و خوں میں جان پر کھیلے، تو ہم جاہلی  
خدا کے نام پر اکبر و دریا سے کھیلنے والے  
وہی منزل پر بڑھتے ہیں، وہی ساحل کو پاتے ہیں  
سینے جو ہیں گرواب بلا سے کھیلنے والے  
شکت ہو رہا پزندگی، توفی ہوئی مضارب گرو  
توہیں کیا، ہم ہیں ساز بے تواسے کھیلنے والے  
ہلال! ان کوٹے کا لطف جینے اور مرنے کا  
جہاد حق میں جو ہوں گے قصائے کھیلنے والے

## ہاشمہ سدرشن ابدری ناتھ

منشی پریم چند کی افسانہ نگاری نے بہت لوگوں کو متاثر کیا، لیکن غالباً ہاشمہ سدرشن اور اعظم کرپوری کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ اعظم کرپوری کو ہم سے جدا ہوئے بہت دن ہوئے۔ ہاشمہ سدرشن کا بھی ۱۶ دسمبر ۱۹۶۷ کو ہری کوشن ہسپتال، بمبئی میں انتقال ہو گیا۔

ہاشمہ سدرشن کا اصلی نام بدری ناتھ تھا۔ وہ ۱۸۹۷ء میں ضلع سیال کوٹ کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ شروع سے طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل تھی۔ کہتے ہیں کہ جب ان کا پہلا افسانہ چھپا ہے، وہ ہنوز اکٹھویں درجے کے طالب علم تھے۔ بی اے تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد انھوں نے دو چیزوں کو اپنا اوڑھنا بچھڑنا بنالیا۔ آریہ سماج تحریک اور افسانہ نویسی؛ اور بعد کو یہ شوق محض افسانہ نویسی تک محدود ہو گیا۔ اس کی تشکیل اور تسکین کے لیے انھوں نے ماہنامہ چندرن جاری کیا تھا، جس میں صرف افسانے چھپتے تھے۔ ان کی شہرت میں اب... روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ فلیکس کپسین والوں نے

پبلسٹ کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لیں، یہاں وہ چار سو مشاہیر ہاتھ تھے۔ اس کے بعد انھوں نے قلم کے لیے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلے میں وہ چند بھارت کشی پکچر (کلکتہ) اور نیو تھیٹر (کلکتہ) سے وابستہ رہے۔ آخر الذکر کی فلم دھوپ چھاؤں کی کہانی کے علاوہ گانے بھی انھیں نے لکھے تھے۔ اس کے گیت: دنیا رنگ رنگیلی بابا، اور تیری گٹھری میں لاگا چور بہت مقبول ہوئے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی بھی انھیں اپنی مجلسوں میں شاکر تھے۔ ہر دلعزیز ٹھوکار سہگل کا ایک گیت: ”اب میں کیا کروں، کت جاؤں بہت مشہور ہے؛ یہ بھی سدشن نے لکھا تھا۔ انھوں نے تقریباً ۵۰۰ فلموں کی کہانیاں، گیت اور سکا لے لکھے۔ ان میں دھوپ چھاؤں، پتھروں کا سوداگر، دشمن، گر امون سنگر، پردیسی، سکھرا، پڑوسی، چندر سیکھا وغیرہ بہت کامیاب رہیں۔

جہاں سدشن نے اپنی تصنیفی زندگی اردو سے شروع کی تھی، لیکن بعد کو وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے تھے؛ اور رفتہ رفتہ صرف ہندی کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن اردو افسانے کے ارتقا میں ان کا حصہ فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو میں ان کے کہانیوں کے چار مجموعے شائع ہوئے، سدا بہار پھول، چندن، بہارِ سحر اور سونہ سنگھار۔ اس کے علاوہ انھوں نے مشہور بنگالی ناول نویں بنکم چندر چٹرجی کے دواول تازا زبانی اور زہرِ آب حیات کے نام سے اردو زبان میں منتقل کیے تھے۔ ایک اور ناول عورت کی محبت بھی بنگالی سے ترجمہ کیا تھا۔ بے گناہ مجرم، بعض بنگالی اور فرانسیسی ناولوں پر مبنی تھا۔ ہندی میں ان کی تقریباً بیس کتابیں ہیں۔

## سراج لکھنوی، سراج الحسن

سراج الحسن سراج کہنے کو تو لکھنوی شاعر تھے۔ لیکن ہے یہ کہ ان کے ہاں لکھنؤ کی خارجیت سے زیادہ دلی کی داخلیت ملتی ہے۔ انھوں نے پیارے صاحب زشید اور ان کے بھائی باقر رضا حمید۔ دونوں سے اصلاح لی اور خود استاد کا درجہ حاصل کیا۔ لکھنؤ میں ان کے بہت شاگرد ہیں۔

سراج کا خاندان قدیمی کٹرہ مانپکھور کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے والد شیخ نور الحسن نقل مکان کر کے لکھنؤ میں آسے تھے۔ یہیں ۱۸۹۲ء میں سراج پیدا ہوئے۔ انگریزی میں دسویں درجے تک تعلیم چارج مشن ہائی اسکول لکھنؤ میں پائی۔ اور اس کے بعد محکمہ امداد و باہمی (کوآپریٹو سوسائٹی) میں ملازم ہو گئے۔ ساری عمر اسی محکمے میں گزری اور یہیں سے ۱۹۴۶ء میں پنشن پائی۔ کتبہ خاصا بڑا تھا۔ تنخواہ بھی قلیل رہی، ادیشن تو خاطر بہت کم قلیل تر ہوتا ہی چاہیے تھے۔ اس لیے عمیر الحالی میں بسر ہوتی، کبھی خوش سالی کا منہ دیکھن نصیب نہ ہوا۔



انہوں نے ۱۹۰۸ء میں شعر کا شروع کیا۔ اردو کا یہ مشہور شعرا نہیں کا ہوا

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے  
اک زردا آپ کو زحمت ہوگی

کلام میں غزلیات کا انتخاب قطعاً آوازہ کے عنوان سے ۱۹۲۰ء کے قریب شائع ہوا تھا۔ بہت سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ کسی زمانے میں وہ بکھڑکی ادبی انجمن معراج الادب اسے وابستہ رہے؛ بلکہ اس کے ایک سکرتر تھے؛ صدہ حکیم آشفتم تھے۔ لیکن بعد کو جب اس کے ادائیکن میں باہم شدید اختلافات پیدا ہوئے، تو سراج اس سے الگ ہو گئے اور بہار بکھڑکی کی قائم کردہ انجمن بہار ادب میں شامل ہو گئے۔ وہ مدتوں اس کے بھی سرگرم رکن رہے، جہاں خانوش اور مرغیاں مرغ طبعیت پائی تھی، جذبات کی رد میں نہیں بہ جانے تھے۔ جس دانے میں پورا بکھڑکیاں نکالنے کے خلاف تھا اور کسی کی جرات نہیں تھی کہ غریزہ اور ان کے دوستوں کو ناراض کر کے بکھڑکی کے حق میں کلمہ خیر کہے، سراج نے بکھڑکی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

تندرستی کبھی تسلی بخش نہیں رہی، فشار دم کے دائمی مریض تھے۔ بالآخر اسی سے ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء صبح ساڑھے آٹھ بجے جان بحق ہوئے۔ عین شام کے قبرستان میں اسخوی آرام گاہ بنی۔

اب کچھ شعر دیکھیے، جو ان کے مجموعہ کلام شعلہ آوازہ سے اخذ ہیں:

مری قبا بھی ہو تکمیل آرزو ہے حیات      کر خاک تو ہوں، مگر خاک کسے یاد ہوں  
ہو خوابِ عدم زلفِ سیاہِ خام نہیں ہو      اس شام کے بعد اور کوئی شام نہیں ہو  
روشنی کرتا ہوں کم شمع جلاتا ہوں کبھی      چاہتا ہوں کہ شامِ شام سحر ہو جائے  
نصیحتیں ہی ناصح! مئے سرسنگھوں پر      جو خود کسی کو ضرورت ہو دل نکالنے کی

مذکورہ معرین

جنا بھی کہتے ہیں احسان بھی جتاتے ہیں کہ جیسے ہم کو غرض ہو ستم اٹھانے کی  
وہ سنگ راہ ہیں، سنگ تاراں نہ ہیں صلاحیت بھی تو ہو، نعمت آؤ مانے کی  
کیا کہوں، حضرت! صبح! نہیں حاضر ہے دماغ

پھر کسی دن نہ چلے آئے، سمجھانے کو؟  
اب آگے دیکھئے تقدیر کیا دکھاتی ہے  
تقص تک آ کے تو پہنچا گئی بہار بچے  
پردوں سے منہ کو چھپائے تقص میں بیٹھا ہوں

یہ شرم ہے کہ نہ پہچان لے بہار بچے  
لشیں نشتر، صیاد و شمن، پھول بچکا نے  
تقص کے رہنے والو! کج ہی کل میں کھائی تاپوں  
چہرہ اداس، آنکھوں میں آنسو، لبوں پہ آہ

سب رنگ پھیکے پڑ گئے، دل ٹوٹنے کے بعد  
اب بچے نامرادِ ذمیت کہ کے پکارتے ہیں لوگ  
سب نے سمجھ لیا ہے یہ جیسے مرا خدا نہیں  
تجھ سے بہت ملا مجھے، تو نے بہت دیا مجھے  
اب تجھے مانگتا ہوں میں، اب کوئی حوصلہ نہیں

باتیں بھی بیروفا کی بہت دل فریب ہیں  
کچھ رنگ بھی بھرا ہے مرے اعتبار نے  
ہر شکر دی پر کھینچ دی جیسے تری شبیہ  
کتنا حسین فریب دیا ہے بہار نے

نذکرہ معاصرین

یہ مقام عشق ہے کونسا، یہ ہیں کیسی صبر کی منزلیں  
نہ تڑپ ہو دل میں نہ درد ہے، نہ سکون چنانہ قرار ہے  
یہ خدا تو ہے وہی دکھ بھری، مرے کان میں سے یہ کشتا

ذرا چپ رہو، مجھے سننے دو! یہ تو میرے دل کی پکار ہو  
حقیقت میں بندہ بھی بننا نہ آیا سمجھتے تھے دل میں، خدا ہو گئے ہم  
قیامت تھا تجھ سے نکلا ہوں کا ملنا زمانے سے نا آشنا ہو گئے ہم  
خوشادہ دور کہ جب مرکزِ نگاہ تھے ہم  
پڑا جو وقت، تو اب کوئی رُشنا س نہیں

ہوا ہے رفتہ رفتہ یوں کسی کا سنگِ درانا  
بجائے کشتی دہلیزوں سے ٹکرایا ہو سراپنا  
یوں پہ نھکی، نظر میں حسرت، جو بات تھی تر جہاں دل تھی  
اسی کھٹک میں رہ گئے ہم، وہ حال پوچھیں تو ہم بتائیں  
غم کا خوگر ہو کہ یہ چیز ہے رہنے والی دل کو ماوس ذکرِ عیش کے سانپوں سے

## آفتاب پانی پتی، انوپ چند

۱۱۳ پرل ۱۸۹۶ء کو جیالکھی کے موسمی بیوہار کے دن پانی پت کے ایک کھاتے پیتے جمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کی تو یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں حکمت اور سرور کی قوی شاعری کا غلبہ ہر طرف بلند ہو رہا تھا۔ اس سے انھیں بھی شعر گوئی کی طرف توجہ ہوئی۔ اتفاق سے انھیں ایام میں مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی روزنامہ زمیندار (لاہور) کی ملازمت ترک کر کے اپنے وطن واپس آ گئے۔ آفتاب نے ان سے اصلاح کی درخواست کی، جو قبول ہوئی۔ یہ سلسلہ سلیم کی وفات (۱۹۲۷ء) تک جاری رہا۔

آفتاب کو غزل سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی، انھوں نے زیادہ تر نظمیں کہی ہیں، اور وہ بھی بیشتر قوی اور سیاسی۔ ان کے منظومات کے چھ مجموعے چھپ چکے ہیں: جلوۂ آفتاب ۱، آفتاب وطن، جذبات وطن، جذبات کی دنیا، حب وطن۔ شمشیر وطن۔ زبان سلیس اور بیان جذبات سے ملبوس منظومات کے علاوہ انھوں نے بعض ڈرامے بھی تصنیف کیے تھے۔ ان میں سے من مونی،

شریستی و بنخادیوی، ہندوستانی سورا، دیرپھڑانی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی قومی و ادبی خدمات کے پیشِ نظر حکومتِ ہریانہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو انھیں راج کوی اکا اعزاز عطا کیا تھا۔

۹ فروری ۱۹۶۸ء کو اچانک حرکتِ قلبِ بند ہو جانے سے پانی پت ہی میں انتقال ہو گیا۔ یہاں چند شعرا ان کے مجموعے 'جذبات کی دنیا' (دلی ۱۹۵۹ء) سے انتخاب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔

کتنے کو کٹ گئے ہیں ایامِ زندگی کے  
دور و شب گزار ہی دن بھر ہے پریشا  
لے جنشین! مجھ سے کیا حال پوچھتا ہو  
سمجھا تھا باغِ عالم کو راحتوں کی جا ہو  
امید تھی کہ جن سے آرام ہو گا حاصل  
اشکوں سے اور آہوں سے تازہ کر رہا ہو  
ہوش و حواس جب سے کھوئے ہیں نغمہ  
کس کو ہو فی مستیِ آفتابِ راحت

پُر بادۂ الم سے ہیں جامِ زندگی کے

کبھی روتا ہے پہروں، اور کبھی فریاد کرتا ہے

حقیقت میں یہ ایک تصویرِ غم، یوں بھی ہوا دیوں بھی

نگاہِ بہرِ دایم، یا چلائیں ظلم کے خنجر

دلِ مظلوم پر ان کا کرم، یوں بھی ہوا دیوں بھی

کروں فریادِ گرہِ حکم، ورنہ گھٹ کے مرجائوں

محبت میں سر تسلیم خم، یوں بھی ہوا دیوں بھی

نفس میں بند کر دے، یا مجھے آزاد رہنے دے  
 مری تقدیر میں سوزالم ایوں بھی ہے ادویوں بھی  
 رہوں خاموش تو مشکل؛ کروں فریاد تو مشکل  
 مرے نازوں پہلے دل پرستم یوں بھی ہوا دیوں بھی  
 مزاجب ہو کہ قیقتہ میرا تو غود پاک کر ڈالے  
 مجھے مزید ترے سر کی قسم ایوں بھی ہوا دیوں بھی  
 کہیں فرقت کا کھٹکا ہے، کہیں غیروں کی لفت کا  
 مریض عشق کا آنکھوں میں دم یوں بھی ہوا دیوں بھی  
 ذراحت مفلسی میں ہے، نہ دولت میں خوشی بھی  
 سروں پر فکر کی تیغ و درم ایوں بھی ہوا دیوں بھی  
 کہیں یہ نظم لکھتا ہے، کہیں یہ نثر لکھتا ہے  
 رواں کسے آفتاب اپنا قلم یوں بھی ہوا دیوں بھی  
 اپنی حالت کے بدلنے کا ہے حکم کو قیاس  
 گردش دہرے تیار بدلنے کے لیے  
 چاہتا ہوں کہ کہوں حال محبت ان سے  
 دل یہ کہتا ہے کہ افسانہ غم یاد نہیں  
 آدمی کے لیے اچھا نہیں غافل ہو نا  
 وہ بھی کیا ہے جسے مرنے کی گھڑی یاد نہیں

## محمد عبدالباقی

اردو کے ممتاز صحافی مولانا محمد عبدالباقی کا بروز جمعہ ۲۴ فروری ۱۹۶۸ء ساڑھے پانچ بجے شام دہلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ایک زمانے سے اختلاجِ قلب کے مریض تھے۔ ۲۱ فروری کو مرض کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر انھیں سہ روز سنگ ہوم (دہلی) میں داخل کیا گیا، جہاں دو دن بعد حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رہ گرا۔ عالمِ جاودانی ہوئے۔ اگلے دن ۲۵ فروری کو جنازہ اٹھا۔ نمازِ جنازہ قاضی زین العابدین تجداد استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پڑھائی اور انھیں جاسمینگر کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا محمد عبدالباقی کو اٹھ، ضلع شاہ آباد (بہار) کے ایک شہانِ خاندان میں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ یہ جگہ شیر شاہ سوری کی جگہ ولادتِ بہرام سے کوئی دس بارہ میل دور پٹانوں کی مشہور بستی ہے۔ ان کے والد عبدالسلام صاحب فوج میں ڈاکٹر تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور پہنچے اور مولانا فخر علی خاں کے روزنامہ زمیندار کے ادارہ فخریہ میں شامل ہو گئے یہاں

الگ ہوئے، تو صدیق حبیب اور محفوظ الحق (جامعی) کے تعاون سے روزنامہ "آزادہ نکالا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں اس شان اور اہتمام سے کوئی روزنامہ آج تک نہیں چھپا۔ انیس کہ یہ چشمہ حوادث کا شکار ہو گیا؛ اس معیار کے احباب کے اخراجات کے لیے جس قارون کے خزانے کی ضرورت تھی، وہ باقی صاحب اور ان کے دوستوں کے پاس تھا نہیں؛ چنانچہ چند ماہ بعد پرچہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بہادر چلے گئے اور پٹنہ سے "استقلال جاری کیا، جو مہینے میں دو بار چھپتا تھا۔ جب ۱۹۳۶ء میں کانگریس نے سری کرشن سنہا کی قیادت میں بہار میں پہلی وزارت بنائی، تو باقی صاحب اس میں مصلحت کے لیے پہلی افسر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں جیل نظری اور رام دھاری سنگھ دلو بھی اسی محلے میں ملازم تھے۔ جب سری کرشن سنہا کی وزارت مستعفی ہوئی، تو یہ لاہور پہنچے۔ اتحاد پارٹی کے اکابر سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ حضرت جیات خان ٹوانہ نے انھیں اپنے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کا ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر کر دیا (خواجہ کمر نواز احمد صاحب تھے)

آزادی اور تقسیم ملک کے بعد وہ دلی آئے اور "پیام وطن" کے نام سے اپنا روزنامہ شائع کرنے لگے۔ یہ پرچہ کوئی تین چار برس جاری رہا۔ اس کے بند ہو جانے پر وہ ریاست کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن یہاں کی فضا اس نہ آئی، اور انھیں دلی واپس آنا پڑا۔ یہاں مختلف رسائل و جرائد میں مضمون لکھ کر بسر اوقات کے لیے کچھ پیدا کر لیتے تھے۔ آخری ایام میں اپنا ایک مہفت روزہ "کاروان سنہر" شائع کرتے تھے، اور اس کے علاوہ متعدد دوسرے پرچوں میں بھی اجرت پر مضمون لکھتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بلند پایہ صحافی تھے۔ وسیع معلومات، زور قلم



تو بہ استدلال، ان کی تحریر کا طرہ امتیاز تھے۔ لیکن افسوس کہ عدم استقلال اور مزاج کے لالہ بالیٰ پن نے کہیں جم کر کام نہ کرنے دیا: اسی لیے بیشتر زمانہ اغلاس اور تکلیف میں بسر ہوا۔

## صولت ٹونکی، محمود الحسن عرب

محمود الحسن نام تھا، لیکن چوں کہ قوم کے عرب تھے، اس لیے عام طور پر محمود الحسن عرب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کے والد سید حامد عرب، نواب ابراہیم علی خان بہادر کے عہد میں ٹونک وارد ہوئے۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی۔ نواب صاحب نے دو گھاؤں "جاہداد اہل عرب" کے نام سے وقف کر رکھے تھے، ان سے عرب ہانوں کو تحفے تحائف اور نذرانے دیے جاتے تھے۔ انھوں نے سید حامد کو "معرب عرب" نامزد کر کے اس جاہداد کا منصرم بنا دیا۔

یہیں ٹونک میں ۱۲۱۳ھ میں سید حامد کے ہاں محمود الحسن پیدا ہوئے، تو نواب وزیر الدولہ مرحوم کی صاحبزادی اور پھر بہو (صاحبزادہ عبداللہ خان کی بیوی) رقیۃ بیگم نے نواسہ کو اپنا مقبض بنالیا۔ چنانچہ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی اور وہ شاہی خاندان کے صاحبزادگان کے ساتھ پروان چڑھے۔ تعلیم کا معیار بھی بلند رہا، مختلف اساتذہ سے حبلہ درسیا

پر عبور اور ان میں پوری جہارت حاصل کی۔

نواب ابراہیم علی خان شاعر تھے، بخیل تخلص تھا۔ بعض اساتذہ عہد ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ سلیمان خان اسد لکھنوی، احمد حسین بسل خیر آبادی، افتخار حسین مضطر خیر آبادی، ظہیر دہلوی ان میں خاص طور پر مشہور ہیں۔ نواب صاحب کے اس ذوق کے باعث پوری فضا پر شعر و نغمہ چھائے ہوئے تھے۔ داغ کے مشہور تلامذہ صاحبزادہ احمد سعید خان عاشق اور کیف کی ہوش اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ صولت نے ہوش بسنچا لا، تو وہ بھی اسی کیف و رنگ کی دنیا میں کھو گئے، اور شعر کہنے لگے، اس میں مشورہ عاشق اور کیف سے رہا۔ دونوں استاد ماہر فن اور قادر الکلام مخنور تھے۔ بہت جلد صولت بھی اس میدان کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو گئے۔ رسی سہی کسر مشق نے پوری کر دی، اور ان کا شمار اپنے زمانے کے صفیادوں کے شاعروں میں ہونے لگا۔

بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ درباری تعلق کے باعث ان کے کلام میں قصائد اور مدحیہ قطعات وغیرہ کا بھی وافر حصہ ہو۔ ان کی عشق و سو میں ڈوبی ہوئی نعیتیں مولود کی محظوں میں بڑی مقبول ہیں۔ تو تک کی ایک خاص صنف سخن چار بیتی ہے۔

صولت نے اس میں بھی طبع بدست پسند کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ کچھ مزاحیہ کلام بھی ہے، لیکن انہیں کمرزاج کی وارفتگی اور لاابالی پن نے عمر بھر کلام کی تدوین سے بے نیاز کر رکھا، آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ غیر مرتب کلام ان کے ورثہ کے پاس موجود ہے۔ کاش کوئی ائمہ کا بندہ محنت کر کے اس کا ایک نمایندہ انتخاب شائع کر دے، اس طرح یہ ضائع

ہونے سے بچ جائیگا اور ان کی یادگار بھی قائم رہیگی۔

انہوں نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ صاحبزادہ افتخار علی خان ان کے شاگرد تھے، دو سو روپے مہینہ اندر اندر پیش کرتے تھے۔ نواب اسماعیل علی خان نے بھی سو روپے مہینہ اپنے جیب خاص سے ان کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ جاوید اہل عرب، اور دقیر بیگم کے خرمکے سے بھی کچھ ملتا تھا۔ لیکن چون کہ وہ دارپا بہت تھیں، اس پر گرانی کا یہ عالم کہ اس نے بڑے بڑوں کا مطلقہ بند کر رکھا ہے۔ تنگی ترشی سے مسرقات ہوتی تھی۔

۲۶ مارچ ۱۹۶۸ء کی صبح گھٹے کے کینسر کے عارضے سے انتقال ہوا۔ خیرؔ تو ایک جہان ہو گیا، ورنہ ہے یہ کہ جب ۱۹۶۷ء میں ان کا بڑا بیٹا پیارے میا اللہ کو چارہ ہوا تو اسی دن سے وہ گھٹنے لگے تھے۔ یہی غم جان بیوا شہادت ہوا۔ ٹونک کے مشہور شاہی قبرستان قوتی باغ کے قطعہ خاص میں دفن ہوئے۔ ہجری سال وفات (۱۳۸۷ھ) کے نام مولانا محمود الحسن صولت ٹونکی سے برآمد ہوتا ہے۔ اولاد میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں۔ انقلاب کلام و رنج ذیل ہے۔

حدو کی پاسداری کا قول سے شک نکل جاتا

کسی صورت سے لے لیتا ہمارا امتحاں قاتل

ہر اک اس کی ادا پر خود ہی اپنی جان دی ہلے

حقیقت میں ہیں قاتل ہی اپنے وہ کہاں قاتل

ہیں پھر شک رہیگا عمر بھر، اپنی محبت میں

خدا کے واسطے، لے لے ہمارا امتحاں قاتل

ہر ایکوں کو نہ تیرا خاتمہ بالآخر اسے صولت!

جو اک اللہ آدم آخر بھی تھا دہو نہ باؤ قاتل

مذکورہ معاصرین

نیچے کیا اگر انسان جیسی شکل پائی ہے

وہ جو انسان جو انسان کے کام آئے مشکل

وہ کھلا دل سے ارمان جو نہ تھا دل سے نکلنے کا

جسے دل سے نکالا تھا وہ ارمان و گیا دل میں

چلو یہ عمرِ فانی کے ہاتھوں ہاتھ لے آئیں

حیاتِ جاودانی لٹ رہی ہو کسے قاتل میں

سب کچھ دی کام آیا قسمت میں جو کھا تھا مجھ کو تو کسی سے بھی شکوہ ڈگلا کوئی

یہ تم نے مسکرائے حجابِ بہار میں سب گل کھلانے ہیں چین رو دکا میں

ہوتا نہیں جو صدق سے انسان منفصل صولت ہیں جو کہنا ہو کہ میں ہزار میں

کہاں کا نا خدا کیسا سفید ہو چہ دریا کیا خدا پر رکھ نظر لے سوے ساحل کیجئے دلا

بامِ دور مطلعِ انوار نظر آتے ہیں اُن کے آنے کے سے آئنا نظر آتے ہیں

حسِ نخواستہ نفاذ نہ نہیں ہونے پاتا یوں نظر آنے کو سوار نظر آتے ہیں

اب نہیں میں ان کو نہ پہچاؤں تو میرا تصور

ورنہ وہ تو ہر طرف ہیں جلوہ گر میرے لیے

زلفِ دہخ اُن کے سلامت کیا غمِ شام و بچا

شام اک میرے لیے چہ اک سحر میرے لیے

تا تو انی سے مری یہ بار اٹھ سکتا نہیں

کوہِ صولتِ اغمِ مرگِ جگر میرے لیے

رہتے ہیں آسمانِ دُز میں اس کی تاک میں

کیا کیا مصیبتیں ہیں غریب اک بشر کے ساتھ

اے خضر! مشق کر کے گزار دو تو بات ہے

حوالاتِ حیاتِ اغمِ حقیر کے ساتھ

مذکورہ سطر

میں کب غمِ تہنائی سے مضطرب ہوا تھا  
کس دن ترا چاہت، بہت کا فرائض ہوا تھا  
کیوں تم نے اٹھائی ہے قیامت میں قیامت  
شکوہ تو تھا مارا سحرِ محشر نہ ہوا تھا  
اس درد میں یہ کیسی مصیبت ہے، الہی!  
اس طرح تو جینا کبھی دُوبھر نہ ہوا تھا

یہ سچ نہیں کہ مزا الفتِ بہتاں میں نہیں  
سکتا ہی اتنی مگر قلبِ ناتواں میں نہیں  
عجب یہ الفتِ اولاد کا کرشمہ ہے  
جو دل کو چین، نفس میں ہو آشاں میں نہیں  
دُفرقِ تابہ قدم سب ترے محاسن ہیں  
کچھ اور ذکر کہیں میری داستان میں نہیں  
وہ تیرا در ہے کہ سر جس پہ خود بخود جھکا جائے  
کہیں یہ جذبِ کشش اور آستان میں نہیں

## پریم شکر فرحت دہلوی

پر پانے دتی وال تھے۔ یہیں ۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو ایک مثنوی تجارتی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ موہن لال گوئلہ کا (جو حیات میں) گھڑیوں کا کاروبار ہے۔ شاید اس خیال سے کہ بالآخر انھیں تجارت ہی کرنا ہے، تعلیم صرف انٹر میڈیٹ پائی؛ لیکن اس کے باوجود انگریزی بہت اچھی جانتے تھے، جیسا کہ ان کے شیگر کی متعدد نقطوں کے تراجم سے ظاہر ہے۔ فارسی سے بھی اچھی مرادلت تھی۔ اردو کے علاوہ منہدی سے بھی شغف تھا؛ ہری دیش بچپن ان کے محبوب شاعر تھے۔ اردو میں انیس و دو ہجرت کے مراٹھی اور اقبال کے کلام کے شیدائی تھے۔

اردو کا شوق بہت ابتدا میں پیدا ہوا۔ چند سے لالہ دھرم پال گپتا دفا سے مشورہ رہا؛ اب بہت دن سے بیٹیشور پر شاد منور لکھنؤ می اور کمال نظامی دہلوی (تلمیذ سائل دہلوی مرحوم) سے اصلاح لیتے تھے۔ محبوبہ کلام سادہ حیات کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔

آخری ایام میں ایک مثنوی (ساقی نامہ) لکھ رہے تھے، جو نامکمل رہ گئی۔  
ان کے جسم میں موٹاپے کے اثرات تھے، جس سے قلب کا فعل کمزور ہونے لگا  
تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۶۸ء کو اچانک اپنے دوسرے کوئی مکان میرٹھ میں حرکت  
بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ کائناتِ نقای کے قطعہ تاریخ کا آخری شعر:

اے سر پہ ہے ملی تاریخ یہ  
"فرطِ غم سے سب ہیں دو پارہ جگر"

(۱ + ۱۹۶۷ = ۱۹۶۸)

اب چند شعر دیکھیے۔

نصیبِ عظمتِ آدم کو لا مکاں بھی نہیں

اور آج اس سے پستی جہاں بھی نہیں

مزاچِ عشق کو مرغوب امتحاں بھی نہیں

مگر یہ بات محبت پہ کچھ گراں بھی نہیں

دورِ شوق میں تعمیرِ خود کیا جس کو

سرِ نیا ز کی قسمت وہ آستاں بھی نہیں

وہ صحنِ دردِ عشق، یہ عکسِ وقرا، یہ دشتِ بیاباں کچھ بھی نہیں

جز اپنی حد پر وا ذِ نظر، اسے دیدہ حیراں! کچھ بھی نہیں

لطفِ اندوزِ توانے سا دُشمن ہو چکا محو، اب تو ہوں، کیونکہ نغمہِ مدح میں

ہواں سمجھ کے "بھڑپہ زانہ ہوشمندہ زن" یہ مل رہا ہے میری وفا کا حلا جے

جوابِ گل میں پنہاں کون ہے، جانِ چمن ایسا

یہ گس کا ذکر کرتی ہے ہر اک پتی دباں ہو کر



تذکرہ معاصرین

رہ و فائیں ہر گام اک صغوت ہے  
کبھی کبھی تو یقین پر بھی سو گماں گزرتے  
ہر اک گماں نے جلایا مگر چراغ یقین  
یہ حادثات مرے درک پر گراں گزرتے

---

## پرنس شاہری، سید محمد اکرام حسین

ان کا اصلی نام سید محمد اکرام حسین تھا۔ ۱۹۱۰ء میں پٹنہ (لودی کٹرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید احمد حسین (ف ۱۹۵۳ء) خاصے کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ اس لیے انھوں نے بیٹے کو ایک زمانے تک مدرسے نہیں بھیجا، تمام تعلیم بیچ کے طور پر خاص اساتذہ کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے درس نظامیہ کامیابی اور فارسی کا بشیر نصاب پڑھا، جو بعد کو بہت کام آیا۔ اس کے بعد لامحالہ انگریزی کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۲۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے دسویں درجے کی سند لی۔ پھر پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، اور یہاں سے یکے بعد دیگرے بی اے اور ایم اے (اردو اور فارسی) اور قانون (ایل ایل بی) کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کی۔

شروع میں خیال تھا کہ وکالت کرینگے لیکن اسی زمانے میں ایک ناخوشگوار حادثہ پیش آیا جسے خود انھوں نے ”جذباتی صدمہ سے تعبیر کیا ہے۔ واقعہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ایک خاتون سے محبت ہو گئی اور وہ اس سے شادی

کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے لڑکی کے والدین اس عقد کے خلاف تھے۔ ہمارے ہاں والدین بچوں کے جذبات اور خواہشات کا کم ہی خیال کرتے ہیں۔ قصہ کو تادم ماں باپ نے لڑکی دوسری جگہ بیاہ دی۔ عفو ان شباب اور ایسا حادثہ، غریب کو اپنے کے درد و یار سے وحشت ہونے لگی، انہوں نے ترک وطن کی تھانی اور کلکتے کی راہ لی۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

کلکتے میں انہوں نے بسر اوقات کے لیے دکالت کی جگہ درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ شروع میں بہت دن تک مختلف اسکولوں میں معمولی بہگ اور قلیل مشاہرے پر کام کرنا پڑا۔ لیکن آدمی تھے مستقل مزاج اور دھن کے پکے، ہمت نہیں ہارے اور ڈٹے رہے۔ اسی دوران میں (۱۹۳۸ء) بی بی کی سندھی لے لی، جس سے تعلیمی محکمے میں ترقی کا راستہ کھل گیا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک مدنا پور کالج میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں سرنیدر ناتھ کالج، کلکتہ میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے؛ لیکن جلد ہی یہاں کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۴۹ء میں وہ کیونٹن ٹیئر پکسے والہ ہو گئے۔ اس کی پاداش میں قید و بند تک ذہن پہنچی۔ ڈیڑھ سال کی نظر بندی کے بعد ۱۹۵۱ء میں رہا ہوئے تو معلوم ہوا کہ اب وہ کالج کی ملازمت نہیں مل سکتی۔ مجبوراً ایک معمولی اور مفلسی کے شکار اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی قبول کر لی۔ جہاں تنخواہ اتنی بھی نہیں تھی کہ اس سے روزمرہ کے معمولی اخراجات ہی چل سکتے؛ لیکن مزاکیر کرتا۔ حسب توقع، دو برس بعد اسکول نے دم توڑ دیا اور ان کی نوکری کے ماننے بھی گئی۔ بارے، بلدیہ ہی سہی ایم او بی اسکول، کلکتہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اور اب گویا اطمینان کی سانس لینا نصیب ہوئی؛ یہاں وہ ۱۹۵۷ء

تک رہے۔

۱۹۵۸ء کے آغاز میں کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ کھلا، تو پھر رک جگہ پر ان کا تقرر ہو گیا؛ اپنی وفات تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔

مردِ باریک سے وہ ناکام محبت کا زخم مندھل ہو گیا تھا۔ اب کچھ دوی آسائش بھی میسر تھی، اس لیے انھوں نے نومبر ۱۹۵۸ء میں ایک بنگالی خاتون (فیلیس بیگم) سے شادی کر لی۔ دونوں ہم مذاق تھے؛ وہ بھی ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ جہانی یادگار ایک ٹر و سال لڑکی چھوڑی۔

انھیں ایک زمانے سے دے کا تکلیف دہ عارضہ لاحق تھا۔ آخری ایام میں بعض اور عوارض نے بھی آگیا تھا؛ بالخصوص کم خورانی ادبے حصی کی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ علاج ہو رہا تھا کہ ہم منی ہفتے کے دن طبیعت یکا یک زیادہ خراب ہو گئی؛ گیارہ بجے رات غشی کا دورہ پڑا۔ اس کے بعد وہ پھر ہوش میں نہیں آئے اور اسی حالت میں اگلے دن (۱۵ مئی ۱۹۶۸ء) کو سات بجے شام جان بحق ہو گئے۔ پیر کی صبح کو جنازہ اٹھا اور گوبرا قبرستان (د) میں سپردِ خاک ہوئے۔

بروز کے والد سید احمد حسین شعر کہتے تھے؛ احمد ادرضو تخلص تھا۔ بروز نے جب ہوش سنبھالا، تو اپنے ارد گرد شعر و ادب کی باتیں ہی سنیں۔ چنانچہ یہ بھی بہت کم عمری میں شعر سے دلچسپی لینے لگے۔ جب سن تیز کو پہنچے، تو بولانا عین الہدیٰ شمر (تلمیذ سید فرزند احمد صغیر بلگرامی) سے مشورہ کرنے لگے۔

شاہدی کا جزو اپنے دادا سید شاہد حسین کے نام کی مناسبت سے اضافہ کر لیا تھا۔ اگرچہ ان کی تعلیم و تربیت غزل کے دور اور ماحول میں ہوئی تھی، لیکن اپنے سیاسی رجحانات کے باعث انھوں نے غزل کے علاوہ نظم پر بھی

توجہ کی! اور اس میں اپنا منفرد مقام بنالیا۔ وہ کل منہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ "تھیں حیات" چھپ چکا ہے (مکتبہ شاہراہ ولی، ۱۹۷۵ء دوسرا "تھیں حیات" والا باب میں زیر طبع ہو۔) افسوس کہ یہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے شروع میں انھوں نے جو پیش لفظ لکھا تھا، اس میں مختصراً اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اور اپنے نظریۂ شعری پر بھی نظر ڈالی ہے۔

وہ کمیونسٹ خیال کے آدمی تھے، لیکن نہ ان کے خیالات میں جارحانہ شدت تھی، نہ ان کی وجہ سے ان کے کسی دوست کو کبھی بھی قسم کی تکلیف پہنچائی۔ ان کے تمام ملنے والے ان کی انسان دوستی اور وسیع قلبی، خلوص اور حسن نیت کے قائل تھے! ان کا کلام بھی اس کا شاہد ہے!

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اب چند شعر دیکھئے، جو ان کے دوسرے مجموعے "تھیں حیات" سے ماخوذ ہیں:

جہ تکثر یک حال کسی کی نظر نہ تھی      تھی زندگی حسین، مگر اس قدر نہ تھی  
"چشم شریک" جو بظاہر ادا کرتی تھی      دل ہی سے ہم کلام تھی، اس کی خبر نہ تھی

کوئی دیرِ حرم کو جا کے میخانے میں ڈال آئے

نہ حالِ شیخ اچھا ہے، نہ حالِ برہمن اچھا

زمانہ سازنی اہلِ بوس کی ہر دراز      کہ آپ محمودِ وفا ہی کے امتحاں میں رہا  
ازینِ شرکت ہی نہیں احساسِ یکجائی کو آج

مغلیں تو منشر کتنی دل بہتا میں ہی

مذکورہ معاصرین

دل والوں کی خاموشی ہی، بارِ سماعت ہوتی ہے

بے آواز کی کربِ فضا ہے، تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

جیسے بدلتی آوازیں ہیں، شام و سحر کی لاق ہیں

وقت کا دم کی ٹوٹ گیا ہے، تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

سکتے تک اب آپہنچا ہو، بڑھتے بڑھتے کرب کی

ہونتوں پر کیا وقت پڑا ہو، تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

شاید نگاہ پہنچے۔ اب وسعت زمیں تک پٹا تو ہے تصور تنگ آ کے آسمان سے

سب کے سب داغ بنے ہیں، بادہ کش کوئی نہیں

میکدے میں اب وہ قدر لغزش، پیہم کہاں

آنسوؤں میں غرق ہو جاتا ہو دل کا اضطراب

غم پرستوں کے مقتدر میں شعور، غم کہاں

دیرانیوں نے بڑھ کے بالی ہیں بستی، اب کوہِ وحشت میں کوئی دیرانیوں کا

ہے زندگی تعاونِ عقل و جنوں کا نام دل سے سلوکِ ذہن و قیاد کیوں ہے

ہر ادایت نے کیے تیرے ہی بت کو نجد ہر بغاوت مجھے تیری ہی پرستار ملی

منزل بھی میگی رستے میں اتم راگزرد کی بات کرو

آغازِ سفر سے پہلے، کیوں انجامِ سفر کی بات کرو

ظالم نے لیا ہے شراب کو پھر گوشہِ داناں چٹکی میں

ہے وقت کہ تم، بیباکی سے اب دیدہ ترک کی بات کرو

آیا ہے چمن میں موسمِ گل، آئی ہیں جوانی و زنداں تک

دیوار کی باتیں ہو لینگ، اس وقت تو دور کی بات کرو

ہے تیز ہوا، ہٹا ہے قفسِ خطرے میں پڑی ہو ہر تیل

نمرادِ اسیری بند کرو، اب جنبش پر کی بات کرو

کیوں وار و دس کے سائے میں منظور کی باتیں کرتے ہیں؟  
 دکھنا ہے جو اپنا سرا و نچا، تو اپنے ہی سر کی پٹ کرو  
 کیوں اہل جنوں اربابِ خود کی محفل میں خاموش رہیں  
 وہ اپنے ہنر کی بات کریں، تم اپنے ہنر کی بات کرو  
 کیا ربط و دف و دم توڑ چکے، موت آنکھی کیا ہر نغمے کو؟  
 تم مطربِ جام و مینا ہو رکھو تیغ و سپر کی بات کرو

## بے چہرگی

ہزار پوسٹ استخوان،	ہزار چہرہ آدمی
ہزار لبِ قسری،	معاشیاتِ حرص کا ابلتا خلفشار ہے
ہزار پردہ تشنگی،	عجم انتشار ہے
ہزار جیل بے دلی،	نظامِ بے ہمار کا عظیم شاہکار ہے
ہزار عشوہ خود دہری،	ہزار چہرہ آدمی
ہزار غمزدہ عاجزی،	مخود اپنا چہرہ ڈھونڈتا
ہزار سچ آگہی،	دواں دواں
ہزار عقدہ ابلیس،	ابھی یہاں،
ہزار بھجہ خاموشی،	ابھی وہاں،
ہزار مرگ زندگی،	نہ کوئی قسمت ذہن میں،
غردِ برتری کے ساتھ اختلاجِ کتری!	نہ کوئی راہ سامنے!
یہ پارہ پارہ آدمی،	فقطا فریبِ کاری ان کی گرد و ڈھکر
یہ ریزہ ریزہ آدمی،	کبھی ہو دوڑتا ادھر،

کہیں ہے بھاگتا ادھر! ہزار چہرہ آدمی  
 ہو کوئی اس کا ہمسفر؟ ہزار چہرگی لیے  
 خود اس کے چہروں کے ہجوم میں جو چہرہ بھٹک رہا ہو بے ارادہ صرف اپنی خاموشی  
 کھو گیا، دوبارہ وہ یہ کیا؟ کہ اس کو۔۔۔۔۔  
 تعاون آئیے گا بھی فریب ہی فریب! چہرہ چاہیے۔  
 نظر لگائے غوطہ کیا کہ آئینہ اتھاہ ہو خود اپنا چہرہ چاہیے۔  
 خود اپنے چہروں کا ہجوم درطِ نگاہ ہو! وہ اصل چہرہ چاہیے  
 دکوئی نقشِ منفرد! بچہ کے جو سسک رہا ہے  
 نہ کوئی عکسِ معتبر چہروں ہی کی بھیڑ میں

## بینک

یہ کنشت و کلیسا، یہ دیو و دھرم  
 سب کے سب بینک ہیں کفر و دی کی قسطنطنیہ  
 حصہ داری سیاست کی ہے خم بہ خم  
 چمک کی صورت یہاں روز ٹھنٹے ہیں ہم  
 روز ٹھنٹے ہو خم

کہتے افسانے بنا کر دکھایے تھے شوق نے یوں نقابِ الٰہی حقیقت نے کہ حیلوں کر دیا  
 کس قدر مضبوط نکلے تیرے یوانے کے آتم شامِ غم کو جب پھوڑا، صبحِ تاباں کر دیا  
 ہے حیات اک شور و شمسِ منزلِ آخرت کی آتی جاتی سانسوں کو زندگی نہیں کہتے  
 وقت گزرا جو بے نصیالی میں وہ ترسے ہی خیال میں گر رہا



مرنے کے لیے پختل شوق کی ہے شرط جینے کے لیے تو ہوسِ خام بہت ہے  
 وعدہ نہیں ہے کوئی اگر ان کا انتظار پر دینا صبحِ شام کیے جا رہا ہوں میں  
 شکایت کر رہے ہیں اب اسجدہ ہاے رایگاں بھلے سے  
 نہ دیکھا جائیگا اب اسوے آستانِ بھلے سے

---

## فقیر سید وحید الدین

جن اصحاب کو ہمارا بھائی بنجیت سنگھ (۱۷۹۲-۱۸۳۹ء) کے حالات کے مطالعے کا اتفاق ہوا ہے، انھیں یاد ہوگا کہ ان کے دربار کی ایک نمایاں شخصیت فقیر سید عزیز الدین کی بھی تھی۔ وہ کچھ مدت ہمارا جاکے وزیر بھی رہے۔ سکھ دورِ سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی ان کے خاندان کی علم و ادب سے دلچسپی اور وضعداری قائم رہی۔ فقیر سید وحید الدین اسی نامور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

فقیر سید وحید الدین کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں اپنے کئی دوستوں کی طرح انھوں نے بھی فوجی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اس میں کرنل کے عہدے تک ترقی کی۔

انھیں اقبال سے عشق تھا، ان سے ذاتی تعلقات بھی ایک زمانے تک رہے چنانچہ انھوں نے اقبال کی زندگی سے متعلق تصاویر کا ایک مجموعہ (ایلم) اقبال ان کچر کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد مددگارِ فقیر (دوحصے) کے نام سے ایک کتاب شائع کی، جو طباعت و کتابت کے پہلو سے بھی اردو کی چند بہترین

کتبوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اس کا عنوان اقبال کی مشہور رباعی سے لیا گیا۔

سرورِ رفعت باز آید کہ تابد نیسے از حجاز آید کہ تابد

سر آمد روزگار این فقیرے و گردانے باز آید کہ تابد

اس کتاب میں انہوں نے اقبال کے حالات لکھے ہیں، جو خود ان کے علم میں تھے، ان کے عزیز دوستوں کے۔ اگرچہ یہ کتاب کوئی مسلسل سوانح عمری نہیں ہے، لیکن اس میں بعض بے حد قیمتی معلومات فراہم ہو گئی ہیں۔ کسی زمانے میں اقبال سے متعلق انہوں نے فیض کے تعاون سے ایک فلم بھی تیار کی تھی۔

فقیر سید رحید الدین نے حضرت رسول اسلام صلعم کی سوانح عمری (مصنِعِ اعظم) بھی لکھی تھی۔ یہ ان کی بہت مقبول کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اپنے معاصرین سے متعلق تاثرات اور یادداشتوں پر مشتمل ایک مجموعہ 'انجمن' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اور بھی کچھ چھوٹی بڑی تحریریں ان سے یادگار ہیں۔

اٹوئس سال کا بروذ منہ ۲۰ جولائی ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ان کی شرافت اور وضع داری اور علم و ادب کی سرپرستی ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات یاد آگئی ہے۔ ایک شخص تھا امین چند، سیلابی قسم کے انسان تھا۔ ۱۸۵۱-۱۸۵۲ء میں اس نے ملک کے بعض حصوں کی سیاحت کی اور بعد کو اس کے کوائف کتابی شکل میں سفرنامہ منشی امین چند کے عنوان سے ۱۸۵۹ء میں شائع کر دیے (مطبع کوہ نور لاہور) اس میں وہ لکھا ہو (ص ۴۳) کہ فقیر نور الدین اور فقیر عزیز الدین، اور اصل قوم کے حجام تھے۔ بظاہر بہت غلط معلوم ہوتی ہے۔ خدا معلوم، اس کا ذریعہ معلومات کیا تھا۔

## شفاء گوالیاری، سید محمد حسن

ان کے والد سید عوض علی طبابت کا پیشہ کرتے تھے۔ یہ خاندان دراصل قائم گنج (ضلع فرخ آباد - یوپی) کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جد امجد نقل مکان کر کے گوالیار میں جا بسے تھے۔ سید محمد حسن یہیں گوالیار میں دو شنبہ ۱۲ رمضان ۱۳۲۰ھ (۲۶ اگست ۱۹۱۲ء) کو پیدا ہوئے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو نام منظر علی تھا، جس سے ۱۳۲۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔

سید عوض علی اچھے طبیب تھے، لیکن اس سے مگر زیادہ کٹر مسلمان تھے۔ وہ بیٹے کو عالم دین اور فقیر شہر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ چار برس ہی کی عمر میں یہ ایک مولوی کے سپرد کر دیے گئے اور قرآن سے تعلیم کا آغاز ہوا، اس کے بعد فارسی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اگر ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) میں ان کے والد کا (بمعرہ ۵۰ سال) انتقال نہیں ہو گیا ہوتا، تو یقین ہے کہ یہ عربی فارسی کی تکمیل کے بعد کسی دینی درس گاہ میں مدرس بن جاتے یا پھر کسی مسجد کے پیش امام۔ لیکن جب اس کم عمری میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، تو ان کے بیٹوی احمد زمان

نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم زیادہ باقاعدگی سے ہونے لگی۔ عربی ختم ہو گئی، اور یہ اردو فارسی کے ساتھ انگریزی اور مراٹھی بھی پڑھنے لگے۔ اب انھوں نے میونسپل اسکول، لشکر گواہیا میں داخلہ لے لیا جتنی کہ یہاں سے دسویں درجے کی سند حاصل کرنی۔ چونکہ نئی حالات آگے تعلیم جاری رکھنے میں مانع تھے، اس لیے انھوں نے طبی سند (H.A.) حاصل کرنی۔ اور ریاست گواہیار کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ تقسیم ملک تک وہ گواہیار ہی میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب یہاں کی فضا مکدر ہو گئی، تو ہجرت کر کے بمبئی چلے گئے۔ یہاں شفا ٹیکل ہال کے نام سے اپنا مختصر ذاتی مطب اور دو خانہ کھول لیا اور یوں عزت و آبرو سے بسر کرنے لگے۔

انھیں تفکرات دنیا اور خالصے بڑے کہنے کی پرورش کے بارے پریشان حال رکھ کر جسم بھی مضمحل اور اکبر اتھا، اس پر تنفس اور شعال کے پرانے مریض تھے۔ انھوں کی بیماری بھی لاحق تھی، اور اسی کے علاج کے لیے بمبئی کے ٹی بی ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ ستمبر ۲۲ جولائی ۱۹۶۸ء سات بجے شام اسی ہسپتال میں انتقال ہوا۔ جنازہ اگلے دن صبح اٹھا اور دوپہر کے قریب قبرستان کے باغ میں سپرد خاک ہوئے۔ بسمل رتلائی نے قطعہ تاریخ وفات کہا:

شستہ گوا، پختہ گوا، امیر سخن بزم سیلاب کا سر طلعت

وقت آتا تھا یہ بھی اُسے بسمل! دردِ دل دے کے ہو شفا رخصت!

مرحوم نے شاعری ۱۹۲۲ء میں شروع کی۔ ہونہار بردا کے چمکے چمکے پات بہت جلد ان کا کلام پسند کیا جانے لگا، جس سے انھیں ۱۹۳۵ء میں ایک مختصر مجموعہ "گلہ سہ شفا" کے نام سے شائع کرنے کی جرأت ہوئی (شمس پریس، گواہیار)۔

اس میں صرف ۳۲ غزلیں اور ۳۲ ہی صفحات ہیں۔ ابھی تک انھوں نے کسی اتراو

سے شورہ سخن نہیں کیا، گوشتی سخن جاری تھی۔ بالآخر کئی دروازوں پر دستک دینے کے بعد ۱۹۴۰ء میں سیما بکری آبادی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ پانچ سال بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں استاد نے دھڑ فارغ الاصلاح قرار دے دیا، بلکہ دوسروں کے کلام پر اصلاح دینے کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ گویا دروازوں کا جھول جو کچھ تھا اور اب بھی ہے، اس میں کسی علمی و ادبی یا شاعرانہ صلاحیتوں کے نمایاں ہونے اور ترقی کرنے کا موقع معدوم تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۷ء میں وہ بھوپال منتقل ہو گئے، تو یہاں کا گرد و پیش سراسر ان کے سازگار ثابت ہوا۔ شہر میں اچھے ادیبوں اور شاعروں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ذکی وارثی (ف ۱۹۵۰ء) اور محمد یوسف قیصر بھوپالی (ف ۱۹۶۸ء) جیسے اساتذہ یہاں موجود تھے۔ شفا بھی ان حضرات کے یہاں آنے جانے لگے، اور انھیں خود اعتراف تھا کہ میں نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔

یہیں بھوپال میں انھوں نے اپنے متعدد مجموعے مرتب کر کے شائع کیے، آیاتِ شفا (غزلیات: ۱۹۵۱ء)، نبضِ حیات (غزلیات: ۱۹۵۵ء)، شاخِ زیتون رباعیات اور نظمیں، رگِ حیات (نظمیں)، ذخیرِ گل (غزلیات: ۱۹۶۳ء) اب بحیثیت شاعر انھیں مسئلہ مقام حاصل تھا۔ ان کی فنی معلومات بھی بہت وسیع تھیں، خاص طور پر عروض کی واقفیت بہت اچھی تھی۔ ان کا حلقہ تلمذ کوئی ۴۰ شاگردوں پر مشتمل ہو گا۔

اتنی معنوی اولاد کے ساتھ مرحوم دنیوی لحاظ سے بھی خوش قسمت تھے، دو بیٹوں سے آٹھ بیٹیاں اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یاد کا دھچھوڑے۔

اب کچھ کلام ملاحظہ کیجیے، جو ان کے مجموعے 'نبضِ حیات' سے ماخوذ ہیں۔

بھروسہ مشعلوں پر تاک جائے کارواں والو!  
خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانو مقام اپنا

جہاں سے تو ذرا پہچان لے، اپنی حقیقت کو

وہیں سے فرض ہو جاتا ہے تجھ پر، احترام اپنا

کیا ہوئی تیری نگاہ ہر سہارا کیوں افق سے ناگتا ہے تو، سحر؟  
عزم دل کی کوڑھائے تو کوئی رہ گزرنے والا ہے چراغِ رہ گز  
نگاہِ دل کے پر تو سے کریں شام و سحر روشن

مردِ خورشید کی مانند گی تک بات کیوں پہنچے!

محبت کی کہانی ہو کہ نفرت کی حکایت ہو

کس کی بھی سہی، لیکن کسی تک بات کیوں پہنچے

بھورپہ سانس پہ، یہ جو مسلسل مجھ کے اباؤں کے، کیا دل نہیں ہوتا؟  
اباؤں کوں سے گل رہ گئے ہیں کھلنے کو، انہیں، خیر ہو، کیوں مسکرائے دیوانے  
دیں سے گزرے ہیں، یا آسمان سے گزرے ہیں

جہاں کو ساتھ لیا ہے، جہاں سے گزرے ہیں

نہ پڑھیے، کششِ منزلِ حرمِ حبا ناں

یہیں کے ہو گئے، جو بھی جہاں سے گزرے ہیں

وہ جب دیکھتے ہیں کبھی میری جانب

تو میں جانبِ آسمان دیکھتا ہوں

کہانی کی یاد، کس کا ذکر، اس کی بزمِ رنگیں میں

ہمارا نام بھی اب تو براے نام آتا ہے

خدا شاہد کہ دل سے تو خدا کا نام لیتا ہوں

مگر لب پر جب آتا ہے، اٹھا رانا نام آتا ہے

زندگی ہے اک سلسلِ سوز، پیہم اضطراب  
 سعی حاصل سے قریب اور سعیِ لاحاصل سے دُور  
 دل میں ہے عوہمِ مسلسل، عوہم میں پیہم تڑپ  
 ہیں وہی کچھ پاس منزل کے، جو ہیں منزل سے دُور  
 حدِ عواں سے آگے، آخر اُٹھائے کہاں جلتے؟  
 تری عقل سے بڑھ کر، تیرے دیول نے کہاں جاتے  
 غمِ دوراں نے بڑھ کر، نو بڑھادی شمعِ ہستی کی  
 غمِ جاناں کے یہ بھٹکے ہوئے، اجانے کہاں جاتے  
 یہ نمودوں کی ہر شانِ بے نیاد کی ساقیہ بورہ  
 نہ جانے تم کہاں ہوتے، یہ میخانے کہاں جاتے  
 بھٹکتے پھر رہے ہیں مرنے والے جو پے منزل  
 یقیں کی راہ پر آجائیں لے کر وہ گماں اپنا  
 ہر اک شکوہ بجا، لیکن ذرا اتنا تو کھجا دو  
 نظر سے غیر کی کیوں دیکھتے ہو گلستاں اپنا  
 سہارا بخو دی کا کیا، جنوں کا آسرا یتا  
 دوا ہی کب ہے دخل، ماسوا اصلِ محبت میں  
 میری ہی عذیرہ آنکھیں، مجھ کو کرتیں مطمئن  
 ان کے لب پر میرے اشکوں کا جواب آیا تو کیا؟  
 داغِ ناکا کی تو اب بھی اسے جہیں سے منتقل  
 لاکھ ان کے آستاں سے کامیاب آیا تو کیا؟  
 اد توجہ کرنے والے! شکر یہ جب مت چکا  
 اب فیماں پرستشِ خانہ خراب آیا تو کیا؟



سذکوہ معاصرین

گلشن بدوش نظر میں، لب پر حسیں ترانہ

ہر اک ادا ہے ان کی، الفت کا اک فناء

اب تک نگاہ میں ہو، پہلی نگاہ ان کی

منہستی رہی محبت، لٹا رہا نہ ماند

کیا ہوں بیاں کسی سے تفسیر حسن و الفت

شعلوں کی اک کہانی، شبنم کا اک فناء

عجب ہو فطرت انسانیت کہ انساں کو

یقین کی حد میں بھی لاکھوں گہاں گزرتے ہیں

دفا کی راہ میں ایسی بھی ایک منزل ہے

جہاں سے رک کے ذرا دو جہاں گزرتے ہیں

جو ان کی یاد سے خالی ہوں، ان کے فکریں بڑے

حیات پر وہی لمحے گراں گزرتے ہیں

دعا میں ستم دشمنان کو دیتا ہوں

نظر سے جب کرم دوتاں گزرتے ہیں

خوش بیاں تلخی گفتار تک آ پہنچے ہیں

سینہ تلخی سے لب خاد تک آ پہنچے ہیں

کس لیے دانستہ ہم کھائیں فریب حسن و حسن

یکوں غلط تاثیر بظہر شعلہ و شبنم کریں!

ظلمات گھٹنے کا آخر، اور کب تک انتظار

لاؤ، باقی رات کو بڑھ کر سحر میں ضم کریں

جو برا کہتے ہیں عالم کو، انہیں یہ چاہیے

پہلے اپنے آپ کو شایعہ عالم کریں

سُورۃٴ معارج

وَرَّعَ وَرَّعَ کَا شُور وَّ ذَهْنِ کُو عِرْقَانِ بَکْهَآ

بے خبر تھے خود، جو ہم کو بے خبر سمجھا کے  
اُنکے ہم نے فروغِ دل پہ نظریں نہ ٹھیکیں

ہر دم پہ منحصر اپنی محسوس سمجھا کے  
خُجے اسی کا نام، دل کا سوز، معراجِ حیات

آدھی کو جب خوشی میں غم نظر آنے لگے  
آدھی بہا رتو اس وقت جبا بنے

صحنِ چمن میں غار کھلی جب سکوا سکے  
اس ہی کو مسکرانے کا حق ہے حقیقتاً

آنکھوں میں جس کی اشک ہوں اور کرا کے  
ہیں دجرا نفعال، خود اپنی مسیاہیاں

یوں وردِ شام غم پہ محسوس سکوا سکے!  
اگر غم کی ہوئی یوں کارِ عزائی تو کیا ہوگا؟

دہی ہوتے ہوئے بھی ان کے تہائی، تو کیا ہوگا؟  
جن سے گم ہو جائیں راہی، کچھ نشان ایسے بھی ہیں

نزدگی کے راستے میں، امتحاں ایسے بھی ہیں  
ظلم میں جن کے کرم ہے، لطف میں جن کے ستم

مہرباں ایسے بھی ہیں، تا مہرباں ایسے بھی ہیں  
تو نے سالات کو مجبور کیا ہو خود ہی کون کتنا ہو کہ مجبور تو حالات سے ہو!

کچھ خودی سے اور مطلبِ بخود ہی ہے  
اُدھر کلیاں، ہیں مصروفِ گراں خوابی

اگر ایسے میں پیغامِ سحر آیا، تو کیا ہوگا!  
۸۷

چلے تو ہیں لاشِ آتاں میں، اے شفا! ہم بھی

مگر اپنا ہی پہلے سنگِ دریا تو کیا ہو گا !

جب اٹھ ہے چمک کوئی دل میں دودھک روشنی ہو گئی ہے

اے غمِ معتزل! ترے دم سے زندگی کام کی ہو گئی ہے

عالمِ رنج و حرامِ نہ پوچھو ہر خوشی خواب سی ہو گئی ہے

ہوں پر ان کے حیاتِ آفریں بہنی نہ رہی

گلوں میں روح، ستاروں میں روشنی نہ رہی

خدا شناسوں کی پہچان ہی کوئی نہ رہی

کو سرکشی بھی باندازِ سرکشی نہ رہی

شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گزرے

چراغِ جلّے رہے، اور روشنی نہ رہی

بنائے ہم نے، شفا! دوستی کے وہ ڈھانچے

کو دشمنوں کو تناسے دشمنی نہ رہی

## امین حنین، خواجہ محمد مسیح پال

خواجہ محمد مسیح پال ۱۸۸۴ء میں سیالکوٹ، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ مشہور شاعر عبدالمسیح پال اثر صہبائی (ف ۱۹۶۳ء) ان کے برادرِ غزوہ تھے۔ ان کے والد خواجہ احمد دین پال عالمِ دینیات اور بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی تعلیم بھی عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ امین حنین کو یہ فخر حاصل تھا کہ اقبال کی طرح انھوں نے بھی شمس العلماء، سید میر حسن (ف ۱۹۲۹ء) سے عربی اور فارسی تعلیم پائی۔ اس کے بعد انگریزی کی طرف توجہ کی اور بالآخر بی اے کی سند مشن کالج سیالکوٹ سے حاصل کی۔ ملازمت کا بیشتر زمانہ ملکیت کی پولیٹیکل ایجنسی میں گزارا اور یہیں سے نیشن پائی۔ ان کی خدمات کا اعتراف انگریزی حکومت نے خطابِ خان بہادر سے کیا۔ اگرچہ شعر و سخن کی طرف میلان سید میر حسن کے تلمذ کے زمانے ہی میں پیدا ہو گیا تھا، لیکن اس کا آغاز ۱۹۰۲ء میں ہوا، جب ان کی چلی غزل لکھنؤ کے مشہور مغلہ ستے 'پیام یار' میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے تمام

اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، لیکن زیادہ تر غزل اور نظم سے مزادوت رہی۔ ہماری پھل دو سنتیں اقبال سے متاثر ہوئی ہیں اور ان سے ہمارے لوگوں نے ان کے تتبع کی کوشش کی، لیکن کامیابی الٹا اشارہ ملے معدودے چند کو غیب ہوئی۔ ان چند خوش نصیبوں میں امین حمزہ کا نام سرفہرست ہو، جیسا کہ ان کے مجموعہ کلام ”گلزارِ حیات“ کے ہر صفحے سے عیاں ہے۔ اسرارِ حیات کی تفسیر و تعبیر اخلاقیات اور انبیات سے شغف، غنفلتِ آدم اور عمل کی برتری ان کے نجی دل پسند موضوع سخن ہیں۔ ان کا ۱۳ اگست ۱۹۶۸ء کو یال کوٹ میں انتقال ہوا اور وہیں مشہور قبرستان ”امام صاحب“ میں سپردِ خاک ہوئے۔ اسی قبرستان میں علامہ اقبال مرحوم کے والد بزرگوار شیخ نور محمد اور برادرِ اکبر شیخ عطاء محمد بھی آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ کلام کا نودہ حسبِ ذیل ہے۔

درِ دلِ اصل میں تھا ولولہٴ جوشِ نو جس سے پردائے ناچیز شجرِ بو کے رمل  
عشق میں جوشِ عبودیت دلِ دبِ سکا کہیں آنسو کہیں نالہ کہیں پرہو کے رمل  
میں نہ کہتا تھا کہ لے دیدہ ترا ضبطِ کا خونِ دل ہو کے رمل، خونِ جگر ہو کے رمل  
لائے چسے ہیں جان کے، جینے کا اہتمام کر

جن میں ہو کیفِ زندگی، بہرِ خدا وہ کام کر  
مجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ، ہی ہونکائات

بات یہ راز کی نہیں، اپنا خود احترام کر  
چھوٹک دے نغمہٴ جانو سے سامانِ نفس

بلبلِ تفتہ جگر ! شکوہٴ صبا و نہ کر  
لطفِ جینے کا ہر جب ہی کہ دل مستِ خودی

آسمانِ تم سے یہ کہ دے امری ادا نہ کر

یاس میں پھوڑ کے سرمرتے ہیں کم ظرف! این!

ظرف عالی ہے ترا، بعیت فرما دے کر

تفکرات کی دنیا میں جستجوئے سکوں      علاج جس کا نہیں کوئی، ہو ہی وہ جنوں  
اسی کے خون سے رنگیں ہو داستانِ حیا      حال ہو کہ جیوں اور بیقرار نہ ہوں

افسانہ حیات کو دہرا رہا ہوں میں      یوں اپنی عمر رفتہ کو لوٹا رہا ہوں میں  
رستے کے اونچ نیچ سے واقف تو ہوں میں      ٹھوکر قدم قدم پر مگر کھار رہا ہوں میں

نہ سے اس آگ کو نارِ حلیل سے نسبت

کہ جس کے سوز میں گلزارِ جاودا نہ نہیں

شکستِ محبت عالی ہو، بخود ہی کی تلاش

کہ کارخانہ ہے دنیا، شرابِ خاندہ نہیں

بلبل سوختہ سماں سے شاہو میں نے

عشق اک آتشِ بے شعلہ ہے، گلزارِ حسن

صاف آتما ہے نظر، دیدہ بنیا کو یہی

عشقِ اقراءِ حقیقت ہے، اور اظہارِ حسن

عشقِ بیچارہ ہی آگاہ نہیں ہے، اور نہ

ردِ نیشاق سے خود اس کا طلبگار ہو حسن

اس حقیقت کو خدا را نظرِ اعجاز نہ کر      سر ہو جاتا ہو وہ شعلہ جو بیباک نہ ہو

اگر شمعِ حقیقت کی ضیا باری نہیں ہر سو

نقل کو کہاں سے آگئے آدابِ پروا؟

وہی اس بزمِ ہستی سے سرورِ اندوز مچتے ہیں

لگا ہی جن کی ہوں بیباک اور اطوارِ مردانہ

اک برق جو جو ہم تقاضا لیے ہوئے جانے، میں آگیا ہوں یہاں، کیا یہ ہوئے  
 اک نوکر، بے حجاب نہ ہونا تری ادا اک میں کہ شوق وید کی دنیا لیے ہوئے  
 اک نوکر اپنے حسن کی ہو آپ بھی دلیل اک میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لیے ہوئے  
 یہ نہ ہوتا مگر گئے ہوتے اس دل بڑ دبار کے صدقے  
 وہ کریں مجھ سے احتساب وفا ایسے روز شمار کے صدقے  
 غرق حیرت ہو چشمِ بختِ سحر آنکھ کی اشک باریاں، تو بہ!  
 خاک سے رنگے بوکا یہ طوفان وقت کی دستکار یاں، تو بہ!

دو یا کے متوجہ ہیں دریا کی خودی پنہاں

گو ہر کے تجھل میں قطرے کی خودی پنہاں

ہر چند خودی سے ہوا ارضی کو سدا دی ہو

بہر دم و دا بخت میں ان کی ہے خودی پنہاں

نکاوشق کے اعجاز کا نہ ہو منکر خیم مشعور کا جامِ جہاں نما ہے یہی  
 تزیں سے اس کی نہ ہو بیقرار دلنے والا جہاں میں شور ہو جس کا وہ ارتقا ہے یہی  
 خیالِ محض کجا، اور کجا عملِ ناداں سرب ہو نہیں سکتا، علاجِ تشنہ بس  
 وہ ایک صیبرِ دلوں جو فلک کی نظروں میں عزیز جس کو نہیں، شیوہ جفا طلبی  
 ہر کام کو احساس سے نسبت ہے اضافی

اور شدتِ احساس ہی کا نام ہے مشکل

جس شخص کا احساس نہیں عزم کے بس میں

تاکس ہے وہ، اُس کے لیے ہر کام ہے مشکل

پرتو بہرہاں کا ہے حسن ایک تصویرِ جاوداں ہو حسن  
 بستی کا ثنات ہو اس سے رونی بزمِ امن و جاں ہو حسن

سند کوہ معاصر

ہو اگر جستجو، تو عام ہے حسن      سامنے دل کے صبح و شام ہو حسن  
 بواہوس کی، امیں بلا جانے      اک حقیقت ہے جس کا نام ہو حسن

لا الہ الا اللہ

حرم نازخداوند ناز کی سو گند      نگاہ پاک دل پاکباز کی سو گند  
 قسم ہے حسن کے انداز بے نیازی کی      جبین عشق سراپا نیاز کی سو گند  
 قسم ہے غزلوی بت شکن کے بازو کی      کعبہ دلف ورازا باز کی سو گند  
 قسم ہے ہر دمہ و انجم و رخشاں کی      کرشمہ فلک شیشہ باز کی سو گند  
 قسم ہے عکس رُخ ہر ماہ طلعت کی      کمال صنعت آئینہ ساز کی سو گند  
 قسم ہو مطرب بہتی کے ذوق نغمہ کی      اور اس کے دروہرے تار سا کی سو گند

ہی ہو جس کو مے لا الہ الا اللہ  
 وہ رنبر میکدہ مفضوب ہو نہیں سکتا



## نجیب اشرف ندوی (سید)

ان کا وطن دہلی تھا، جو بہار شریف (بہار) سے سات میل مشرق کی طرف ایک بستی ہے۔ سید نجیب اشرف اور سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) بکبری تھے۔ دونوں کے پردادا میر غفلت علی تھے۔ میر غفلت علی نے اپنی زندگی میں دہلی کی بڑی بلگم سے حکیم میر محمدی ہوئے؛ اور چھوٹی سے ہاشم خیر حکیم محمدی کے بیٹے حکیم ابوالحسن تھے، جو والد تھے سید سلیمان ندوی مرحوم کا اور ہاشم شیر کے بیٹے ڈاکٹر محمد مبین تھے۔ یہی نجیب اشرف ندوی کے والد مرحوم تھے۔

ڈاکٹر محمد مبین سرکاری ملازمت میں تھے اور اسی سلسلے میں ان کا بیشتر زمانہ سی پی (مدھیہ پردیش) میں گزرا۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں ملازمت سے بیکدوش ہو کر پنشن پائی اور اس کے بعد راجپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ان کا ۲۸ جولائی ۱۹۳۲ء کو انتقال ہوا۔

سید نجیب اشرف ۶ جون ۱۹۰۱ء کو آرموری (ضلع چاندہ۔ مدھیہ پردیش)

میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر والد سے پائی۔ اس کے بعد سرکاری اسکول میں بھیجے گئے۔ ایک تقریب میں شمولیت کے لیے ڈاکٹر محمد حسین خاندان سمیت اپنے دلایہ گئے تھے کہ وہاں سید سلیمان ندوی سے ملاقات ہوئی، جو اس زمانے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے کہا کہ آپ سید نجیب اشرف کو تعلیم کے لیے دارالعلوم بھیج دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ قبول کر لیا۔ چنانچہ نجیب اشرف ۱۱۰۶ء میں جب کہ ان کی عمر بمثل آٹھ برس کی تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کا شمار ہو رہا تھا، جس کے نتیجے میں بالآخر مولانا شبلی ۱۹۱۳ء میں یہاں کی سکریٹری سے دستبردار ہوئے تھے۔ سید سلیمان بھی اس سے قبل ہی مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور مہذبہ دار اخبار اہلال کے ادارہ تحریر میں شمولیت کی غرض سے کلکتے جا چکے تھے۔ ایسے میں نجیب اشرف بھی ندوہ چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہیں پٹنہ میں انھوں نے دسویں درجے اور انٹر کے امتحان پاس کیے (۱۹۱۶ء) وہ بی اے کے درجوں میں زیر تعلیم تھے، جب ملک میں ترک موالات کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہ بھی کالج چھوڑ، قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس میں انھیں متعدد سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نے رحلت کی۔ اس کے بعد سید سلیمان ندوی مرحوم نے اعظم گرام میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے سید نجیب اشرف کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں رہنے سے انھیں تصنیف و تالیف سے رغبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسی زمانے میں انھوں نے جہانگاہ ندوی کی بعض انگریزی

کتابوں کا ترجمہ کیا 'سوراج' اور 'رہنمائے صحت' اور ترک موالات دوسرے ممالک میں، جب سیاسی تحریک میں غفلت پیدا ہو گیا، تو انھوں نے دوبارہ اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ ان کے چھوٹے بھائی 'سید علی اشرف' اس زمانے میں کلکتے میں تھے۔ ان کی تحریک پر یہ وہاں چلے گئے۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی اور ۱۹۲۶ء میں ایم اے کی سند حاصل کی؛ دونوں امتحانوں میں درجہ اول پایا۔

تعلیم ختم کر لینے کے بعد وہ مستقلاً دارالمصنفین کے رفیق بن گئے؛ یہاں انھیں سو روپے ماہانہ کی قلیل رقم بطور وظیفہ ملتی تھی۔ اسی زمانے میں دارالمصنفین نے رقعات عالمگیر کی ترتیب و تدوین ان کے سپرد کی تھی۔ یہ کام انھوں نے مؤرخ شہیر سرحد و ناتھ سرکار کی نگرانی اور رہنمائی میں کیا تھا۔ اس سلسلے میں مقدمہ رقعات عالمگیر اور رقعات عالمگیر (جلد اول) شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے یہ مفید کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ میں نے دوسری جلد کے مسودات مرحوم کے پاس دیکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں جوں کا توں شائع کر دینا چاہیے۔ ورنہ یہ بھی ضائع ہو جائیگے۔ زمانہ قیامِ عظم ٹیڑھ میں وہ سعادت کی ترغیب میں بھی سید سلیمان مرحوم کا ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔

۱۹۲۰ء میں وہ گجرات کالج، احمد آباد میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ اگلے ہی برس ۱۹۳۱ء میں حکومتِ بہمنی نے اسماعیل یوسف کالج قائم کیا۔ اس پر سید خیر گجرات کالج کی ملازمت ترک کر کے بہمنی آ گئے اور اس نئے کالج میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اسی ادارے میں رہے اور یہیں سے ۱۹۵۵ء میں انپشن پر سبکدوش ہوئے۔

انھوں نے بہمنی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ مضامینات کے علاوہ انڈین

میں اپنا مکان تعمیر کر لیا تھا۔ وہ کھیتی کی تعلیم، ثقافتی، سماجی زندگی کا جزو لاینفک تھے اور سب حلقوں میں، غریبی صاحب کے علم سے معروف تھے۔ جب وہ ۱۹۵۵ء میں سرکاری ملازمت سے الگ ہوئے تو انہیں اسلام نے انہیں اپنے نئے ادارے اردو دلیسچ انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا۔ یہاں وہ اپنی وفات تک رہے۔ ادارے کا تھا ہی رسالہ نواسے ادب بھی انہیں ملتی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

ان کی آخری شائع شدہ کتاب لغات گہری، تھقی، انھوں نے تصنیفی کام زیادہ نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ تھی۔ وہ حکومت کی اور مختلف تعلیمی اداروں کی اتنی کمیشنوں اور بورڈوں کے رکن اور میمبر تھے کہ لکھنے پڑھنے کے لیے ان کے پاس کوئی وقت بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح ان کی علمی صلاحیتیں گویا پوری طرح بروئے کار نہ آسکیں۔ اس سے ہمارے بعض دوست کراہی علم کو سبق لینا چاہیے، جو اپنا وقت غیر علمی کاموں میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔

جمعرات ۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو دوپہر کے وقت سہبی اسپتال میں حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن شب میں تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور رات کو قبرستان میں اپنی مرحومہ بیگم کے برابر دفن کیے گئے۔

میرے ان سے بیس برس کے تعلقات تھے۔ ان کے سے بلند اخلاق، وضع دار، بامروت، میر چشم دوست اب کہاں ملینگے ! اِنَّمَا لِلّٰہُ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ

## محمد مقتدی خان شروانی

پڑھے کچھ حضرات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کی اردو مطبوعات پر ایک زمانے سے یہ چھپا ہوا پڑھتے آئے ہونگے : بابٹام محمد مقتدی خان شروانی - انسوس ان مولوی حاجی محمد مقتدی خان شروانی کا ۲ دسمبر ۱۹۶۶ء کو علی گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اس مطبع کے اور بعد کو اپنے ذاتی مطبع شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ کے ذریعے سے اردو کی طویل خدمت کی۔ وہ خود بھی مصنف اور مؤلف تھے۔ اگرچہ انھیں اس سے کوئی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ ہم ان کے حالات قلمبند کر کے جہاں ایک خط ان کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں، وہیں

نام نیک رنگاں ضائع کن

کے مصداق سمجھتے ہیں کہ ان کی خوبیاں اس قابل ہیں کہ ہمارے قویان ان کے نقشِ خدا پر چلنے کی کوشش کریں۔

ہندستان کے مشہور شروانی ٹیٹھان خاندان کی ایک شاخ بلوڑ (ضلع علی گڑھ) میں مقیم ہے۔ ان کے مودث علیٰ یوسف خان ساکن راجپوت تھے۔ اس خاندان کے اکثر

افراد بلوڑ سے نقل مکان کر کے دوسری جگہوں میں جا کر بس گئے۔ یوسف خان کی سائیں پشت میں رشید خان (ابن ایل خان) تھے، یہ بلوڑ ہی میں رہے۔ خدانے ان کی اولاد میں بہت برکت دی۔ وحید قاتل سمج بلوڑ کا خاندان شروانی انھیں کے خلاف پشتل ہے۔ انھیں رشید خان کی چوتھی پشت میں محمد ستیاب اللہ خان تھے۔ انھیں باپ کے جو کچھ ترکے میں ملا انھوں نے اس پر اپنی سلیطہ مندی سے اضافہ کیا اور نیل سادی کی کوٹھی بھی قائم کی۔ ان نواح میں ان کے معاملات ملو و تسد کی شہرت تھی۔ اردو میں شعر بھی کہتے اور اپنے نام کی مناسبت سے مقبول تخلص کرتے تھے۔ داغ سے اصلاح لیتے تھے۔ پیام یاد کی پرانی جلد میں ان کا کلام ملتا ہے۔ کچھ شری مضمون بھی ریاض الاخبار میں شائع ہوئے تھے۔ لیکن یہاں سے بھی دیکھی تھی، کانگریس کے رکن تھے۔ ان کی دو دینی کا ایک بیعت یہ ہے کہ آج سے ستر برس پہلے ۱۸۹۷ء میں انھوں نے ایک سند و سندت کو لازم رکھ کر اپنی چھوٹی بیٹی (ابنہ یعنی) کو مندی پڑھائی۔ ۱۹۱۷ء میں وصال کی۔

انھیں محمد ستیاب اللہ خان کے اکلوتے بیٹے محمد مقتدی خان شروانی مرحوم تھے۔ محمد مقتدی خان شروانی ریح الاول ۱۲۹۷ھ (فروری / مارچ ۱۸۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔ محمد مقتدی خان ان کا تارکبی نام ہے جس سے (۱۲۹۷) برآمد ہوتے ہیں ان کا کسی عربی کی تعلیم نئی طور پر ہوئی۔ باقاعدہ انگریزی تعلیم ڈھولہ (خلع علی گڑھ) کے اسکول سے شروع ہو کر ۱۸۹۹ء میں ایم اے اور اسکول اعلیٰ گڑھ تک پائی یہاں ایک قابل ذکرات یہ ہے کہ پشت اندر میں مراد آبادی علی گڑھ اسکول میں ان کے جم جماعت تھے۔ وہ ان سے عربی اور یونانی سے سنسکرت پڑھتے تھے۔ میرے خیال میں انھیں عربی آئی، انھیں سنسکرت۔

شروانی صاحب کو ذہانتانی جاداد کی دیکھ بھال سے کوئی دلچسپی تھی، ان کی زندگی اور ادبی کارناموں سے وہ شروع سے اخبار دینی کے دیکھتے، اسی سے مضمون نویسی کا جینا پڑا۔ یہی شوق انھیں لاہور لے گیا اور وہ ۱۹۰۳ء میں جب ان کی عمر مشکل ۲۲-۲۳ برس کی تھی، منشی محبوب عالم کے

دو نامہ پر اخبار کے ادارہ تحریر سے منسلک ہو گئے۔ اس اخبار کے علاوہ لاہور کے کئی دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی ان کے مضمون چھپتے رہے۔ اس سے نہ صرف لکھنے کی مشق حاصل ہوئی، بلکہ انھیں اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوا اور بہت جلد ان کی صلاحیتوں کا رجحان اور مستقبل کا پروگرام بھی طے ہو گیا۔

۱۹۰۹ء کے آخری مہینوں میں وہ لاہور سے علی گڑھ واپس آ گئے۔ یہ وہاں مالک (ف) جنوری ۱۹۱۱ء کی سبکدوشی کا زمانہ تھا۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی (ف) جولائی ۱۹۱۲ء نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گوٹ سے بھرتی لے لی تھی۔ اس پر محمد مقتدی خان قائم مقام ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۱۱ء میں وہ مشہور خبر رساں انجمنی ایسوسی ایشن پریس کی ملازمت اختیار کر کے اس کے مقامی نامہ نگار بن گئے۔ اس عہدے پر وہ چودہ برس کی طویل مدت (یعنی ۱۹۲۵ء تک) رہے۔

۱۹۱۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اب اس کا پریس (جہاں گزٹ پھنستا تھا) مسلم یونیورسٹی پر منتقل کیا گیا محمد مقتدی خان شروانی اس کے مترشح ہوئے۔ اب تک اس میں صرف نوہے کے چھاپے کا انتظام تھا؛ شروانی صاحب نے اس میں پتھر کے چھاپے کا اضافہ کیا۔

۱۹۱۲ء میں نواب حماد الملک حسید حسین بگڑی (ف) جون ۱۹۲۶ء نے کلیات امیر خسرو کی ترتیب تمدن اور شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی؛ اس سلسلے کی سرپرستی حضور نظام دکن میر جٹان علی خاں (ف) فروری ۱۹۱۷ء نے قبول فرمائی تھی۔ اس مجموعے کی مختلف کتابیں ترتیب دینے والوں کے لیے مقتدی صاحب علم میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ غزنوی کی پہلی مثنوی مطلع اللہ کی تصحیح محمد مقتدی خان شروانی ہی نے کی تھی۔ انیسویں صدی کا یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچا اور صرف آٹھ جلدیں چھپ سکیں۔ اگر یہ منصوبہ پورا ہو جاتا تو علم و ادب کی بہترین خدمت ہوئی۔

و اما تو فیضان اللہ بالحدیث العظیم

یہاں غالباً ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔

یہ کتابیں بہت اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ بہترین کتاب 'چکنا قیمتی کاغذ اور چھپائی مسلم یونیورسٹی پریس کی جس کے کرنا دھرتا شروانی صاحب خود تھے۔ سارا کام خود ان کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اونیورسٹی آف شاہین دہلوی ہاؤس نے بھی یہ مجموعہ دیکھا، 'آتش' کے اٹھا۔ نواب حماد الملک مرحوم قدردانِ علم و فن تھے۔ یہ منصوبہ بننا ہی ان کی تجویز پر تھا اور ان کی سفارش پر نظام دکن نے اس کی سرپرستی منظور فرمائی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں کتابیں چھپ کر آئیں تو انہوں نے حضور نظام کی طرف سے شروانی صاحب کو نظام، عماد و خضر تہذیب دلایا۔

طاعت میں ہدایت کے باعث انہیں تین اور تہذیبیں بھی ملے تھے: اول، سلیمان اشرف، امین تہذیب (۱۹۲۹ء) پر دھیر مولانا سلیمان اشرف نے اپنی کتاب 'الہین کی بحسن و خوبی طبع ہو گیا۔ دوم، سرد جنگ کا نام تہذیب (۱۹۳۳ء) نواب سرد الملک بہادر شاہ نواب محبوب علی خان نظام دکن نے اپنی سوانح عمری کا نام 'سردی' بھی تھی۔ یہ کتاب شروانی صاحب کی نگرانی میں بڑی آب و تاب سے چھپی۔ اس پر مصنف کے صاحبزادے نواب ذوالقدر جنگ نے یہ تہذیب دیا۔ سوم، مرزا، سلیمان، بشری تہذیب (۱۹۳۸ء) مولانا غلام حسین جریا کوٹی (ف جنوری ۱۹۰۳ء) اپنے عہد کے مجاہد عالم تھے۔ سرچیک بھی ان سے گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے ۲۰ سال کی تحقیق اور تجسس کے بعد ایک کتاب 'بشری تصنیف کی برس میں تواریخ اور عہد نامہ قدیم سے صداقت رسول صلعم و اسلام ثابت کی گئی تھی۔ سر شاہ محمد سلیمان کی جوانی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ دلی خواہش تھی کہ کتاب چھپ جائے چونکہ اس میں عبرانی کے بہت سے اقتباسات تھے، اس لیے کتاب کا منہستان میں چھپنا بہت دشوار تھا، لیکن شروانی صاحب نے یہ ہم سر کر لی اور کتاب طبع کر دی۔ اس پر نواب مرزا، سلیمان نے یہ تہذیب دیا تھا۔



دسمبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ ایم اے او کالج کی بنیاد سالہ جوبلی ہوئی۔ اس موقع پر اردو کانفرنس اسلام پریس کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھیں۔ پہلی کے صدر نواب صدیق یار جنگ، مرحوم خان انگشت، ۱۹۵۰ء مولوی بشیر الدین دہلوی، شیخ آزاد (۲۱ جون ۱۹۵۱ء) ان دونوں کانفرنسوں کی استقبالیہ مجلسوں کے صدر محمد مقتدی خان شروانی تھے۔

۱۹۳۶ء میں کسی وجہ سے یونیورسٹی نے اپنا پریس فروخت کر دیا۔ شروانی صاحب کو اس کام کا جو تجربہ تھا اب اس سے مستفید ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ کوئی اور مطبع قائم کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے شروانی پرنٹنگ پریس کے نام سے اپنا ذاتی مطبع جاری کر دیا۔ جو بہ ستودار کی نگرانی میں اعلیٰ معیار کی کتبیں چھاپتا رہا۔

مرحوم کو اردو مضمون نویس اور تصنیف و تالیف کا ہر کام تھا۔ مجید زود نویس تھے اور نظم و نثر دونوں پر یکساں قادر تھے شعر بھی کہتے اور اپنے نام (مقتدی) کی دعا بھی کہیں گے، ہر مخلص کرتے تھے۔ مزاج کے تلون کے باعث کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کب مرحوم سے قدح پراگندہ ہوئے۔ اس لیے یہ واقع ہے کہ سب ان سے خائف رہتے تھے۔

میری ان سے ملاقات نواب صدیق یار جنگ مرحوم کی واسطے سے ہوئی۔ وہ مجھ سے بہت لطف سے پیش آتے تھے۔ علی گڑھ جانا ہوتا تو حتی الامکان سلام کو ضرور حاضر ہوتا ایک دن باتوں باتوں میں انہیں معلوم کیسے مشہور صوفی شاعر صاحب لمعات و عشاق نامہ حضرت محمد زین الدین عراقی ہمدانی (د ۱۲۸۹ھ) کا ذکر چل پڑا۔ ان کی ایک غزل بہت مشہور ہو چکی تھی۔

نخستین بادہ کا ندر حبا م گردند

در چشم مست ساقی دام گردند

میں نے کسی مناسبت سے یہ شعر پڑھا تو ظاہراً قافیے کی وجہ سے ان کا ذہن میرے نام کی طرف منتقل ہو گیا، اس پر خود اشعر کیا،

ہے وصحت کہ اندر حجام کر دند  
ز مالک رام، گویم، و ام کر دند

چھوٹی موتی کوئی درجن بھر کتا جی ان سے یاد کرا رہی۔ مضامین کی بھی خاصی تعداد مختلف رسالوں میں منظرِ چڑی ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی کی قرعہ جنگ آصفیہ کے دوسرے ایڈیشن کی ترتیب و تدوین میں بھی وہ مصنف کے دستِ راست تھے، جس کا اعتراف مولوی سید احمد نے کیا ہے۔

شبِ جمعہ ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو بعد ۸۸ سال (قری ۱۹ سال) اعلیٰ گڑھ میں انتقال کیا، اور وہیں قبرستانِ شاہ جمال میں سپردِ خاک ہوئے۔

## حکیم احمد شجاع

لاہور کے مشہور وکیلوں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ لاہور کا بازارِ حکیماں اسی خاندان سے منسوب ہو۔ احمد شجاع ۱۸۹۸ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اپنی ملازمت کے بیشتر زمانے میں پنجاب قانون ساداسلی کے سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ قلم و نشر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ لاہور کے اہلِ رسالے "ہزار داستان" کے ایڈیٹر رہے، افسانے لکھے، فلم تک سے تعلق رہا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ساتھ تخلص تھا۔

کسی زمانے میں قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ خدا مظلوم، یہ مکمل ہوئی یا نہیں اس سے متعلق ایک لطیفہ ہے!

کسی نے علامہ اقبال مرحوم کو بتایا کہ حکیم احمد شجاع تفسیر قرآن لکھ رہے ہیں تو فرمایا: ہم آج تک حضرت حسین کو سب سے بڑا مظلوم مانتے آئے ہیں، لیکن اب یہ واسع تبدیل کرنا پڑے گی! آج قرآن سے زیادہ مظلوم ہو کہ ہر کدھر اس کی تفسیر لکھنے

لگا ہے ۔

۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو اپنے ذاتی مکان (فیروز پور روڈ، لاہور) میں انتقال کیا؛ اور وہیں پُج بھجی کے قریب اپنی خاندانی ہڑواڑ میں دفن ہوئے ۔

## ڈاکٹر ذاکر حسین

یوپی کے ضلع فرخ آباد میں ٹھانوں کی ایک بہت قائم گنج ہے، اور اس کے مضائقہ میں ایک مختصر گاؤں تنورہ نام کا ہے۔ اب تو ان لوگوں میں ماشاء اللہ کبھی کبھار کوئی پڑھا لکھا آدمی نظر آجاتا ہے، لیکن یہ ذکر پچھلی صدی کے آخری ربع کا ہے۔ اس زمانے میں یہاں کے باشندوں کا دل بہت مشغول باہمی مار پیٹ اور مقدمہ بازی تھا۔ یہاں کا ہر ایک سوت دعویدار تھا کہ، سو پست سے ہے پیشہ، آبا پہ گری

اس لیے پڑھا لکھنا ان حضرات کے نزدیک کوئی ذریعہ عزت نہیں تھا، جس کے لیے جان جو کھم میں ڈالی جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہاں کے ایک نوجوان فدا حسین خان صاحب نے نیزے کی جگہ قلم ہاتھ میں لیا اور مقامی انگریجوں اور نیکلرڈز کو مل میں داخلے کے کرار و فارسی پڑھنے لگے، تو ان کے ہم وطنوں نے انھیں بدعتی اور آبائی روایات سے باغی قرار دیا۔

فدا حسین خان صاحب حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں تجارت

کر سینگے، لیکن حیدر آباد پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا، اور اس کی جگہ کالٹ کی تعلیم حاصل کرنے لگے، اور پھر اسے بطور پیشہ اختیار کر لیا

Hyderabad

لیکن اس سے بھی بڑا اور اہمتر کام حیدر آباد لارپورٹر Law Reporter کی تدوین و ترتیب اور اشاعت کا تھا۔ اس کی مانگ موجود تھی، چنانچہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس میں انھیں بہت کامیابی ہوئی۔ فروری ۱۸۹۷ء میں خدا نے فدائ حسین خان صاحب کو تیسرا بیٹا دیا تو انھوں نے اس کا نام حسین خان رکھا۔ یہی ہمارے ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں، جنھیں ان کے بے تکلف دوست اور چاہنے والے محبت سے ”ڈاکر صاحب“ کہتے تھے۔ ڈاکر صاحب کا بچپن حیدر آباد میں گزرا، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اچھی کم عمری کا زمانہ تھا کہ حضرت پیر حسن شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان پر صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ چونکہ اس کا باؤ واسطہ طور پر ڈاکر صاحب کی تعلیم و تربیت اور عام زندگی پر بھی اثر پڑا۔ اس لیے اس کا بیان سود مند ہو گا۔

پیر حسن شاہ صاحب کے مرشد، حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادی تھے۔ پیر حسن کو اوائل عمر میں مندوؤں سے سخت کد تھی۔ یہی نہیں کہ وہ انھیں اچھا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کے برخلاف بر ملا برا بھلا تک سب کچھ بڑ جانے میں بھی انھیں دریغ نہیں تھا۔ حضرت شاہ طالب حسین کو بھی اس کا علم ہوا۔ چونکہ ان کا یہ رویہ تصوف کی اصلاح اور دوا دہی کی تعلیم کے خلاف تھا، انھوں نے مرید کی اصلاح

سے ایک مرتبہ میں نے مرحوم سے دریافت کیا کہ صحیح تاریخ ولادت کیا ہو، تو فرمایا کہ سالی یقیناً ۱۸۹۷ء ہے، جیسا غالباً فروری کا ہوتا ہے اور ان کا تعین اب ممکن نہیں، کیوں کہ سب خانہ والی کا غذا دت اور یادداشتیں ضائع ہو گئیں۔

کا ایک انوکھا علاج تجویز کیا۔ فرمایا کہ سر پر سند و ڈن کی سی چوٹی رکھو اور پیشانی پر ششہ لگاؤ اور اسی سج و سج سے پاپادہ پشادہ لٹکاؤ۔ دورانِ سفر میں اگر کوئی سبندوں کا یرتھ استھان آئے تو اس کی بھی زیارت کر لو۔ جاؤ اور پھر اسی طرح سے واپس آؤ۔ اس سے مقصود یہ تعلیم دینا تھی کہ کسی نے چوٹی رکھ لی، تو کیا! اور کسی نے ڈاڑھی بڑھائی، تو کیا! ان طواغیر سے کسی کے ایمان اور اخلاق اور ارتقاء سے متعلق حکم نہیں لگایا جاسکتا؛ اصلی چیز باطن کی صفائی اور پاکیزگی ہے۔

حکیم مطلق نے جو بیہوشی نالادمنی کا حکم دیا ہے، اس سے دوسرے افراد کے علاوہ یہ تعلیم بھی منظور تھی کہ اس طرح انسان کو رنگا رنگ تجربے حاصل ہونگے اور اس کا دل اور نظر وسیع ہو جائیگے۔ ہمارے حکیم شاعر نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

حد سے دل اگر اندر دہ ہے، گرم تماشا ہو

کو چشم تنگ، شاید کثرتِ نظر سے ڈھو

بارے اس سفر کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور جناب حسن شاہ قبلہ نے باقی عمر انسان دوستی اور جمیع کی تعلیم عام کرنے میں بسر کر دی، جو ہر مذہب اور ضابطہ اخلاق کی علتِ خانی ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اگر صاحب کے دادا غلام حسین خان صاحب عرف محسن خان مرحوم سے متعلق بھی بیان ہوا ہے۔ انھیں فقر اور اہل اللہ سے بہت عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنے رہنے کے لیے پختہ حوٹلی تعمیر کرنا شروع کی۔ ایک دن نہیں معلوم، کس بات پر ادھ کام کرنے والے مزدوروں سے بہت سختی سے پیش آئے اور انھیں گالیاں دیں جب ان کے مرشد تک یہ بات پہنچی، تو انھوں نے فرمایا

جہن خان! اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری اولاد اس حوالی میں خیر و عافیت سے  
برسر کرے اور پھلے بھولے، تو اس بد زبان کا کفارہ ادا کرو، اور وہ اس طرح  
سے کہ متغیر اجاگر دہاں چند سے قلاں منہ دسا دھوکے صحبت میں رہو اور ان سے  
پریم کرنے اور کرو دھڑکاؤ پانے کا گمان حاصل کرو۔ جب یہ سیکھ جاؤ، تو واپس  
آکر باقی عمارت مکمل کر لینا۔ ارادتمند جہن خان نے نقیل ارشاد میں متغیر  
کی راہ لی اور کچھ مدت اس پریم نگری میں اس سادھو کی خدمت میں رہے اور  
پھر واپس آکر ادھورا مکان پورا کیا۔

یہی رواداری کی تعلیم نو جوان ڈاکٹر حسین خان کے درشنے اور حقے میں آئی۔ حسین شاہ  
صاحب کو کتابیں جمع کرنے اور مطالعے کا بھی بہت شوق تھا، وہ جہانیاں جہاں  
گروہ تو تھے ہی، جہاں جاتے، وہاں سے کتابیں بٹور بٹور کر ساتھ لاتے۔ ان میں  
سے لامحالہ بعض انھیں مستعار لینا پڑتیں، جو وہ اس وعدے پر لاتے کہ انھیں  
واپس کر دینگے۔ چنانچہ جب وہ لدے پھندے حیدر آباد پہنچے، تو ڈاکٹر صاحب  
کو حکم ہوتا کہ ان کو نقل کر لو۔ یہ سلسلہ ان کے حیدر آباد کے قیام اور پھر اٹا دہ  
اسکول تک جاری رہا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوشخط تھے۔ یہ اسی ابتدائی زمانے  
میں ان کتابوں کے نقل کرنے کی خلق کا نتیجہ تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۰۷ء میں اٹا دہ کے اسلامیہ ہائی اسکول بھیج دیے  
گئے۔ یہاں انھوں نے دسویں درجے تک پڑھا، اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۱۳ء  
میں علی گڑھ چلے گئے۔ ایف ایس سی کا امتحان انھوں نے یہیں ایم اے اور  
کالج سے دیا۔ وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اسے بطور پیشہ اختیار کرنا چاہتے  
تھے۔ اس لیے اب بی ایس، سی کے لیے انھوں نے کرسچین کالج، لکھنؤ کا انتخاب  
کیا۔ لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ یہاں وہ سخت بیمار پڑ گئے اور انھیں



کالج چھوڑنا پڑا۔ سندھ سٹی بحال ہو جانے پر دوبارہ علی گڑھ کالج میں آ گئے، جہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ ۱۹۲۰ء میں ایم اے کے آخری سال میں تھے، جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی۔ ہمارے صفِ اول کے سیاسی رہنماؤں (مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ) نے علی گڑھ کا رخ کیا اور طلبہ کو ترغیب دی کہ وہ کالج سے ترک موالات کریں۔ بڑی رد و کد کے بعد طلبہ کی ایک معقول تعداد نے ان اکابر کے حکم پر لبیک کہی اور کالج سے نکل آئے۔

ان فوجواؤں کے سرخیل ڈاکٹر صاحب تھے۔ علی گڑھ کالج کے کرتا و عہد اس زمانے میں ڈاکٹر (سر) ضیاء الدین مرحوم تھے، جن سے بڑا انگریزوں کا اور انگریزیت کا تدریج اس الجو پر زارِ سندھستان میں بھی شاید ہی کوئی اور ہوا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی انہی صفاتِ عالیہ کے باعث ان کے سفر کی مخالف سمت کو اپنی منزل مقصود قرار دے لیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب یہ اکابر قوم علی گڑھ میں جمع ہوئے اور انہوں نے ہم سے کالج چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا تو میں عجیب کش کش میں مبتلا ہو گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسی حیرت میں تھا کہ ایک دن ڈاکٹر صاحب موصوف بلا بھیجا۔ حاضر ہوا۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ ارشاد فرمایا: دیکھو، ناخبرہ کاری میں کوئی غلط اقدام ذکر نہیں۔ یہاں کالج میں رہو گے، تو خدا چاہے، سال بھر کے اندر ہی ڈپٹی کلکٹر مل جائیگی۔ اس کے بعد زندگی بھر مزے اڑاؤ گے۔

فرمایا: ڈاکٹر صاحب کی اس بزرگداشتِ نفسیت نے مجھے اتنے دن کی الجھن سے نجات دلا دی۔ میں جو فیصلہ کرنے میں اتنی دشواری محسوس کر رہا تھا، وہ اب خود بخود رفع ہو گئی۔ ان کے دلوں سے واپس آ کر میں نے کالج چھوڑ دیا۔

یہ بھی بنیاد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء جمعہ کا دن ہمارے ملک کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا اس دن علی گڑھ کے چند نوجوان طالب علموں نے یہ فیصلہ کیا کہ آج سے ہم حکومت کے دست نگر نہیں ہونگے، آج سے ذریعہ تعلیم کوئی بدسی زبان نہیں، بلکہ ہماری مادری زبان ہوگی، آج سے تعلیم کا مقصد میکالے کے الفاظ میں حکومت کے کارندے نہیں بلکہ ملک و ملت کے مخلص محاذوم، پیدا کرنا ہوگا۔

ذاکر صاحب دو برس تک جامعہ ملیہ میں معاشیات پڑھاتے رہے، لیکن علی گڑھ چھوڑنے سے ان کی اپنی تعلیم اور محوری رہ گئی تھی۔ اس کی تکمیل کے لیے وہ بالآخر ۱۹۲۲ء میں جرمنی چلے گئے جہاں سے تین برس بعد ۱۹۲۶ء میں وہ برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ (معاشیات) کی سند لے کر واپس آئے۔

ہم میں سے بہت لوگوں نے اردو دیوان غالب کا برلن اڈیشن دیکھا ہوگا، لیکن اس کے چھپنے کی داستان شاید سب کو معلوم نہ ہو۔

جس زمانے میں ذاکر صاحب برلن میں تھے، انہی دنوں پروفیسر محمد مجیب بھی وہیں تھے۔ یہ وہاں خاص طور پر چھاپے خانے سے متعلقہ امور کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے تھے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین بھی یہیں تعلیم پا رہے تھے۔ یہ دونوں حضرات تو فیض کچھ پڑھنے سکھنے کو گئے تھے اور اس میں ٹکے رہتے، لیکن ذاکر صاحب کو علی گڑھ میں بونیکا قلندر می اور کھلنڈے پن کا پڑھنا تھا، اس سے مجبوراً بالعموم طرح طرح کے منصوبے بازی اور اسکیم بازی میں مشغول رہتے۔ یہاں برلن میں ایک چھاپہ خانہ کاویانی پریس کے نام سے قائم تھا جس کے مالک ایک ایرانی صاحب اتقی زادہ نامی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے تجویز پیش کی کہ اردو کی بعض کتابیں صحت اور صفائی سے چھاپی جائیں۔ اتقی زادہ بھی اس پر تیار ہو گئے۔ پہلا قرعہ غالب کے

اردو دیوان پر پڑا۔ اس کے مصارف کے لیے ذاکر صاحب نے ان دونوں عجیب صاحب اور عابد صاحب کی جیبیں خالی کر دالیں۔ یہ دیوان چھوٹے جیبی کتابی سا نثر پر چھپا ہے۔ اعلیٰ کاغذ، خوبصورت ٹائپ، سلی دار جلد، دو رنگی چھپائی، انیس مضبوط جلد۔ غرض ہر ایک چیز خوب سے خوبتر ہے۔ اس کے ساتھ غالب کی ایک موفک تصویر بھی ہے۔

اس اڈیشن کی دو خصوصیتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں:

پہلی یہ کہ اس کی کچھ رنگ کا بیشتر کام خود ذاکر صاحب نے کیا تھا۔ یہ اس زمانے میں ساتھ ساتھ حرف جوڑنے (کمز رنگ) کا کام بھی سیکھ رہے تھے۔ اتفاق سے ان ایام میں شہر میں یہ کام کرنے والے بھی کافی نہیں تھے۔ اس لیے تاخیر کا اندیشہ تھا۔ شاید اس طرح مصارف میں کچھ بہت بھی منظور ہو، چنانچہ انھوں نے دیوان اردو میں اس کام کا زیادہ حصہ خود کیا، کچھ حصہ عجیب صاحب کا بھی جوڑا ہوا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کے ساتھ جو تصویر شامل ہے، یہ اصلی نہیں ہے، بلکہ لائبرنگ کے رہنے والے ایک جرمن مصور کی بنائی ہوئی ہے۔ ہوا یہ کہ جب دیوان چھاپنا طے ہوا، تو تجویز ہوئی کہ اس میں غالب کی تصویر بھی ہو۔ موجودہ تصویروں میں سے کوئی انھیں پسند نہ آئی۔ اردوئے معلیٰ اور یادگار غالب میں غالب کے تجلیے اوپر لباس سے متعلق اچھی خاصی تفصیل موجود ہے۔ دیوان فارسی کے ساتھ لیتھو کی تصویر بھی چھپی ہے۔ یہ سب باتیں اس مصور کو بتائی گئیں اور انھوں نے اپنے ذہن سے

یہ تصویر بنادی۔ خدا کی شان، آج ہی تصویر سب سے زیادہ دیکھنے میں آتی ہوا برسبین تذکرہ! یہ بھی یاد رہے کہ شیخ الماک حکیم و جمل خان صاحب مرحوم اچھے خاصے شاعر بھی تھے۔ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے، شیدا مخلص تھا۔ دیوان غالب کے بعد ذاکر صاحب نے اسی چھاپے خانے سے دیوان شیدا بھی اسی اہتمام

سے شائع کیا تھا۔ اس کی کمپوزنگ سرتا سر عجیب صاحب کا کارنامہ ہے۔  
 جرمنی سے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا سب سے اہم دور شروع  
 ہوا۔ ان کی غیر حاضری ہی میں جامعہ ملیہ کی جماعتیں اور دفتر علی گڑھ سے دلی منتقل  
 ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اب شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) مقرر ہوئے جو ش  
 قسمتی سے انہیں ساتھ کام کرنے والے ایسے کارکن مل گئے جنہیں ان پر  
 کامل اعتماد تھا اور جو خود بھی پورے اعتماد کے قابل تھے۔ ان میں پروفیسر محمد  
 مجیب (موجودہ شیخ الجامعہ) ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا اسلم بی راج پوری،  
 مولانا خواجہ عبدالحی، سعید انصاری، حافظ فیاض احمد، حامد علی خاں، وغیرہ  
 خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جامعہ ملیہ کی مالی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ حکیم اہل خانہ مرحوم کا  
 بہت بڑا سہارا تھا۔ وہ خود بھی بہت کچھ دیتے رہتے تھے اور ان کے ذریعے سے  
 فتوح بھی ملتی رہتی تھیں۔

جب دسمبر ۱۹۲۷ء میں وہ الٹہ کو پیار سے ہو گئے تو اب جامعہ ملیہ کا بار ڈاکٹر انصا  
 مرحوم کے کندھوں پر آ پڑا۔ یہ بڑا سختی کا دور تھا۔ آمدنی کم، بلکہ معفو دار قرض  
 کی مصیبت اس پر سزاوار۔ اگناہ (ٹریسٹوں) کی کثرت نے یہ واسے دی کہ چونکہ  
 جامعہ کو چلانے کے لیے ضروری مالی انتظام نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بند کر دی  
 جائے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک خصوصیت جو مردِ زمانہ سے ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی،  
 ان کا خطرے میں ہمہ ہر اک کو دھڑنے کا انداز تھا۔ کوئی نازک مرحلہ ہو یا مشکل  
 مقام ہو، مصیبت کا احتمال ہی نہیں۔ یقین ہو۔ اس سے ان کے اندک ہٹنا  
 جویوں، قصوف اور تعظیم کی چادر مٹانے سو یاد تھا، جاگ اٹھتا۔ یہ ان کے لیے

چیلنج کا حکم رکھتا، اور یہ بات ان کی شانِ مردانگی کے منافی تھی کہ وہ یہ بیڑا اٹھانے سے انکار کر دیں۔ اب بھی یہی ہوا۔ جب ٹرینوں نے جامعہ کے بند کر دینے کا فیصلہ کیا، تو ڈاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ سب نے کہا،

ہم جامعہ کو بند نہیں ہونے دیں گے، اور جیسے بھی بن پڑا، اسے چلائیں گے۔ گیارہ سالہ اور کارکنوں نے عہد کیا کہ ہم بیس برس تک ڈیرہ سو روپے سے زیادہ مشاہرہ طلب نہیں کریں گے۔ لیکن ان بے چاروں کو یہ ڈیرہ سو بھی کب دیا گیا۔ بلکہ بعض اوقات ہمنیوں کسی کو ایک حقہ تک نہیں ملا۔

فرض اس کے بعد ان لوگوں کو کلیئہ اپنے ذریعہ بازو پر کھینچ کر باڑا۔ ملک کے درو مند اور صاحبِ احساس طبقے نے جب بھی اور جو کچھ بھی ان کی بھونی میں ڈال دیا، انھوں نے اسے صبر و شکر سے قبول کیا۔ ان غریبوں نے یہ ایام کس تنگی ترشی سے گزارے، اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیجیے۔ ۱۹۴۳ء یا شاید ۱۹۴۴ء میں نظام حیدر آباد کی حکومت نے جامعہ ملیہ کو پانچ لاکھ کا گرانقدر شاہانہ عطیہ دیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی راوی ہیں کہ جب ڈاکر صاحب سے ملاقات ہوئی، تو میں نے اس کا میانی پر انھیں مبارک باد دی۔ خوش ہو کر کہا، رشید صاحب، آج گیارہ برس میں پہلی مرتبہ جامعہ کے اٹاف کو پوری تحوّل دے سکا ہوں۔

ڈاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جس تندرستی اور یکسوئی، صبر و استقلال، اشیاء اور خودداری سے یہ فرض بنایا، اس کی شاہد ساری دنیا ہے۔ خدا نے بھی ان قربانیوں کو نواز دیا اور شرف قبولیت بخشا۔ ملک آزاد ہو گیا اور آج جامعہ ملیہ اسلامیہ ملک کی تعلیمی جدوجہد میں ہر چلو سے صفِ اول میں ہے۔

آخستہ ایم ہر سر خار سے بخون دل

قانونِ انبیا فی صومرا نوشتہ ایم

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا۔ لیکن چونکہ آزادی اور ملک کی تقسیم تو ام آئیں۔ اس لیے بد توں ملک میں انتشار اور بد امنی کا دورہ دورہ رہا۔ خاص طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور اس کی مستی تک معرضِ خطر میں آگئی۔ حکومتِ وقت نے دیکھا کہ اگر اس وقت کوئی تجربہ کار اور مہتر شخصیت یونیورسٹی کا نظم و نسق ہاتھ میں نہیں لیتی، تو یہ سرنید کا لنگا یا ہوا پودا صحرِ حواد کا شکار ہو جائیگا۔ آخر لنگا کا انتخاب ڈاکر صاحب پر آن ٹھہری۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم وزیرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے بڑا بھیجا اور ان سے کہا کہ یونیورسٹی کو بچانے کی ایک ہی صورت ہو کہ آپ وائس چانسلر بن کر وہاں چلے جائیں۔ یہ عذر کرنے لگے۔ اپنی گونا گون مصروفیتوں اور جاموہ قلیہ کی ذمہ داریوں کا بھی ذکر کیا۔ اس پر مرحوم نے نفسیاتی ہتھیار استعمال کیا۔ کہنے لگے: اچھا اگر آپ نہیں جانا چاہتے، تو میں مجبوراً فلاں صاحب کو بھیجنے بیٹھ لگا۔ یہ صاحب مرفوع القلم ہو چکے تھے۔ ایسے چیلنج پر ڈاکر صاحب بھلا کیونکر حرج دے جاتے ان کے نام کا استہسا کہ انھوں نے فوراً پیشکش قبول کر لی اور علی گڑھ چلے گئے۔

یہ نومبر ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ جہاں یہ ۱۹۵۷ء تک رہے۔ ان آٹھ برس میں انھوں نے یونیورسٹی کی ساکھ پھر سے قائم کر دی، جو آزادی سے پہلے کے دو تین برس میں ملیا میٹ ہو گئی تھی۔ وہ پودا جو بادِ سموم کے بھونچکوں سے مرجھا یا جارا ہاتھا، ڈاکر صاحب کی آبیاری اور زنگارانی کے صدفے پھر سے ہلہا اٹھا اور اس میں نئے سرے سے پھل پھول آنے لگے۔

۱۹۵۷ء میں وہ بہار کے گورنر مقرر ہوئے؛ اور جب چار برس بعد اپنی ذمہ داری سے سبکدش ہوئے تو ۱۳ مئی ۱۹۶۲ء کو جمہوریہ ہند کے نائب صدر بنادیے گئے۔ ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی سمدارت جمہوریہ ہند کی میعاد ختم ہوئی۔ نیا انتخاب ہوا، تو قوم نے ملک کے اس سب سے بڑے عہدے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو منتخب کیا۔ یہ انتخاب چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ انہوں نے قوم ان کی خدمات سے اس پوری مدت کے لیے بہرہ مند ہو سکی!

۳ مئی ۱۹۶۹ء صبح گیارہ بجے ان پر دل کا دورہ پڑا اور چند منٹ کے اندر جان بحق ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ اپنی محبوبہ جاسمہ علیہ کے درمیان ایک خاص احاطے میں سپرد خاک کیے گئے۔  
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت

ڈاکٹر صاحب کو اپنی قیامی اور انتظامی ذمہ داریوں نے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت نہیں دی۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف معاشیات کے موضوع پر تھی۔ انہوں نے تعلیم سے متعلق بھی اپنے تجربات اور خیالات قلمبند کیے ہیں۔ کسی زمانے میں انھوں نے "دقیقہ ریاضہ" کے نام سے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ اس وقت تک ان کی مندرجہ ذیل چیزیں شائع ہو چکی ہیں:

- ۱۔ مبادی معاشیات (ایڈون کینن کی کتاب کا ترجمہ ۱۹۶۲ء)
- ۲۔ ریاست (افلاطون کی کتاب Republic کا ترجمہ ۱۹۳۵ء)

رنگرثانی کے بعد دوبارہ ۱۹۶۷ء

- ۳۔ معاشیات، مقصد و منہاج (۱۹۳۲ء)

- ۴۔ معاشیات قومی List کی کتاب National Economy کا ترجمہ

۵۔ ذکر سین (محرم کی تقریر)

۶۔ عالی، حب وطن (یوم عالی کی تقریر)

۷۔ تعلیمی خطبات

۸۔ جامعہ کیا ہے؟

۹۔ شکشا (سندی)

۱۰۔ Educational Reconstruction in India

۱۱۔ The Dynamic University

(۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے مختلف یونیورسٹیوں کے خطبات صدارت ۱۹۶۵ء)

۱۲۔ ہندستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم (پیش خطبات کا اردو ترجمہ) ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۹۶۲ء)

۱۳۔ دیانت (ڈراما)

۱۴۔ ابو خان کی بکری (بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ)

۱۵۔ Die Botschaft des Mahatma Gandhi

(۱۹۲۳ء جرمن)

۱۶۔ خوش گوش اور گھوٹا (۱۹۷۱ء)

تقریریں ذکر صاحب کا نظریہ یہ تھا کہ تصنیف بول چال کی زبان میں ہونا چاہیے یہی وجہ ہے کہ خیالات کی گہرائی، زبان و بیان کی سلاست اور سادگی، لب و لہجے کی صداقت اور خلوص ان کی ہر تقریر کا خزانہ امتیاز ہے۔ اگر آپ کو ان کی کسی تقریر میں مشکل الفاظ یا فارسی کی نقیصہ تکبیسیں ملیں تو یقین کیجیے کہ یہ انہوں نے بہت سی جلدی میں لکھی ہے اور اس پر انہیں نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔ ہر پڑھے لکھے آدمی کی طرح کبھی کبھی تعظیفاً شعر بھی کہہ دیتے تھے، دُشمن بننے:

مانا جو ہم در دہی ہے جز و زندگی  
پر کیف زندگی نہ ہی، زندگی تو ہے

لشہ اس کے ذکر سے نفرت نہ کیجیے  
ذاکر شکستہ حال ہی، آدمی تو ہے



## شاد، نریش کمار

اردو کا یہ جوان مرگ شاعر ۱۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کو مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں یحییٰ پور لاڑکھانڈہ (ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوا۔ ان کے والد نوہر یار رام دتھ تلمیذ جوش ملیانی بھی اپنے زمانے میں پنجاب کے ادبی حلقوں میں خاصے معروف تھے۔ شاد نے شاعری گویا درشے میں پائی۔ لیکن دوسری بلا شراب نوشی بھی اسی کے ساتھ آئی۔ دتھ بلا نوش تھے اور اسی نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ گھر باد کی خبر نہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال۔ شاد نے جوں توں کر کے دسویں درجے تک کی تعلیم تو مکمل کر لی، لیکن کچھ تو غیر اچالی کے باعث اور کچھ اپنے لالچابی پن سے اسے جاری نہ رکھ سکے اور کم عمری ہی میں انھیں ملازمت اور تماشہ روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا۔ چنانچہ راولپنڈی، جالندھر، لاہور میں مختلف اداروں میں کام کرتے رہے۔

تعلیم ملک کے بعد زبوں حالی میں اور اضافہ ہوا۔ وہ بے سروسامانی میں حیاں بچا کرتے آئے۔ بعض دوستوں کی مدد سے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت ملی،

لیکن میں اتنا ہی کہ جان و تن کا رشتہ برقرار رہ سکے۔

اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ شاعری میں وہ بہتے نہیں تھے، خیالات میں بے پناہی، بیان میں تشنگی، زبان میں چستی اور ان سب پر مستزاد ہلکا سا تیکھا پن اور طنز۔ لیکن امنوس کو شراب نوشی نے ان کی جملہ صلاحیتوں کو برباد کر دیا۔ وہ کئی مرتبہ موت کے دروازے سے لوٹ کر آئے۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کو ایک ان کے والد مرد صاحب لاپتا ہو گئے، خدا معلوم، انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نے ایک لیا، گھر سے بھلے چلے نکلے، اور واپس نہ آئے۔ شاید ان کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا، لیکن بیسود، ان کا سراغ ملنا تھا نہ ملا۔ شاید نے غم غلط کرنے کو شراب میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ یوں گھریلو زندگی سطح سے تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ آخری شام ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء وہ گھر آئے، توہاں کا ہوش معمول سے زیادہ ناقابل برداشت پایا۔ ان کی سکونت دریا سے جہاں کے کنارے کی بستی تیار رور میں تھی۔ دس گیارہ بجے شب گھر سے نکلے اور مات بھر غائب ہوئے۔ اگلی صبح ان کی تلاش دریا سے ملی۔

انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔

(۱) نظمیں: جنگلہ، فراہ، دستک، ہلکار، آہٹیں، تاشیں، آیات جنوں، پھوار، سنگم، میرا منتخب کلام، میرا کلام نو، نو، آتش، حافظ کا ترجمہ و جدان۔

(۲) نثریں: ڈارلنگ، رکھ تلے، سرخ حاشیے، سرقہ اور توار، مطالعے، جان پہچان، خواب اور اس کی شاعری، اندازِ غالب، رُشخ، مجاوراتِ خواب، آوازِ غالب، پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری، پانچ مقبول طنز و مزاح نگار، شامِ نگوں سینا آیا، جینے لیل، سندری شہزادی۔ آخری تینوں کتابیں پچھلے

کے لیے ہیں

شاد نے بہت کم عری میں شعر کہنا شروع کیا۔ شروع میں کچھ غزلیں اپنے والد ورنکو درسی کو یہ کہہ کر دکھلائیں کہ یہ میرے ایک دوست کا کلام ہے، وہ ڈرتے تھے کہ اگر والد کو معلوم ہوا کہ میں شعر کہتا ہوں، تو خفا ہونگے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا، تو انھوں نے ناراضی کی جگہ خوشی کا اظہار کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ کئی تکوید چند محروم سے مشورہ کرتے رہے۔ اس کے بعد جناب جو شس طیبانی سے اصلاح لی، اور عیتم کے بعد دلی پہنچے، تو چند غزلیں جو شس طیب آبا کو بھی دکھائیں۔ شاد کا کلام ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور اردو کے منظوم سراپے میں مقامِ بلند کا مستحق ہے۔

کچھ مختصر کلام بطور نمونہ ملاحظہ ہوا

ظلم ہو ہر صحبت کی جلوہ گاہ تو ہیں  
خدا کے فضل سے شایستہ گناہ تو ہیں  
اگر وہاب کے قابل نہیں ہیں ہم نہ ہیں

حسن ہو، یا چمکتا سا غرنے

آج آتی ہے جسم سے ایسے

زندگی کے حسین گلستاں میں

جب بچوڑا ہے خندہ گل کو

دہر میں ہم دفاتع اربوں کو

دشمنوں سے تو بچ گئے، لیکن

مری حیات کی بہتی میں بھی بلندی تھی

ایسر طائر ہیں سخت بزدل، فضول بھرتے ہیں سراپا ہیں

قفص کو بھی ساتھ لے آ رہی یہ، اگر قفس سے نجات چاہی

مرے تخیل کا حاصل ہیں، مرے تصور کی زندگی ہیں  
 دراز گیسو، حسین آنکھیں، جھل چہرہ، گداز باہیں  
 خوشی کے نغموں میں کار فرما، بشر کی بے چارگی کے فوج  
 ہر اک ہستم کی ہے میں آنسو، ہر ایک حسرت کی تہ میں  
 وہ طلب میں جو تھک کے بیٹھے مری نظر میں وہ بالوں سے  
 پناہ کی اس میں جستجو کیا، کہاں ہیں اس میں پناہ گاہیں  
 جن گلیوں میں تو نے مجھ سے کچھ جھوٹے اقراء کیے تھے

اب بھی بحال افسردہ میں ان گلیوں میں گھوم رہا ہوں  
 تیرے علم میں ہم حیات بھی ہے مجھ میں جینے کی کوئی بات بھی ہے  
 دن سے سو گز نہ تھے، دوائف نہ تھے آلام سے  
 کیا وہ دن تھے، جب گزرتی تھی بڑے آرام سے  
 صبح تک کیا جانے، کیا گدازے مریض مشق پر  
 تنہا تھا ہے چرخِ زندگی جب شام سے  
 ایک ہم ہیں یاد کرتے ہیں انہیں صبح دسا

ایک وہ ہیں، جن کو نفرت ہم مارے نام سے  
 صبح عشرت میں کہیں شام الم پہناں نہ ہو  
 دور ہے دل، فریب گر دشمن اتنا م سے  
 اندری بخودی کرتے پاس ٹھیکر تیرا ہی انتظار کیا ہے کبھی ابھی  
 دیر و حرم سے دور، دو دو قدم سے دور

لے جا رہی ہے مجھ کو تری رہگزار کہاں؟

ایک شب گزری تھی تیرے گیسوؤں کی چھاؤں میں  
 عمر بھر بیخوابیاں میرا مقدر ہو گئیں  
 آپ ہی کا یہ فیض ہے، دور نہ  
 زندگی اس قدر اداس نہ تھی  
 آپ دن کے قریب ہیں، پھر بھی  
 ہٹک دیدار کو ترستی ہے  
 بادہ و جام پر نہیں موقوف  
 تشنگی میں بھی ایک مستی ہے  
 شاد جس کو خوشی سمجھتے ہو  
 رہ بھی صباے غم کی مستی ہے  
 کٹ تو گئی ہے بھر کی رات  
 کیسے کٹی؟ یہ اور ہے بات  
 اک تھیل ہے جو محتاج بیاں رہتا ہے  
 بے وہ حسن جو بے نام و نشان رہتا ہو  
 زندگی گوش بر آواز ہوئی ہے جسے  
 بر نفس پر تری آسٹ کا گماں رہتا ہو

گاہ اہل محبت کا فیض ہے درد  
 حوی نظر کو بھی کیا علم تھا کہ تو کیا ہو؟  
 جو بن پڑے تو بھگ جا رہ محبت میں  
 سفر ہو سہل تو پھر سلف جستو کیا ہو؟  
 ہیں گاہ مستخر سے دیکھنے والو!  
 یہ حادثات جو تم پر گزر گئے جوتے!  
 یہ ناخدا جو نہ جوتے تو شاد ہو ہم ایک

بفیض موزع بلا پار اتر گئے ہوتے  
 کون سلگتے آنسو روکے، آگ کے لٹوئے کون چبائے  
 لے ہم کو کبھانے دے! کوئی تجھے کیوں کر سمجھائے  
 برکھا برے، نئے گونجیں، شیشے سے شیشہ ٹکرانے  
 کون اس دقت انجام کی سوچے، کون خود کے پھر میں لے

جہن کے اندھیار سے تھوڑے، جس نے تیرا ساتھ دیا تھا  
 دیکھ کہیں وہ کول آقا، آنسو بن کر ٹوٹ نہ جائے

اس دنیا کے رہنے والے، اپنا اپنا غم کھاتے ہیں  
 کون پر اپا رنگ خریدے، کون پرایا دکھ اپنے اپنے !  
 ہے، مری مایوس امیدیں، واسے مرے ناکام ارادے  
 مرنے کی تدبیر نہ سوچیں، جینے کے انداز نہ آئے  
 اس دنیا کے غم خانے میں، غم سے اتنی فرصت کب ہو !  
 کون ستاروں کا منہ چومے، کون جہادوں میں لہرے !  
 ضبط بھی کب تک ہو سکتا ہے، صبر کی بھی اک حد ہوتی ہو !  
 بے بھر چین نہ پانے والا کب تک اپنا دوگ چھپائے !  
 شاد و ہی آوارہ شاعر، جس نے تجھ سے پیار کیا تھا  
 نگر نگر میں گھوم رہا ہے، اربابوں کی لاش اٹھائے !  
 کہاں کہاں نہیں موجود میرے نقش قدم !  
 کہاں کہاں نہیں ٹوٹا مرا دل حساس !  
 کہاں کہاں نہیں تڑپتی نگاہ دردناک !  
 کہاں کہاں نہیں جھلکے، یہ دیدہ رُخ غم !  
 کہیں بھی نہ ملے گی میرے رخ سے گرد و پاں  
 کہیں بھی مل نہ سکا کوئی حبادہ منزل  
 کہیں بھی رک نہ سکا میں مسافر غم دل  
 یہی ہوا میری ساری مسافت کا آل  
 گیا جہاں بھی، پلٹ کر میں سوگوار آیا  
 کسی جگہ بھی تو تسکین جستجو نہ ہوئی  
 کہیں بھی تو نہ ملا، تجھ سے گفتگو نہ ہوئی

پکارنے کو تجھے ہر طرف پکار آیا

جواب میں وہی آواز باز گشت آئی

کہاں ہوئی مری فریاد کی پذیرائی!

ہر تنہا پہ بے حسی ہوتی ہر سرت بکھی بجھی ہوتی

موت ہوتی اگر نہ دنیا میں زندگی موت میں محئی ہوتی

زندگی کی ستم خیزی کو واقعہ ہے کہ کم سمجھتے ہیں

وہ بھی روٹھی ہوئی سرت اس جس کو ہم لوگ غم سمجھتے ہیں

تاہم ہے ہر پیمانہ تجلی ہے ماہ میں تیری نگاہ جب سے ہو میری نگاہ میں

دل میں ہو شوق دید کا عالم تو دیدنی گو دیکھنے کی تاب نہیں ہو نگاہ میں

اسے شاد رہروں کے رویے کو دیکھ کر آنا پڑا ہے راہزوں کا پناہ میں

کچھ میکشی کو اس نے بھی رسوا کیا، مگر کچھ میکشی بھی شاد کو بدنام کر گئی

یادوں نیک نام کے اطوار دیکھ کر محسوس یہ ہوا تجھے ہر بار دیکھ کر

کچھ تلخی شراب نے مجھ کو کیا ہلاک کچھ تلخی شعور کا آرا ہو اہوں میں

آج تک وہ نظر نہیں بھولی تم نے دیکھا تھا ایک بار مجھے

یہ چاندنی، یہ گھن خامشی، یہ تنہائی دل شکستہ کی ہر چوٹ پھر ابھر آئی

مہربانی میں تغافل کی اداسے توہیں کچھ نہ کچھ آپ کا دل ہم سے خفا ہو توہیں

موسم دلکش، ساقی مگر دھن، صحن گلستاں، باد گداز رنگیں

اس ماحول میں رہ کر بھی میں شاد بہت مغموم رہا ہوں

زندگی سوز سے عبارت ہو یہ کھسی ساز کی نقیب جہیں

محسوس قدر بد نصیب انساں ہیں کوئی غم بھی سمجھیں نصیب نہیں

پھیلے تو ہم تضاد تک پہنچ گئے	مٹے تو بن گئے کسی ہوش کے نقوش پا
ہم پھر بھی تیری رہگذر تک پہنچ گئے	گو ہر قدم پہ دیرواحم کے تھے پیچ و خم
ہر وارہ وارہ شوق مری واردات ہو	دل نے بنا دیا ہے محبت کا دل گھبے
منروگی میں بھی کم دل کشی نہیں ہوتی	فسردہ دیکھ کے تم کو خیال آتا ہے
غم جہاں میں کبھی دل کشی نہیں ہوتی	غم حبیب کا جب تک نہ حسن شامل ہو
دوستوں نے بھی کیا کسی کی ہے	دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
آپ کی بات آپ ہی کی ہے	آپ سے یوں تو ادب بھی ہوں گے
عشق نے دل میں روشنی کی ہے	عقل سے صرف ذہن روشن تھا
تراپنی ہی تصویر ہم دیکھتے ہیں	کسی رخ پر جب گود غم دیکھتے ہیں
ہیں جانتے ہیں اوجہ ہم دیکھتے ہیں	کسی کی نگاہوں کی بیگانگی میں
یہی غم تو ہے زندگی کا ہر سانس	کوئی کیا غم زندگی کی شکایت
پھول کی گود میں مشرا رہا ہے	شاید یہ سر نہ غم نہیں دل میں
آج تھے ہم گلے لگاتے ہیں	آ غم زندگی! اداس نہ ہو
آینے سے بھی روشناس نہ تھی	مجھ سے ملنے سے بیشتر وہ نظر
کوئی قفس کے لیے کوئی اینٹیاں بک لیے	سکوں کسی کو نہیں مجھ کو مضرب ہی ملا



## ناطق گلاؤ ٹھوی، سید ابوالحسن

کہا جاتا ہے کہ نواب مرزا خان داغ کے ہزاروں شاگرد تھے جن کے نام ایک  
 دستار میں تاریخ تلمذ کی ترتیب سے درج تھے۔ اس بیان کی صحت سے متعلق کچھ کہنا  
 مشکل ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ جب داغ کا ۱۰۵۰ء میں انتقال ہوا ہے  
 تو ان کے بلا واسطہ سینکڑوں شاگرد ان کا سلسلہ ہی نہ کہنے کو موجود تھے۔ ۶۵ برس  
 بڑا مبارک زمانہ ہے، اُستاد آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ اب کئی برس سے صرف دو  
 حضرات رہ گئے تھے، جوش ملیح آبادی اور ناطق گلاؤ ٹھوی۔ گزشتہ مئی میں ناطق  
 بھی اللہ کو پیار سے ہو گئے۔ اب صرف ایک حضرت جوش کی ذات اپنے استاد کی  
 یادگار رہ گئی ہے۔ خدا ان کا حامی و ناصر رہے!

سید ابوالحسن ناطق گلاؤ ٹھوی ۱۱ رجب ۱۲۸۸ء کو کامٹی میں پیدا ہوئے، جو ناگپور  
 کے قریب اچھا خاصا بڑا قصبہ ہے۔ ان کے بزرگ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ حیدر  
 آئے تھے۔ ان کے دادا سید غلام غوث وکالت پیشہ تھے اور اسی سلسلے میں مدتوں  
 میرٹھ میں مقیم رہے۔ پھر خاندان نے گلاؤ ٹھوی (ضلع میرٹھ) میں سکونت اختیار کر لی

یہاں ان کی کافی بڑی جاداد اور زمینداری تھی۔ ناطق کے والد سید ظہور الدین نے تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ وہ وسیع پیمانے پر کرمی کا کاروبار کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں وہ کامٹی میں سکونت پذیر تھے، چنانچہ ناطق یہیں پیدا ہوئے۔ سید ظہور الدین کا ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔

ناطق کی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر شروع ہوئی۔ قدرتا فارسی عربی پر خاص توجہ رہی، اور انھوں نے اس کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی۔ آخری دورہ حدیث، شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے پڑھا۔ وہیں طلبہ گجرات کے بابر خرد حکیم احمد حسن دغوف حکیم بدن اسے حاصل کی۔ بعد کے زمانے میں وہ ذمرہ کے کام کاج کے لائق انگریزی سے بھی اپنے طور پر واقفیت حاصل کر لی تھی۔ بلکہ ان کے کلام میں بعض انگریزی شعرا مثلاً سفیسی، لائیگ فیلو وغیرہ کی قطعوں کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔

سید مشوق حسین اطہر، پوٹری، ناطق کے خالہ زاد بھائی تھے۔ انھیں کی تربیت پر انھوں نے کسی کے زمانے میں شاعری شروع کی، لیکن ان سے مشورہ نہیں کیا۔ اس کے لیے انھوں نے بیان ویزہ والی مرحومہ... ۱۹۰۶ء کا انتخاب کیا، جو اساتذہ وقت میں بھی درجہ خاص کے حامل تھے۔ لیکن چند ہی ماہ بعد بیان فوت ہو گئے۔ اسی زمانے میں امیر خانی بھی چل بسے۔ اتفاق کی بات کہ کہیں سے داغ کے دو دیوانے نکلے اور آفتاب داغ — ان کے ہاتھ لگ گئے۔ انھیں دیکھا، تو یہ داغ کے ایسے گردیدہ ہوئے کہ تھوٹے دن بعد خط و کتابت کے ذریعے ان کا تہذیب اختیار کر لیا۔ بعض اصحاب نے انھیں جلال مکتوی کا شاگرد بھی کہا، جو یہ دوست نہیں، وہ شاگرد داغ ہی کے تھے، یاد چار غزلوں کی حتمک بیان نروانی کے بھی کچھ لیجیے۔ بالآخر انھوں نے مشق اور غور و فکر سے خود درجہ استاد حاصل

کر لیا تھا چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں ان کے شاگرد زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔  
تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے ملک کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ یہ گویا ان کا ورثہ  
تھا۔ ان کے ایک چچا سید عنایت اللہ کو ۱۹۰۷ء کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں  
انگریزوں نے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ ناطق مرحوم کا نگاہیں اور خلافت کی تحریکوں  
میں ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۰ء کے بڑے چٹھہ کو شریک ہیں۔ چون کہ گھر کے کھاتے پتے تھے، اس  
پے معاش کی طرف سے کوئی تشویش نہیں تھی۔ وہ مسلسل ۳ سال تک انٹور نیوٹن  
کیٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مرکزی اسمبلی کے بھی رکن منتخب ہوئے تھے۔ لیکن  
رودربود مالی حالت کمزور ہوتی گئی، اور قواعد کے اصولوں کے ساتھ وہ سیاسی  
سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکے، اور بالآخر خاندان نشین ہو گئے۔

ان کا کلام میراج (درد لول)، اندر پسہ اخبار (ہور)، میں ملتا ہے۔ اپنے زمانے کے دوسرے  
مختلف رسائل و جرائد میں بھی ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔ ان کی غزلیات کلاویہ ان آج تک  
شائع نہیں ہوئی۔ چند نظموں کا مجموعہ "ناطق" کے عنوان سے علامہ "جلوہ یار"  
دمیر ہنر کے شمارہ مارچ ۱۹۱۳ء کے ساتھ بطور ضمیر چھپا تھا۔ چند سال ہوئے، ایک  
حولی مکتوب جس میں نئی معلومات ہیں (کیل میں غلیل) اور تنقیدی موضوعات سے  
متعلق چند خطوط اور مضامین "سب سے سب" کے نام سے شائع ہوئے تھے (لاہور  
۱۹۰۰ء) غالب کے دیوان کی شرح کنز المطالب اگرچہ ۱۹۲۶ء میں بھی تھی، لیکن شائع  
ابھی پانچ سال (دیکھو فردوسی ۱۹۲۰ء میں) ہوئی۔ جس شخص نے ستر سال مشق سخن کی بڑی  
اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے کلام کی مقدار کتنی ہوگی۔ دیوان کے علاوہ کچھ اور  
تصنیفات بھی غیر مطبوعہ رہ گئیں، جن کے مسودے ان کے بعض شاگردوں کے  
پاس ہیں۔

مرحوم بہت کم امینز تھے، بلکہ بہت حد تک زودورخ اور اظہار رائے میں جفاک بھی۔

اسی لیے ان کے احباب کا حلقہ وسیع نہ ہو سکا۔ انوس کو ان کا آخری زمانہ بہت محنت اور کس پہر سی کی حالت میں گنا۔ اولاد میں چھٹے ہوئے۔ تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ لیکن وہ سب داغ مفارقت دے گئے چاد کا تو کفن ہی میں انتقال ہو گیا، ایک لڑکا اور ایک لڑکی گھر بار دالے جو کمرے۔ ان صداتِ زمینی و جسمانی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ چھ ماہ بیتِ مرض پر پٹے پٹے تہیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے۔ اعضا بیکار ہو گئے اور حافظہ کبھی رخصت ہو گیا۔ نقل و حرکت تک سے معذور ہو چکے تھے۔ آخر وہ دن بھی آگیا، جو اٹل ہے۔ انہیں بہت دن سے شل بول کا عارضہ تھا، لیکن خدا کی شان، دسمبر گزشتہ میں اس کے بالکل صبر بول کی شکست پیدا ہو گئی۔ اسی کے علاج کے لیے انہیں اسپتال میں داخل کیا گیا۔ جب افاقہ ہو تو گھر پر آگئے، اور یہاں علاج ہوتا رہا لیکن اب کمزور و مجید ہو گئے تھے۔ ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء کی شام سے حالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور زبان بند ہو گئی۔ آدھی رات کے وقت آخری ہچکی آئی۔ وہ شب ۲۶/ ۲۷ مئی ۱۹۶۹ء زاریع الاول ۱۳۸۹ھ) کو ناگپور میں ملکِ حقیقی کے بلا سے پردہاں چاہنچے، جہاں ہم سب آگے پیچھے جانے والے ہیں۔

صبح ہوتے ہوتے اس حادثے کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی۔ سوگ میں کارپوریشن کے دفتر بند کر دیے گئے، جس کے وہ ۲۰ برس تک رکن رہے تھے۔ سرپر کو جنازہ ان کی قیامگاہ سے اٹھا اور سرشام انہیں قبرستان مومن پرہ (ناگپور) میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

ایک قلمی بیاض سے انتخاب کردہ چند اشعارِ حافظ ہوں! یہ جناب محمد عبدالعلیم، ناگپور کی مملوک ہے، جو ان کے مخلص نیا زمندوں میں سے ہیں۔  
پھولوں کا رنگ روپ پزندوں کے چہچہے کس کو خبر ہو، سب کہہ کر آئے، اکہہ کر گئے

ہم کو تو رستہ کئی کسی ٹھل کے وصل کی  
اب کے بھی دن ہمارے یو نہیں گزر گئے  
آج یہ خانے میں برکت ہی ہے  
میکشور آؤ، عبادت ہی ہے  
آپ اور جنس دل کے خریدار: جی نہیں  
پوچھا ہوں صورت اہل نظر کو میں  
تا پیش خیار نور آداسے شمع بزم عشق  
آتش گل کا، فرماے شراب لغت ہے  
جہنوائی دیکھ، آجین ہم آہنگی نہ پوچھ  
نے شغل نالہ و مطرب کا یہ لغت ہے  
مستی یزداں پرستی کے لیے، اللہ نہیں  
یاں دلو و کیف وجہ اختصار لغت ہے  
آج کل لغت یہ ہے، مطلق: مدار شاعر  
شاعری پر پہلے کہتے تھے، مدار لغت ہے  
کس کو ہر باں کہے، اکون ہر باں اپنا  
وقت کی یہ باتیں ہیں، وقت اب کہاں پنا  
لے خدا! انگلی سن لے اپنی بے نیازی  
آج حال کہتا ہے، ایک بے زبان اپنا  
حاضر دنیا میں رہ کے خوب بھر پائے  
جل گل چلیں اسے دل، کچھ نہیں یہاں پنا  
یہی اندازہ حوادث ہے، تو دن موکا اوقات

یہی دن رات اگر ہیں، تو وہ دن دور نہیں

دوسروں کو کیا کہیے، دوسری ہے دنیا ہی

ایک ایک اپنے کو، ہم نے دوسرا پایا

کم سمجھ میں آتے ہیں اب تو اس کے گل بوٹے

ہم نے نقشِ مسبق کو کچھ مٹا مٹا پایا

دکھتا ہے تلکام، غم لذت جہاں  
کیا کیجیے کہ لطف نہیں کچھ گستاہ کا

میں حاصلِ نظر ہوں قناتے دیدیں  
دیتا ہوں کام ہر مہینے سے نگاہ کا

ہنگامہ حیات سے لینا تو کچھ نہیں  
اس دیکھتے چلو، کہ تماشا ہے راہ کا

کہیں کس سے، اپنے کی بات کہتا ہی نہیں کوئی

سینس کس کی میاں جس نے کبھی، اپنی بھی تم سے

اسے جنوں! باعثِ بد حالی صحرایا کیا ہے؟

یہ مرا گھر تو نہیں تھا کہ جو دیراں ہوتا

ابھی جا رہا ہے بڑے وقت میں اپنوں کو خیال

کوئی ہوتا جو مہارِ اہلی تو پر ساں ہوتا

جو یہاں بیٹھ گیا آگے، وہ مشکل لے اٹھا

کہ قدم آج اٹھتا ہوا منزل سے اٹھا

دنچ اٹھانے ہی کی تھہری ہوا تو پھل سے اٹھا

کوئی کا رخیر ہوتا، تو گنگا کا ر ہوتا

اسے کون تول دیتا جو جگر کے پار ہوتا

جسے ذرہ کہہ رہے ہو ایسی اک شرار ہوتا

کونسی آسانیاں کہہ دوں کہ آساں ہوئیں

بے درد جو شمعیں بجھا دی تھیں فرداں ہوئیں

بے سرو سامانیاں خود ساز و ساماں ہوئیں

گایاں بھڑوب کی اسرارِ عرفاں ہوئیں

کیل ہو ہستی سو ہو م، مگر ہے دلچسپ

مہسفر، جو کوئی افتاد تو پیش آنے کو

جی چرانے کی نہیں شرط، دلِ ناز بہا

یہ مقامِ حسن کب تھا کہ وفا شعار ہوتا

ترا تبرِ نیم کش، ہو مے شوق کی تراؤ

اسے باہر گلِ زکھت جو خیالِ تیرہ بنتی

قل یہاں میری معیبتِ خاطرِ مشکل پسند

جل اٹھے تیری گاہِ کرم سے سینے کے درخشاں

تھا جنوں پروردِ مرادِ حقِ آدانی مجھے

ہو گئی دیوانگیِ نیکیل اسبابِ خرد

ہماری داستان کے ساتھ رودادِ جہاں کیوں ہو

جہاں ہم ہوں، ہمیں تم ہوں، ہمیں کیوں آساں ہو

بھرہ سرِ عالم اسباب پر کس نے بتایا ہے

چمن کے چار تنگوں میں قریبِ آشتیاں کیوں ہو

اسنورہ خاطرِ دل بھڑوں کو لے مری

اٹھ گئے ہم دریاں سے، اٹھ گیا ہم سے حجاب

وہ گئے ہم اس کے ہو کر، رہ گیا پردہ، نہ ہم

دولتِ دل کیا ہے جا کر اہلِ دل سے پوچھیے  
 دل تھا اپنا بھی کچھ، جانے مگر رکھنا نہ ہم  
 رنجِ رسوائی نہیں، دنیا ہے رسوائی کا گھر  
 ہیں سبھی رسوا، قویوں سمجھو نہ تم رسوا نہ ہم  
 قائمہ کیا، رہتی دین تک انگو کوئی رہا  
 یہ تو ظاہر ہے کہ رہنے کے لیے، دنیا نہ ہم  
 کھا گئی اہلِ ہوس کی وضع، اہلِ عشق کو  
 بات کس کی رہ گئی کوئی، وعدہ تہا نہ ہم  
 ہم کہاں ہونگے دعاؤں میں اثر ہونے تک  
 کچھ نہ کچھ ہو تو رہیگا، مگر ہونے تک؟  
 خود ہو کے کچھ خدا سے سخی، مردِ خدا نہ مانگ  
 رسمِ دعا یہ ہے کہ دعا لے، دعا نہ مانگ  
 میں اپنی بے زوری کی ندامت کو کیا کہوں  
 تو اور شر مار نہ کر، اسے گدا! نہ مانگ  
 اس خاکدانِ دیہیں، اگھٹتا اگر ہے دم  
 مقدور ہو تو آگ لگا دے، ہوا نہ مانگ  
 رسمِ طلب میں کیا ہے، سمجھ کر اٹھا قدم  
 آ، تجھ کو ہم بتائیں کہ کیا مانگ، کیا نہ مانگ  
 خوگر ہو درد کا کہ یہی ہے علاجِ درد  
 یہ کس کے بس کا درد ہے، اس کی دوا نہ مانگ  
 ملتی نہیں مراد، تو مطلقاً بحیال چھوڑ  
 میری صلاح یہ ہے کہ تو روٹھ جا، نہ مانگ

## الم منظر نگری، محمد اسحق (مولانا)

قوم کے افغان تھے۔ ان کے جد اعلیٰ حسین خان پٹرانہ (ضلع منظرنگو) کے رہنے والے تھے۔ یہ دیہات ان نواح میں افغانوں کی مشہور رہتی ہے، اور یہاں کے کھنڈرات افغانوں کی گزشتہ عظمت کی داستان زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں۔ الم کے والد مولانا خان الہ دیا شاہ صاحب، سید منظر علی شاہ ایرانی سے بیعت کرنے کے بعد تارکِ دنیا ہو گئے تھے۔ جس پر ان کے نام میں لفظ "شاہ" کا اضافہ ہوا ہے۔

خان الہ دیا شاہ صاحب کے ایک پیر بھائی تھے، سید صفہ علی ایرانی، عظیم متداولہ پر ان کی نظر وسیع اور قدرتِ مسلمہ تھی۔ چنانچہ آتم جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو سید صفہ علی نے ان کی بسم اللہ کرائی۔ انہوں نے دینیات میں قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ، اور ادبِ عربی کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد عظیم نجوم کی طرف توجہ ہوئی، تو اس میں بھی دستگاہِ کامل حاصل کی۔ جب عربی فارسی پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا، تو پنجاب اور الہ آباد یونیورسٹیوں سے السنۂ شریعہ کے مختلف شعبہ امتحانوں کی دشا حاصل کیں۔ ساری عمر تدریسی میں گزاری۔ پہلے چندے ایڈمنسٹریٹر



میں رہے اور ۱۹۴۲ء میں وہاں سے مستعفی ہو کر اسلامیہ ہائی اسکول مظفر آباد میں آگئے یہاں سے ریٹائر ہوئے۔

بخوم سے متعلق ان کی معلومات کی وسعت کا اندازہ ان مضامین سے ہوتا ہے، جو ان کے قلم سے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ مومن کے بعد اردو شعراء کے حلقے میں الم سے بڑا متحکم کبھی ہوا ہوگا۔ اس کی شہادت ان کا تیار کردہ حضرت رسول کریم صلعم کا زائچہ ہے جس میں انہوں نے حیات مبارکہ سے متعلق تفصیلی احکام لگائے ہیں۔ علم بخوم سے متعلق انہوں نے ایک مفصل کتاب بھی لکھی تھی، یہ غیر مطبوعہ رہ گئی۔

وہ سیاب اکبر آبادی کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں تھے، اور خود استاد کو ان کے علم اور استعداد پر فخر تھا۔ نظم میں ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، سلسبیل، کوثر، سدرہ دہلوی، معرکہ کربلا (تاریخ دادب ۱۹۶۳ء لاہور)، گیتا منظوم، موشح الذکر، ہی پریوپی حکومت کی طرف سے ان کے لیے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ جلیلم اختر، مظفر نگری، اعلیٰ کے شاگرد ہیں، اگرچہ خود اعلیٰ کے ایما پر شروع میں انہوں نے سیاب مرحوم سے بھی اپنی چند غزلوں پر اصلاح لی تھی۔ اپنی شعر گوئی کے آغاز میں پروفیسر راجندر ناتھ شیدا نے بھی ان سے مشورہ کیا تھا۔ جب سیاب کی صحت زندگی کے آخری ایام میں بہت مستحکم ہو گئی، تو انہوں نے اپنے فو شق شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے فاسق غزلوں کا تذکرہ سے رجوع کریں، الم بھی ان اصحاب میں شامل تھے۔ انکا زمانے میں الطاف مشہدی اور احمد ندیم قاسمی نے الم سے بھی مشورہ کیا۔ گو رخصت کا بیج جملہ (منزلہ پاکستان) کے پرنسپل سید صفدر حسین صفدر نے بھی شروع میں الم سے اصلاح لی تھی۔

انہیں پراسیٹ گلیٹنڈ کی تکلیف تھی۔ اس کے لیے عملِ جراہی ہوا، لیکن ناکام رہا اور اسی سے ان کا ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء کو منظرِ نگار میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت عمر تقریباً ۷۰ سال کی تھی۔ منظرِ نگار بھی میں ان کے ذاتی مکان (فردوسِ نسل) کے شمال کی طرف کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

چند شعرِ ملاحظہ ہوں:

شورشِ ہستی کے ضامنِ احسن کے جلوے بھی تھے

عشقِ تنہا باعثِ ہنگامہٴ محفل نہ تھا

گرا ہے خاک پر مڑکا لہ سے، دیکھو وہ آنسو کو جس کا خزلِ دل میں قیام ہوتا سکا  
ازل کے دن سے بیاں کر رہا ہوں میں پیکرِ فناء، غمِ ہستی مستام ہو رہا سکا  
نوازشیں تو بہت کیں نگاہِ بساقتی نے گراہیں سے کبھی شعلِ حجام ہو رہا سکا  
الم ہمیشہ رہا مقتدیٰ پر مغسول بھی تو اہلِ حرم کا الم ہو رہا سکا  
چشمِ ذوق میں بوجہِ دیا زندگی جہانِ راز دیکھا بھی تو نے بے خبر اقصائے شمرنے کی کیا  
سینکڑوں عالمِ بے فیضِ عشق ہیں پیشِ نظر پھر بھی تیری بزمِ نگاہِ ناد میں تنہا ہوں یہ  
میں نے یکے ہیں نکاتِ فنِ الم ایسا ہے جانتے ہیں سب کہ مرزا داغ کا بلوٹا ہوں یہ  
حقیقتِ آشنائے گلستاں فصلِ بہاراں میں

ہجومِ رنگ و بو کو برقِ کاشانہ سمجھتے ہیں

کسی دن جس کے شعلے غروبِ ہستی کو پھونکنگے

ای بجلی کو ہم شمعِ طربِ فناء سمجھتے ہیں

چھپا لیتے ہیں ہرزخمِ جگر کو فصلِ گلی میں بھی

چمن میں پھولِ منشا نے غمِ پنہاں سمجھتے ہیں

کچھ ایسی بھی آواذیاں ہیں کہ جن کی قضاؤں میں پھیلا ہے دایم ایسی  
بڑے بڑے خطر ہیں وہ گوشے جن کے جو کچھ نفس کی حدوں سے ملے ہیں

کسی گلشن میں یا صحرا میں اچھا بیٹھنے کے دیوائے

پے تسکینِ وحشت آپ ہی کی انجمن کیوں ہو

مجھے احساں نہیں منظور ماس دستور گلشن کا

فروزاں آتشِ گل سے مری شاخ بھی کیوں ہو

ہر رگِ دل میں کھٹکتے ہیں اُلم اور پکیاں دور کے ساتھ نگاہِ غلط انداز بھی ہے

کس بہارِ گزشتہ کی یادگار تو ہے ہمارا باغِ قنارِ خزاں رسیدہ بھی

وہ بھی ایک جلوہ بے پردہ کی نمود اپنی نگاہ پر وہ حائل کہیں جسے

یہ ساغر میں ہر گلِ بادہ کھلام آتا ہے بہار آتی ہے یا گلشن میں دورِ جام آتا ہے

کم ہیں سالانہ طرب میرے یہ کم ہی ہیں جنگ و فتنہ نہ بھی ، نالہ و ماتم ہی ہیں

بے تو اک سلسلہ و عورت شرکاں قیامِ خونِ نشانِ رنگِ زخمِ جگمگ ہی ہیں

جو صلیہ دل کے بڑھانے کے لیے شامِ قیامِ ہفتیسیں : مذکورہ گیسوئے برہم ہی ہیں

سینے میں کھنکی رہتی ہے ، فشر کی طرح ، الفت کی خلش

یہ پچاس یوں ہی رفتہ رفتہ جو سست جگمگ ہو جاتی ہے

خوابِ عیشِ زمانہ اچھے خبر ہی نہیں جو زندگی کو سنبھالے ، وہ قوتِ غم ہے

فیضِ ساقی سے نہیں محروم ، بادہ کش کوئی

میکدے میں مل ہی جاتی ہے ، اگرچہ کم ہیں

کھینچنے کے ساقی ! جو دل سے آتی ہے وہ کچھ اور ہے

ترے شیشے میں جواب کو شردِ مزم بھی

اتھاں نگاہِ دفا میں ہے یہ کیسی خاموشی

اب حریفِ غم نہیں ہوتا کوئی ، تو ہم بھی

ازل سے ان کے رنگِ وہ کو سبھی جس کی قنار ہے

لیے ہے ایک وہ مجھ وہ، ابھی ذوقِ حبیب میرا

پھولوں کو دیکھیے رستہ روں کو دیکھیے  
ان میں کسی کے شوخ اشاروں کو دیکھیے  
چلے تو سیرِ لالہ و گل کو ہمارے  
اک دن تو اپنے سینہ نگاروں کو دیکھیے  
ہندے! یہ بارشِ مستی رنگِ دلوں  
کس کا شاہ ہے یہ بہاروں کو دیکھیے  
عشقِ بتاں کو ہر خد اچھوڑیے آلم!  
کب تک جاں میں ہر تلخا روں کو دیکھیے

## دعوتِ جوش

(۱)

فصیح حیاتِ شوق اب جلوہ طرازی نہیں  
مصلِ بسوز و ساز میں کیف و گداز نہیں  
وقت نہیں ہے ساز گارِ زمانہ دنیا کے لیے  
ختم ہے ذوقِ غزل و لہجہِ یاز نہیں  
کوئی نہیں ہے مشغلہ دوستِ جنوں کے دھڑکنے  
جیبِ خرد ہے خود ہی چاکِ لومہ ناز نہیں  
آئینہ بہار سے دل کو تسلیاں ہوں کیا!  
باو صبا کی حریفیں لالہ طرازی نہیں  
اس لیے خرم گئی ہیں اور اس نظر کی خیر نہیں  
بزمِ سکنتِ ہی میں آج، آئینہ ساز نہیں  
شدتِ درد و غم کے بعد دل کو سکون کہاں  
جوشِ نیا دکا جواب گری ناز نہیں  
نرم غلط کا ہے امیر جس کو بھی دیکھتا ہوں  
سرخ ہو یا کہ برہمن واقعہ راز نہیں

(۲)

حادثِ انقلاب ہے گردشِ چرخِ چنیری  
باقی رہی دھن کی طرزا د میں دلیری  
چھایا ہوا ہے دلیلیںِ حیدر کی صبحِ دھام  
گیت میں سازِ دلش کے گونج رہی ہے جلی  
اس کی خبر نہیں ابھی! مسلمہ خفتہ بخت کو  
حسِ عمل سے زندگی پاتی ہے اوجِ مری

عید ہے ان کی جو کہ ہر خلق و دنیا سے بھڑ  
 خلق خدا کی خدمت میں کرتے ہیں جو کدقت پر  
 جن کے کمال عجز سے دستی ہے شانِ مقصری  
 وہی تو ہیں مقلدِ رسم و روہِ پیغمبری  
 ان کی جبین ہے سجدہ ریز، عشق کی باگاہ  
 ان کی خودی کو دل گھیا، عجز و وقارِ یزداری

(۳)

اگر جگا ئیں خواب سے، جذبہ کامیاب کو  
 غفلتِ زندگی ہو، دُر جس کی تجلیات سے  
 عزمِ جواں سے، نورِ دیں باز سے انقلاب کو  
 ایسا جمالِ بخش دیں گری آفتاب کو  
 نغموں کا جوش لے اڑے، نغمہِ بحرِ باب کو  
 ضبطِ سکون کی راہیں دے جو ہر اضطراب کو  
 مطلقِ عید پر ہم سچ، لامیں اس آفتاب کو  
 جس نے صفائے اوج سے، ہر کے ظہورِ وقت  
 لفظ و بیاں میں رکھ دیا مقصدِ الکتاب کو

## انتباہ

باغیاں جب تک کہ ہے بیگانہ رازِ چمن  
 ہو نہیں سکتی کسی صورت میں دسانِ چمن  
 جس کنارے میں نہیں محفوظِ اعجازِ خودی  
 وہ حریفِ سوچِ طوفاں ہو نہیں سکتا کبھی  
 وہ جنوں شوق جو ہمراہِ سوزِ دل نہیں  
 شورِ شینِ آوازی ہے رونقِ محفل نہیں

ساز بے سوزِ وفا کے گیت کو سمجھنا کون  
 جلوئے بے فیض کی تنویر کو دیکھنا کون

تذکرہ معاصرین

دیکھ ان کی سمت بھی! اے مالکِ سر و دامن!  
جن کی جولاں گھاہ ہے قہقہے پہنائے چمن

ہر وفا دارِ گلستاں مستحقِ داد ہے  
قدرِ آزادی ہے لازم، تو اگر آزاد ہے

ہو اتھوت کا بیماری، تو ہے گر مردِ وفا  
ورنہ سن لے قادرِ مطلق کا ہے یہ فیصلہ

جس سے وابستہ نہیں انسانیت کا احترام  
خود بخود ہر جا میٹکا اک دن فنا وہ انتظام

## ناظر کاکوروی، میرزا احمد علوی

ان کے والد مرحوم امیر احمد علوی بھی مشہور اور کامیاب لکھنے والے تھے، گویا تصنیف و تالیف کا شوق اور ملک و ملت میں پایا۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری "آشفۃ سری میری" میں لکھا ہے کہ میری ولادت ناٹھال (گڑھی، کاکوروی) میں ۲۶ محرم ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) کو ہوئی۔ تعلیم علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی میں پائی۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی کتابوں اور تحریروں میں علی گڑھ کا ذکر بھی بہت ہے اور تعریف بھی؛ دراصل انھیں اپنی مادر علمی سے عشق تھا اور اسی نے ان کی علی گڑھ شہر، یہاں کے احوال اور باشندوں سے دلچسپی اور محبت کو المضاہف کر دیا۔

وہ نظم و نثر دونوں پر قادر تھے جب تک تو اور درست رہے، قلم ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جب صحت کمزور ہو گئی اور مینائی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا، تو درد سروں سے بکھواتے خود بولتے جاتے اور کوئی شخص اسے قلمبند کر دیتا۔ معلومات اور مطالعہ آسان وسیع تھا کہ وہ کسی موضوع میں بند نہیں رہتے۔ اگر مضمون علمی اور تحقیقی ہوتا، تب بھی

وہ حافظے کی مدد سے اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات نکھائیے اور کسی حوالے کی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

آخر عمر میں مذہب سے بہت شغف ہو گیا تھا۔ صوم و صلوة اور انفال کے بہت پابند ہو گئے تھے۔ نجوم و جفر میں بھی خوب دستگاہ تھی۔ اور یہ بھی انھیں اپنے والد سے وراثہ ملی۔ اکثر حکم ایسا درست ہوتا کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ لوگوں کو تعویذ بھی دیتے تھے اور ہر طرح کا مشورہ بھی۔

خوش اخلاق، خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے، دعوتیں کھلانے کے بھی شوقین۔ حال آنکہ آخری زمانے میں مالی حالات بہت ستیم ہو گئی تھی، جب بھی ان کی ضیافت کرنے کی عادت نہ گئی۔

برہنہ سے کہیں سر کا جان یو امرض لاحق ہو گیا، لیکن ان کے صبر و شکر کے قربان جائے کہ کبھی آفت تک نہیں کی اور نہ دیکھا گیا ہے کہ اس عارضے کے مریض درد سے چیخیں مارا کرتے ہیں۔

اسی میں، ۱ جولائی ۱۹۶۹ء صبح کے وقت کھنڈ میں جاں بحق ہو گئے۔ لاش کا کوری لگی اور وہیں تکجی شریف کے قبرستان میں آخری خواب گاہ نصیب ہوئی۔

فرہسوانی نے تاریخ کہی:۔  
جہانِ علم دفن مفارقت سے غم فرا ہے آج کوئی رہا ہے، کوئی ہاتھ نہ ملے آج  
بپا ہوا ہے حشر ایک رطلہ بشیر سے لہنے، کیا شراوہ مہمن دبا تھا ہے آج

(۱۳۸۹)

جسمانی یادگار چار بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ ان میں سے دو لڑکے انگلستان میں ہیں اور ایک پاکستان میں، چوتھے جناب احمد ابراہیم علوی روزنامہ قوی آواز میں ملازم ہیں۔



تینوں لڑکیاں بھی اپنے گھر بار والی اور خوش و خرم ہیں۔ ان کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں سے چند زیادہ اہم یہ ہیں :

۱) ناول : چند رکلا ؛ سنہرے حلقے ؛ ستاروں سے آگے ۔ (۲) تنقید : حالی کا نظریہ شاعری ؛ تنقیدی شعور ؛ جائزے ؛ مطالعہء حالی ؛ مطالعہء مستقبل ؛ مطالعہء ادب ۔ (۳) تذکرہ : اردو کے چند وادیب ۔ (۴) اسلامیات : ولی اللہی تحریک وغیرہ ۔

## عندلیب شادانی، وجاہت حسین

سنبھل (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے ایک صاحب اشتیاق حسین تھے۔ وہ چڑے اور جوتوں کی بڑے پہلے پر تجارت کرتے تھے۔ اصلاً صدیقی شیخ تھے۔ ان کا نکاح کوچہ قاضی، راپور کے ٹھانڈوں میں ہوا اور اپنی سسرال کے رواج کے مطابق انھوں نے بحیثیت خانہ داماد اپنی زندگی راپور میں بسر کر دی۔ یہیں ان کے ہاں جاجی (عندلیب شادانی) پیدا ہوئے۔ ان کی دسویں درجے کی سرکاری سند پر تاریخ ولادت یکم مارچ ۱۹۰۴ء ثبت ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، وہ اس سے بہت بڑے تھے۔ سرکاری ملازمت میں اس طرح کی غلط بیانیوں ہو جاتی ہیں۔ ان کا سال ولادت غالباً ۱۸۹۷ء تھا۔ مدرسہ عالیہ راپور میں تعلیم ہوئی، جہاں ان دنوں سید اولا حسین شادان بلگرامی کی بدولت حشر فیض جاری تھا۔ انھیں کے فیض کا نتیجہ تھا کہ عندلیب نے شادانی کی نسبت اختیار کی اور وہ بھی ایسی کہ جو بوعلم ہو گئی۔

مدرسہ عالیہ کی تعلیم کے دوران میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحاناتِ منشی عالم (فارسی)

اور مولوی عالم (عربی) کی اسناد حاصل کیں۔ دسویں دورے میں تھے کہ ایک ہر عنوان کے باعث مدرسے سے نکال دیے گئے۔ اب یہ لاہور چلے گئے۔ یہاں انہوں نے بی اے تک کے امتحانات پرائیوٹ حیثیت میں پاس کیے (۱۹۲۲ء) انہوں نے ملازمت بہت کم عمری میں شروع کی۔ عربی فارسی کی تعلیم تو مکمل کر ہی چکے تھے اور اس زمانے میں پنجاب میں ہر تعلیمی درجہ میں یہ زبانیں پڑھائی جاتی تھیں، اس لیے مدرسہ کی ملازمت کے حصول میں چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ پہلے ۱۹۲۱ء میں چند ماہ خالصہ ہائی اسکول، گوردوارہ (ضلع ہوشیار پور) میں رہے، اور اس کے بعد اسلامیہ اسکول، بولی چلے آئے۔ ۱۹۲۴ء میں اسی حیثیت سے ایکسپنس کانج لاہور میں ملازمت مل گئی، جہاں الیاب ریاست اور امراء کے بچوں کی تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ اسی زمانے میں ان کی نواب دو جانا (ضلع روہتاک) سے شناسائی ہو گئی اور وہ انہیں اپنے ولی عہد کا اتالیق بنا کر اپنے ہاں لے گئے۔ دو جانا کی کئی دوسریں رہے اور ۱۹۲۶ء میں وہاں سے واپس آ گئے، جہاں منہد کالج میں اور دودھا کی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔

دو جانا کے قیام کے زمانے سے متعلق ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

غالب کے احباب میں محمد تفضل اللہ خان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کے فارسی اور اردو کے مجموعوں میں ان کے نام کے خطوط شامل ہیں۔ غشی تفضل اللہ نے غالب کے دیوان فارسی کا ایک نسخہ اپنے لیے ۱۲۷۰ھ میں لکھوایا تھا۔ بعد کو یہ نسخہ کسی طرح دو جانا ریاست کے کتاب خانے میں پہنچ گیا، اور جس زمانے میں عندیہ شادانی وہاں گئے، وہیں موجود تھا۔ اپنے منصب کے باعث پورا کتابخانہ ان کے تصرف میں تھا۔ انہوں نے یہ خطی نسخہ دیکھا، تو ان کا حجب لچا گیا۔ اس کے ساتھ غالب کی ایک رنگین تصویر بھی تھی۔ بعد کو ان سے یہ تصویر پرینٹنگ ہائی کنگلے

کے فارسی کے پروفیسر محفوظ الحق مرحوم نے لے لی؛ وہ غالباً اس کا عکس تیار کر دانا چاہتے تھے۔ کرنا خدا کا کیا ہو اگر اس کے جلد بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ وصیت کر گئے تھے کہ میرا ذخیرہ کتب وغیرہ خدائے بخش اور شیل پبلک لائبریری، پٹنہ کو دے دیا جائے۔ چنانچہ ان کتابوں کے ساتھ یہ تصویر بھی پٹنہ پہنچ گئی اور آج بھی وہاں موجود ہے۔ شادانی مرحوم جب ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے، تو انھوں نے دیوان کا خطی نسخہ یونیورسٹی کتاب خانے کی نذر کر دیا۔ اس طرح گویا یہ بھی محفوظ ہو گیا۔

خیر بہ تو جلد معترض نہ تھا۔

۱۹۲۸ء میں شادانی صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ یہیں سے وہ ۱۹۳۱ء میں لندن گئے، جہاں سے انھوں نے ہندستان کے مسلمان مہم کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی۔ انھوں نے مسلمان مؤرخوں کی فارسی تصنیفات، انشاء، اسلوب وغیرہ پر بحث کی ہے، ان کی تاریخی حیثیت سے اعتنا نہیں کیا۔ گویا موضوع فارسی زبان تک محدود رہا تاہم تاریخ سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ وہ مئی ۱۹۶۹ء تک شعبہ فارسی دہلی سے متعلق رہے۔ اور اسی چہنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ اب وہ نقل مکان کر کے راپور آنے کی تیاریاں میں مصروف تھے کہ خاتون حقیقی کا بلا دا انگیا۔ ان پر دل کا دورہ پڑا جس پر اسپتال میں داخل ہو گئے۔ یہیں ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو عصر سے کچھ پہلے واہ گر اسے عالم جاودانی ہوئے۔

انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔ جو کچھ انھوں نے پیچھے چھوڑا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ کے اہل تھے۔ نظم و نشر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ایک زمانے میں وہ پریم بھاری کے فرضی نام سے افسانے بھی لکھتے رہے۔ مطبوعہ

سرایہ یہ ہے :

نظم : نفاط رفتہ (غزلیات و منظومات) (لاہور ۱۹۵۱ء)  
تحقیق : تحقیقات (۱۷ تحقیقی مضامین)

تتقید : اردو غزل گوئی اور دورِ حاضر پر مضامین پہلے سلسلہ دار ماہنامہ ساقی، دہلی  
میں چھپے تھے، اپنا ہم اقبال (خطبہ صدارت یومِ اقبال - ۱۹۵۰ء)

افسانہ : بھی کہانیاں، و نیش

ناول : چھوٹا خدا - (دو طویل افسانے، چھوٹا خدا اور بے روزگار)

دورانِ قیام لاہور انھوں نے بعض نصابی کتابوں کے ترجمے بھی تیار کیے تھے مثلاً  
انشای ابو الفضل (دفتراول)، چار مقالہ نظامی سمرقندی (مقالہ اول)، رباعیات  
بابا طاہر حریان، قصائد قافنی، نقش بدیع، جدید فارسی زبان کا لغت بھی اسی زمانے  
کی تالیف ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۸ء میں ایک روزنامہ مشرقی پاکستان، جاری کیا  
تھا چار سال بعد ماہنامہ اخبار اکالا، لیکن دونوں مالی مشکلات کا شکار ہو گئے۔  
ان کے تھوڑے سے مشرقی پاکستان میں بزمِ اردو کی ایک ایسی شیعہ فروزاں لگی ہوئی  
جس نے زندگی بھر اپنی علم کی روشنی سے دلوں کو منور کیا تھا۔

پہلے نفاط رفتہ کے چند شعر ہیں :

محمدری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں      انھیں کی یاد میری زندگی ہے

بتیغِ اربتا ہوں اور کچھ نہیں معلوم      دل میں اک تمنا ہے، یہ خیر نہیں، کیا ہو

محبت میں بھی سب کا حال ایسا تو نہیں ہوتا      کردل آتشکدہ میں جلنے، آنکھوں سے جو چرا

جب کسی سے کوئی پیمانہ وفا کرتا ہے      کانپ اٹھتا ہوں کہ میلہ ہی سا انجام نہ ہو

خونِ ترے، کوئی مرے پاس کہاں ہوتا ہو      اپنے سایے پر بھی حیرا ہی گماں ہوتا ہے

ہات اک بزم میں تھے جو رجوعِ جفا کے شکوے      دل بھر تیرا جو تری ہر دو قایداؤں کی

چاندنی، اور اداس تہائی تم ہو کس حال میں، خدا جانے !  
 تم پاس ہو، اور دل کا یہ عالم، تو بہ ! یہ حال تو جب دور تھے، جب بھی نہ ہوا تھا  
 چاندنی اسنہ، لب جو، لوگ بھی حلاط تم اگر ہمراہ ہو تیں، ہم بھی مہنتے ہوتے  
 چاندنی اسنہ، گل بے رنگ، دبو، یعنی اداس

اک ترے جانے سے، کیا بتلاؤں، کیا کیا ہو گیا

ہے، کیا گھر، یہی اس برباد الفت پر ہے

درد دل کہتا ہو، اور یار نہ ہو تقریر کا

نئی بھی دھن، صحبت کی داستاں تاکا کیوں نے، بات کا افسانہ کر دیا  
 نملے کی طرح اسے کاش، وہ بھی بیوقوف ہوتا

کہ اب اس کی دفائیں یاد آ کر خوں رُللاتی ہیں

اُدسے، دیوانگی شوق کا عالم وعدہ نہیں، اور جانبِ درد دیکھ رہا ہوں

ایک شعلہ ہے کہ سینے میں پکتا ہے دھام شاید اتنا ہی صحبت کا صلہ ہوتا ہے

بہت مختصر تھے محبت کے لمحے مگر پھر بھی ہر لمحہ اک زندگی تھا

ہواں ہیں، پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم

خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے

کہتے تھے تم سے جھوٹ کے کیونکر جییں گے ہم !

جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے، نقدِ وجود کھائے

دل آج سید گھبرا رہا ہے اسے دوسرا؟ ان کا کچھ تذکرہ کر

دل کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے جی چاہتا ہے روئے کو اکثر

دل کا یہ حال کیا ہے غم تہائی نے کٹے صحبت و سخن، تو جہں جاتا ہے

اب کچھ ایسا کلام ملاحظہ ہو، جو ان کے مطبوعہ مجموعہ نظم کے بعد لکھا ہوا ہے : یہاں

پوری پوری غزلیں اس لیے دی جا رہی ہیں، تاکہ ایک تو یہ محفوظ ہو جائیں، دوسرے اس لیے بھی کسی طرح ان کا رنگ سخن پورے طور پر سامنے آجائیگا :-

بڑھ کے جب گیسوئے شب تابکر آتے ہیں      او دھڑے مری یادوں کے ٹکڑے آتے ہیں  
دوستو! تم پر بھی گوارا ہے کبھی یہ عالم؟      نیند آتی نہیں، اور خواب نظر آتے ہیں  
کھلے آتے پھول، ستاروں کی ضیاء مری      دل دھڑکتا ہے کہ شاید وہ ادھر آتے ہیں  
چاند پھر لوٹ کے اس باغ تک آئے کہ نہ آئے      دم کیا کیا مجھے سنگا ہم سحر آتے ہیں  
پتھر تازہ کبھی ہوا کبھی تصویر بنیاد      درباری کے نصیب کتنے سحر آتے ہیں  
بہرے چھین لیا ماہ سے اپنا پر تو      کتنے دیریاں درد و یار نظر آتے ہیں  
یک بیک رات کچھ اس طرح تری یاد آئی      جیسے آوارہ وطن لوٹ کے گھر آتے ہیں  
اب بھی آجاؤ کہ آنکھوں میں ضیاء آتی ہے      اب بھی کچھ دہشت کے آثار نظر آتے ہیں  
کششِ ثقل سے بڑھ کر ہے محبت کی کشش      آسمان سے سرد و خورشید اتر آتے ہیں  
ہم ایسوں کے لیے یوں بھی قیامت جو بہا      چاندنی ہو تو یہ زخم اورا بھر آتے ہیں  
اس نے بھولا ہے مجھے میری محبت کا فرق      جا بجا خط میں تارے سے نظر آتے ہیں

خاک میں مل گیا میرا حسنِ گماں خود فری کا اب کوئی پہلو کہاں

عہد و پیمان ترے کاغذی پھول ہیں رنگ ہی رنگ سے ان میں خج جو کہاں

خواب کیوں کہہوں، میں تو بیدار تھا اورا گوج ہے یہ سب تو کون کون

اب تو آسا نہیں خود مجھے بھی یقین اس کے گیسو کہاں، میرے بازو کہاں

کون بذوق تھا جس نے تجھ پر چاند سے اس کے دئے ولا دام کو

چاند کے پاس وہ چشمِ جادو کہاں، چاند کے پاس وہ لعلِ بدجو کہاں

وہ غمزدہ جوانی کی باتیں گھٹیں، وہ محبت کی بیدار راتیں گھٹیں

وقت کا سیل سب کو بہا لے گیا، اب نگاہِ تنہا میں جادو کہاں

یہ قدر کل میری تنہائی تھی، آسمانوں سے جنت اتر آئی تھی  
 کج لیکن کے اعتبار آئی گئی، بالمشناہ ادا بیلہ راد کہاں

کا مرد پس بھی چھان مارا، مگر سحر و افسوں کا پایا نہ کوئی اثر  
 تیری آنکھوں میں ہے مومنی ہفتہ گوارہ نہ بنگال میں ادا دہ کہاں  
 اپنے دامن سے پونچھے وہ آنسو مرے بس ہیں درِ الفت کی مروج ہو  
 نقش ہر اکبہ ہے یہ نشا نگار اُس کا دامن کہاں، میرے کنو کہاں

ان میں صہبائے الفت چھپ چکی تھوئی، اُن میں مشت ہی دشت چھپ چکی  
 کیفِ الفت سے دشت کو نسبت ہی کیا تیری آنکھیں کہاں، چتر ہر اکبہ کہاں  
 شبِ غم کی تراش کہیں ایسی تو نہ تھی مری فنا کی بارش کہیں ایسی تو نہ تھی  
 دل میں کچھ تو تھیں بہت چاند کی کرنیں لیکن چاند کے قرب کی خواہش کہیں ایسی تو نہ تھی  
 جذبِ خلاص کا اعجاز ہے یا موزِ سرب مرے اندوہ کی پرش کہیں ایسی تو نہ تھی  
 ترے جلوے تو وہی ہیں مگر لے ماہِ تمام! دل میں جذبات کی شورش کہیں ایسی تو نہ تھی  
 سجدے کرتی تھی نظر چاند کو چلے بھی مگر آرزو مند پرستش کہیں ایسی تو نہ تھی  
 تو نے چلے بھی مجھے روشنیاں دی تھیں مگر دل پہ الوار کی بارش کہیں ایسی تو نہ تھی  
 نہ ٹھہر سکتی ہیں نظریں، اد پٹ سکتی ہیں شعلہٴ حسن میں تابش کہیں ایسی تو نہ تھی  
 حسنِ اندامی دگل پر مینی، قہر، قہر حشر بن جانے کی خواہش کہیں ایسی تو نہ تھی

اب جو پایا ہے ترا پاؤں کو جی ڈرتا ہے  
 سحر و شام کی گردش، کہیں ایسی تو نہ تھی

شوق کی رات ہے، ناز کی رات ہے اور تقدیر سے چاندنی رات ہے  
 نغمہ ہے چاندنی، بادہ ہے چاندنی آج طوفانِ جذبات کی رات ہے  
 غمکہ ہے پھر شبستانِ عشرت بنا چاند نکلا تو پھر چاندنی رات ہے



## ذکرہ سامری

اک پہلی ہے بوجھ تو جانیں کہ ہاں  
 خود ہی تھیں لومری زینت کی ساعتیں  
 آج تم سے ملے کون سی رات ہے؟  
 بزمِ انجم فقط رات کی رات ہے  
 جو نہ آئیگی پھر یہ وہی رات ہے  
 کیا خبر تھی کہ یہ آخری رات ہے  
 دل منہلتا نہیں، اور اگلی رات ہے  
 رات کل بھی تھی، اور آج بھی رات ہے  
 زندگی اب فقط رات ہی رات ہے  
 میری ہلکوں پر تاروں بھری رات ہے

کتنی سناں و دیران و اندوہ گیں

یہ وہی کل کی منہتی ہوئی رات ہے

اگلی سی کہاں وہ رونقِ بزمِ سخن!

حسرت میں، نہ اصغر ہیں، نہ فانی باقی

کل ہم بھی نہ ہونگے، اے عزیزِ وطن!

وہ جائیگی بس ایک کہانی باقی

## بیخود، عباس علی خان

ان کا خاندان پٹھانوں کا تھا لیکن ان لوگوں نے مدت سے لڑائی بھڑائی کا مشغلہ ترک کر کے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے والد رمضان علی خان بھی تدریسی پیشہ تھے۔ بیخود ۲۰ جولائی ۱۹۰۶ء کو قصبہ قاضی کی سراسے (ضلع فیض آباد) میں پیدا ہوئے۔ بچپن وطن ہی میں گزرا۔ سن بمشکل بارہ برس کا ہو گا کہ ۱۹۱۸ء میں بھڑانہ برس، اپنے دادا کی میت میں کلکتے چلے گئے، جو تلاش روزگار میں وہاں گئے تھے۔ ابتدائی درجوں کی تعلیم وطن میں مکمل ہو چکی تھی؛ اب بڈل کے بعد سے انھیں پوری تعلیم کلکتے میں پانی۔ دسویں درجے میں امتیاز حاصل کرنے کے نتیجے میں دو سال کے لیے اکیسریبر ذہیفہ ملا۔ ۱۹۲۰ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ سے بی اے کا امتحان پاس کیا، تو فارسی (آزاد) میں نہ صرف درجہ اول پایا، بلکہ صوبے بھر میں اول آئے۔ یہی صورت دو سال بعد ایم اے میں رہی۔

ایسے کامیاب تعلیمی دور کے بعد ملازمت کی کیا کمی تھی؛ چنانچہ فوراً ہی کلکتہ مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ چندے بعد اپنی مادر علمی اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) میں

میں چلے گئے۔ سب سے آخر میں پرنس ڈیسنی کاٹل، کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے رہے؛ زندگی کا آخری زمانہ یہیں گزرا۔

ہندسے یار باش اور مجلسی آدمی تھے، دوستوں کے درمیان جن کا حلقہ بہت وسیع تھا، خوب چمکتے تھے۔ ابتدائی زمانہ بہت عیسرا بھالی اور تنگی ترشی میں بسر ہوا تھا، اس لیے طبیعت بہت جڑ رس ہو گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کلکتہ جیسے گراں شہر میں انھوں نے اپنی سلیقہ مندی سے نوابی مکان تعمیر کر لیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میلاد میں بھی کیا تھا۔

بہت دن سے تنفس کا عارضہ تھا۔ ۶ اگست ۱۹۶۹ء صبح کے وقت اس کا شدید دورہ پڑا۔ علاج کے لیے رحمت بائی اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ لیکن وہاں بھی کوئی افادہ نہیں ہوا۔ اسی دن آدھی رات سے کچھ پہلے ساڑھے گیارہ بجے انتقال ہو گیا۔ اگلے دن (۷ اگست) سرسہر کو جنازہ اٹھا۔ قبلادوڈ کے گوبرا قبرستان میں دفن ہوئے۔ پر دیر شاہی بھی چہنیں مدفون ہیں۔ خجود کی قبر ان کے بالکل ہی قریب بلکہ عین اس کے پائین کوئی گوبھر کے فاصلے پر ہے۔ وصیت کی تھی کہ میری قبر کی رکھی جائے۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں ہی کیا گیا۔ اس سے قوی اندیشہ ہے کہ مردہ زمانہ سے اس کا نام و نشان تک مٹ جائیگا۔ لیکن یہ بھی وہم اور خام خیالی ہے۔

مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے۔ ان کے خواجہ تاش جیل منظر ہی نے ایک رباعی میں جبری تاریخ کہی ہے:

بزم احباب کی وہ زینت نہ رہا      وہ وارثِ سندِ صداقت نہ رہا  
بیرونِ بزم پہ سرگب      بخود      کہتی ہے کہ "جانشینِ وحشت نہ رہا"  
(۱۳۸۹ھ)

اگرچہ انھوں نے تفنناً چند نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن ہے یہ کہ وہ غزل کے شاعر تھے۔ ان کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں (۱) مطالعہ قدرت (کلکتہ ۱۹۶۵ء) یہ دوسری کتاب ہے جس میں

بچوں کے لیے مختلف معلوماتی مضامین ہیں (۲) جام بخودی (کلکتہ ۱۹۴۶) کلام کا مجموعہ ہے۔ بعد کا کوئی رائج صدی کا ذخیرہ غیر مطلوبہ رہ گیا۔ کچھ نثری مضامین بھی ہیں جو مختلف رسائل میں منتشر پڑے ہیں۔ مطلوبہ کلام میں غزلیات، منظومات، نعتیہ کلام اور جازعہ بچم کی مدح میں تصنیف شدہ ہے۔

کلام پر رضا علی وحشت مرحوم (دف جولائی ۱۹۵۶ء) سے اصلاح لی۔ اور انھیں سے غالب سے عقیدت بھی ورثے میں پائی؛ کلام غالب کے عاشق تھے لکھتے ہیں،

کلام حضرت وحشت پسند ہے، بخود!

کمال حضرت غالب کو مانتا ہوں میں

جس طرح وحشت سے بہت لوگوں نے فیض پایا، اسی طرح بخود کے طفیل اس شمع سے کئی اور شمعیں روشن ہوئیں لکھتے ہیں ان کے شاگردوں کا اچھا بڑا حلقہ موجود ہے خدا نے انھیں قابل اور نیک جہانی اولاد سے بھی نوازا۔ چار صاحبزادے اپنی یادگارا چھوڑے ہیں۔ انھوں نے سب کو معقول تعلیم دلوائی۔ سب سے بڑے لڑکے جناب اختر حسن خان، ایم ایس سی، سینٹ ڈیویری کالج، کلکتہ میں سائنس پڑھاتے ہیں۔

پہلے چند شعر ملاحظہ ہوں، جو جام بخودی سے بعد کا کلام ہے:

کسی سے عشق کرنا اور اس کو باخبر کرنا ہے اپنے مطلب دشوار کو دشوار تر کرنا  
 فزع کی نغمی جڑیں ان کو پتیاں دیکھ کر موت مشکل ہو گئی جیسے کاساماں دیکھ کر  
 بدل سکا زمانے کے ساتھ ہی افسوس! بدل گئی ہے نگہ اس لیے زمانے کی  
 انگ ہو اخصر سے یہ کچھ کہ میں اپنی منزل پہ حباب رہا ہوں  
 آپ کیلئے مگر خیال رہے بات پھر لوٹ کر نہیں آتی  
 کون کس کا ہے، کون سنا ہے کس سے کس کا حلقہ کرے کوئی  
 موت وہ مانگے جو لذت بخش بیدار نہیں ناخن خرم کا بدل تیشہ فرما دہیں

آیز بن کے تری بزم کی زینت تو ہوا کچھ تو کام آیا مجھے دیکھ کے حیراں ہونا  
تعب کیا، اگر مجھ کو محبت پھر حواں کرے جھلک ہے حسنِ یوسف کی زینا کی جانی  
دل آنسو کی درد بندوں سے کچھ ہلکا سا ہو جاتا ہے

اب اس سے زیادہ اور اُجالا ٹوٹے سائے کیا کرتے  
دنگ میل نہ نقشِ قدم، اندھیرا ہے تری تلاش نے گم کر دیا کہاں مجھ کا  
چمک کر دنگ پر آنا، ایک ایک پھر اجڑ جانا تمنا کی ہیں تصویریں، یہ کئے کی وہ جانے کی  
کوشش ہے عیش، تدبیر غلط، فطرت کا بدلنا ناممکن

جو تو تپ ہے، وہ ہوتا تھا، جو ہو گیا اس کو ہوتا ہے  
آخر میں چند شعراوردیکھیے، جو ان کے مطبوعہ مجوڑے جامِ بنخود ی سے ماخوذ ہیں۔  
بنخود پڑا تھا دردِ پا تو پوچھی نہ بات تھی اب حال پوچھتے ہیں طربِ الہیہ کا  
مردِ الہوس پر حیف، استم ہو گیا ردا جنسِ وفا کو آپ نے ارزاں بنا دیا  
بنخود، ہالے دل میں بھی کیا کیا خیال تھے سب کو فلک نے خواب پریشاں بنا دیا  
پریشان بے نیازی ہے، خدا معلوم ہوتا ہے

خدا معلوم، کیا ہوتا، اگر وہ بت خدا ہوتا،  
اگرچہ عہدِ وفا کا نہ اعتبار آیا بہت ہے یہ بھی کہوں کہ تو کچھ قرار آیا  
بنخود کہاں ہیں اگلی بہاریں جنوں کی جب تھا تنگ ہم سے ہیومن اور ہیومن سے ہم  
جب آئے نزلِ الفت، پتنگ نے پوچھ چکنا کا

کہ لذت ہے محبت کی، فریبِ حسن کھانے میں  
نکاتِ علم و فن سارے یہاں اودامِ باطل ہیں

نہیں کچھ قائمہ ان مسئلوں پر سرکھانے میں  
بعد سرایہ دانش، جھکا دے سر کو قدموں پر  
لصد سند اور خودداری اور سوا بن زمانے میں  
۱۳۵

جیسے زیر آسماں میرا خدا کوئی نہیں  
 جان کر بخود جو خود دشمن اپنی جان کا  
 مری خیال نے خلوت کو کرد یا محفل  
 کہ اس کو دیکھ کے سکتے ہے اہل محفل کو  
 وہ ہیراں نہیں، تو کوئی مہراں نہیں  
 ان کو منظر و نمود منائی تھی  
 ہم ان کو مہراں پا کر، کہیں کیا آرزو دل کی  
 فقط اک پاسِ خودی جستجو ہے کیا کردن بخود  
 جامِ گردش میں ہوا اور دور بھی مجھ تک پہنچے  
 بخود ہی سرحدِ اوراک و جنوں ہے، بخود  
 چمن میں برق ہے، گلہیں ہے، اور ہے صیاد  
 راضی بردشا تھا تو، لیکن جب پوچھا تھا، کچھ کہنا تھا  
 بخود یا یہ تری خاموشی میں اک شکوہ پایا جاتا ہے

شکوہ جو ردِ جفا کیونکر کرے اہلِ وفا  
 شمشیرِ ہیم کا حاصل انفعاتِ برق ہے  
 دھیر دھیر میں بتوں سے تو خدا کو مان لیا  
 ہماری سستی نمود اس کی، جو وہ ہے جو ہر آنِ عرض میں ہم  
 نہ تھے جو ہم، تو خدا کہاں تھا، نہیں جو ہم، تو خدا نہیں ہے

## ابوسعید محمد دوم علی الدین

سلسلہ نسب مشہور صحابی رسول حضرت ابوسعید خدریؓ تک پہنچا ہے۔ بزرگوں کا وطن اعظم گڑھ (دیوبند) تھا۔ یہ خاندان سلطنتِ مغلیہ سے وابستہ رہا۔ اسی سلسلے میں ان کے جدِ اعلیٰ اور گزشتہ بیٹے کا لیکر کی ہم دکن میں ان کے ساتھ چلے گئے اور پھر وہیں حیدر آباد کے ہو کر رہ گئے۔ محمد دوم کے والد غوث علی الدین تعلقہ اندول میں تحصیل کے محرر تھے اگرچہ محمد دوم کی تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن غالباً صحیح تاریخ ۴ فروری ۱۹۰۸ء (دیکھ محرم ۱۳۲۶ھ) ہے یہ مشکل سے چار سال کے ہونگے کہ والد کا عین جوانی میں عمر ۲۰-۳۰ سال انتقال ہو گیا اور ان کی کفالت اور تعلیم و تربیت ان کے چچا بشیر الدین نے اپنے ذمے لے لی۔

گھر کا ماحول ٹھیک مذہبی تھا۔ اس لیے نہ صرف تعلیم کا قرآن اور عربی سے آغاز ہوا بلکہ نماز روزے کی پابندی اور روزانہ ختمِ خواجگان اور مسجد کی جاروب کشی اس کا لازمی جزو قرار پائے۔ غالباً بعد کے زمانے میں مذہب سے لبہ اور اشتراکی خیالات سے قُرب اسی ابتدائی ماحول کا ردِ عمل تھا۔

مخدوم نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند اور اس کے بعد وہیں سٹی کانٹری میں ایک پڑھانے لگے۔ لیکن جلد ہی اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ان کی دلچسپی اشتراکی خیالات اور اسی وجہ سے ٹریڈ یونین تحریک سے تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض کانفرنسوں میں شرکت کے لیے یورپ کا سفر بھی کیا، اور چندے واپس مقرر بھی رہے۔

۱۹۵۶ء میں عام انتخابات کے موقع پر وہ اکو حرا پر ویش اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اپنی وفات تک وہ اس کے رکن رہے۔

وہ بعض جلسوں میں شرکت کے لیے آئی آئے ہوئے تھے کہ برصغیر سے ۲۳ اگست ۱۹۶۹ء صبح کو ان پر دل کا دورہ پڑا۔ فوراً اردن اسپتال بھیج دیے گئے۔ وہاں حالت کچھ بہتر رہی تھی کہ اگلے دن مرض کا دوبارہ حملہ ہوا، اب کے یہ جان بوشا بت ہوا۔ ۲۵ اگست کی شام کو ساڑھے آٹھ بجے جان بحق ہوئے۔ ۲۶ اگست کو لاش ہوائی جہاز سے حیدرآباد منتقل ہوئی جہاں اسی دن رات کو نام پٹی کے فوج میں تدفین قبرستان اور گاہ شاہ خاموش میں سپرد خاک ہوئے۔

انھوں نے کسی زمانے میں جیون کے قریبے (Cherry Orchard) کو اردو میں پھول بن کے نام سے منتقل کیا تھا اور اس کے نام و مقام تبدیل کر کے اسے بالکل حیدرآبادی نصاب کے مطابق کر لیا تھا۔

ان کی زندگی میں کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے: سرخ سویرا (۱۹۴۳ء) گلی تر (۱۹۶۱ء) اور ربابا طر قص (۱۹۶۶ء) آخری مجموعے میں مجموعہ اول (سرخ سویرا) کی تمام نظمیں شامل ہیں۔ مخدوم کا کلام اگرچہ اشتراکیت اور سیاست سے بہت متاثر ہے، لیکن ان کے غلو میں نے اس میں ایسا رنگ و روغن بھریا ہے کہ انھیں قبول عام کا درجہ حاصل ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مجموعے 'ربابا طر قص' پر مہتمیہ اکاڈمی نے ۱۹۶۹ء کا پانچ ہزار



انعام ملے! یہ ان کی بیوی کو ادا کیا گیا تھا۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو، جو سادہ رقص سے ماخوذ ہے:

حیات لے کے چلو! کائنات لے کے چلو  
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو  
بات کیا تھی، ذکر کس کا تھا کہ شکام نشا  
مکرو نے دالی آنکھیں چکیاں لینے لگیں  
جہاں بھی بیٹھے ہو جس جا بھی رات لے لی ہے

انکھیں کی آنکھوں کے تھکے، انکھیں کے پیار کی بات

یہ درد نرد و اجائے، یہ رات رات کا درد

یہی تو رہ گئی اب جاگ، بمقدار کی بات

تمام عمر چلی ہے، تمام عمر چلے

اکٹی! ختم نہ ہو یادِ عسکار کی بات

بجاء اٹھا کھیں دور کوئی شہنائی  
اٹھا ہوں خواب میں اک خوابِ شام جیسے

وہ جو چپ جاتے تھے، کعبوں میں بیٹھنا تو  
ان کو لالہ کے شہنشاہ کیا، یوں میں

فصل لگی ہوئی تھی، کیا جشن جنوں ہوتا تھا  
آج کچھ بھی نہیں جوتا ہے گلستاؤں میں

آج تو لگتی دو راں بھی بہت ہلکی ہے  
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پانوں میں

آج تو طنزِ محبت کا اثر باقی ہے  
تہقے گونجے پھرتے ہیں بیاباؤں میں

دل ہے ان کی ادا، ہجر ہے ان کا انداز  
کون سا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی محفوم!

تذکرے رستوں میں ہر چہ ہیں پرغیاؤں میں

شاعر

کچھ تو سب قزح سے زنجبٹ لی، کچھ تو، چرایا تاروں سے

بجلی سے ترپ کو مانگ دیا، کچھ کیف اڑایا بہاروں سے

پھولوں سے جھک شاخوں سے ٹپک اور مٹھوؤں سے چھٹکا  
جنگل کی کھوادی کلیوں نے دے ڈالا اپنا سرما یہ

پست جوانی سے چھپنی، کچھ بیفکری، کچھ اترارہ پس  
پھر خن جنوں پر دے دی آشفۃ سری دل کی دھڑکن  
بھری ہوئی زنجیں کرفوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں  
قطرت کے پریشاں نعروں سے اک اپنا گیت بناتا ہوں  
فردوس خیالی میں جٹیا، اک بُت کو تراشا کرتا ہوں  
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو تپھر کے دل میں بھرتا ہوں

## انتظار

رات بھر دیدہ مناک میں بہاتے رہے  
خوش تھے ہم اپنی تنہاؤں کا خواب آئیگا  
نقریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئیگا  
آگنی تھی دل مضطربیں شکیبائی سی  
پٹیاں کھڑکیں تو بھجا کہ لو، آپ آہی گئے  
شب کے جاگے تھے تاروں کو بھی نیند آنے لگی  
صبح نے سیک سے لٹختے ہوئے انگڑائی لی  
میرے محبوب! مری نیند اڑانے والے!  
کبھی جاتا کہ مرے بجدوں کا اڈا نکلتے  
میرے بجدوں کو بھی جوا آئی، تو اکیسلی آئی  
میرے بجدوں کو بھی جوا آئی، تو اکیسلی آئی  
میرے بجدوں کو بھی جوا آئی، تو اکیسلی آئی

## اقبال

اے اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گلنے لگا:  
جانبِ مشرق اُجالا سا نظر آنے لگا

موت کی پرچھائیاں جھٹنے لگیں، جھٹنے لگیں  
 فلتوں کی چادر مینے لگیں، جھٹنے لگیں  
 اک شرادہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا  
 آسمانوں کے نور سیکر فوجوانوں تک گیا  
 عالم بالا پہ باہم مشوے ہوئے گئے  
 زندگی کے نوڑ پر گھاتا ہوا پاپا گیا  
 پھر اندھیرے میں دہی آتش نوا پاپا گیا  
 کو بکو، کو بکو، کو بکو، کو بکو  
 وہ نقیب زندگی، شام و سحر گاتا گیا  
 گیت سننے کے لیے خلق خدا آنے لگی  
 گمردنوں کو جنشیں دے کر یہ فرمانے لگی  
 "نفعہ جبریل ہے، انسان کا گانا نہیں  
 صوبہ صرافیل ہے، دنیا نے بچا نہیں  
 "موت کی تبدیلی ہے، اک آسمانی لڑکے  
 ماگ کیا ہے سر سے پامک عشق کی اک لڑکے"

## آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے  
 دیر سے دور سے آئی ہے، اگر آئی ہے  
 مر رہی صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئیگا  
 رات تو نیکی، اجالوں کا پیام آئیگا

آج کی رات نہ جا

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزار بھی ہے  
 سازد آسنگ بھی، تو بخیر بھی، جھٹکار بھی ہے  
 زندگی دید بھی ہے، حسرت دیدار بھی ہے  
 تو بھی، آب حیات لب و دھار بھی ہے  
 زندگی درد بھی ہے، زندگی ولدا ر بھی ہے

آج کی رات نہ جا

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے  
 کتنی فرخندہ ہے شب، کتنی مبارک ہے سحر  
 وقف ہے میرے لیے، تیری محبت کی نظر  
 آج کی رات دھبا

## بھاگ متی

پیارے آنکھ بھر آئی ہے، کنول کھلتے ہیں  
 جب کبھی لب پہ ترا نام دفا آتا ہے

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی  
 ناگ کی، دنگ کی برسات یہیں سے نکلی  
 انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی  
 گنگائی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

دھن کی گھنگھور گھٹائیں ہیں، نہ ہُن کے بادل  
 سونے چاندی کے گلی کوچے، نہ ہیروں کے محل  
 آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں  
 نواجہ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں

شہر باقی ہے، محبت کا نشان باقی ہے  
 دلبری باقی ہے، دلدارِ جاں باقی ہے

تذکرہ معاصرین

سرفہرست نگارِ الٰہی جہاں باقی ہے  
تو نہیں ہے، تری چشمِ نگواں باقی ہے

منہرو

ہزارہ رنگ طے، اک سُبُو کی گرو مشی  
ہزارہ پیرِ بن آئے گئے زمانے میں  
مگر وہ صندل و گل کا عُبَّار، مشقِ بہار  
ہوا ہے دادِ یِ جنتِ نِشاں میں آوارہ  
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر  
وہ ششِ جہت کا اَسیر  
نکل گیا ہے بہت دُورِ مسیحو بن کر

## راذ چاند پوری، محمد صادق

۲۵ ج ۱۸۹۲ء کو چاند پور (ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ خاندان میں پیشہٴ پسہگری پشتوں سے چلا آتا تھا لیکن ۱۸۵۵ء کے بعد حالات دگرگوں ہو گئے، اور ان کے والد حافظ محمد جعفر کو کمر کھول، ملازمت کو ذریعہٴ معاش بنانا پڑا۔ راذ جب تعلیم مکمل کر چکے تو انھوں نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں جب ان کا تباہ کا پور ہوا تو یہ وہاں کے مشہور ماسٹراس زمانہ کی تربیت میں منشی دیا خان نمک (ف ۱۳۲۱) کے معاون بن گئے۔ یہ سلسلہ کم و بیش چار برس تک قائم رہا اور اس کے بعد ان کے چیلو چلے جانے کے باعث منقطع ہو گیا۔

کلام پر اصلاح سیاح ابکیر آبادی سے ل اور اس میں شک نہیں کہ خود اسادی کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ نظم کے علاوہ نثر سے بھی دلچسپی تھی، افسانے بھی لکھتے تھے۔ مبطوعہ کتابوں میں زیادہ اہم یہ ہیں:

زریں افسانے، دنیائے راز (منظومات)؛ نواسے راز (غزلیات)؛ سیاح ابکیر آبادی (سوانح)؛ داستانے چند (یادداشتیں)

غیر مطبوعہ کتابوں میں صحیفہ مراد (منظومات) اور حدیث مراد (دربا حیات) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دانشانی کے ایک ناول کا بھی ترجمہ بعنوان 'دانشا' لکھا تھا۔ یہ بھی نہیں چھپ سکا۔ بچوں کی جو انامرنگی اور خاص کر رقیقہ حیات کی دائمی مظاہرقت کے باعث ان کے آخری ایام بہت افسردگی اور دل گرگشتگی اور گوشہ نشینی میں بسر ہوئے۔ اسی عالم میں ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء کو ان کا حاکم حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

اب چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں جو ان کے مجموعہء کلام 'دائے مراد' (الہ آباد ۱۹۶۱ء) سے منتخب ہیں:

راز سے دل کے آپ خوش ہونگے آدمی ہے بڑی محبت کا  
جینے کا مزہ جب ہے اچھے سے ہو کچھ حاصل

یوں لاکھ جیسے کوئی تو جینے سے کیا ہو گا  
محبت اور پھر اُس کی محبت آہ کیا کیجیے!

تڑپ اٹھتا ہے دل جب نام مندا ہوں  
وہ مشککہ تھا غلط! خیر، مشککہ ہی سہی

مری نگاہیں تو اُس کا آستانہ تھا  
سوہرتیے ہیں پرستش کے اگر ذوق ہو کچھ  
شکلیں آساں ہوں؛ یہ آساں بھی ہے، دشوار بھی

مطلبن ہوں کیا نظام بڑم ایمان دیکھ کر  
جاننا ہوں، مگر بشرطِ ادب ہوں خطا دار جیٹا ہو کر

دکھ نظر میں حد و حسنِ عمل کامیابی کا ہے یہی اک راز  
جس طرف اٹھ گئی نگاہ شوق وقفِ سجدہ ہوئی جبینِ نیاز  
دل نہیں پہلو میں، دردِ دل نہیں آہ اب جینے کا کچھ حاصل نہیں

چہیں ملتا ہی نہیں دہریس دیوانے کو  
 ایک خانہاں خراب کی دولت کہیں ہے  
 دھاتی خیال کے قسہ بان جاٹے !  
 دردِ فراق یار کی مجبوریاں، بھبا !  
 سے سکتا ہوا تو دے مجھے دادِ ستکشی  
 لذت کشِ نظارہ ہے تیری نظر تو کیا !  
 باقی کہاں ہے نازِ نازانے میں آجکل  
 وہ دیکھنے آتی ہے دنیا مرے دیوانے کو  
 وہ دردِ دل میں ہے کہ محبت کہیں ہے  
 صورت ہے وہ نظر میں حقیقت کہیں ہے  
 امتنا تو جو نہ شوقِ قیامت کہیں ہے  
 یادہ سلوک کر کہ عداوت کہیں ہے  
 اتنی تو بخودی نو کہ حیرت کہیں ہے  
 وہ حسنِ دل نواز، محبت کہیں ہے

اک وقت میں دو باتیں، کیونکر نہ ہو دشواری

دنیا کی طلبِ کوشی، عقبی کی طلبِ گاری  
 اہلِ الفت کا جہاں میں نہیں پڑا کوئی  
 زندگی ہو گئی کیا بزمِ جہاں سے غصت !  
 نظر آتا نہیں اب سوختہ سامانِ کوئی  
 ناکامِ محبت ہوں میں اسے راز تو کیا غم !  
 یہ بات بھی ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی  
 جو دم ہے غنیمت ہے خراباتِ جہاں میں  
 حاصل نہ ہو گا کچھ بھی اخفاے راز سے  
 پابندِ نفسِ مگر دشمنِ آیام نہیں ہے  
 آئینہ حالِ دل ہے جبینِ نیاز سے  
 موقع بھی مل ہی جائیگا پھر عرضِ حال کا  
 حاصل تو کر نیازِ ذرا چشمِ ناز سے  
 ہے جستوے تبرِ حقیقت ابھی نضول  
 لے خوشنوا سے بزمِ محبت ! اٹھا رباب  
 بھرے دلوں کو آتشِ سوز و گداز سے  
 وہ نغمہ چھیڑا وجد میں آجائیں اہلِ دل  
 گوخِ لٹھے بزمِ نازِ نوا اے راز سے  
 لٹھ، ایک جام سے جہاں نواز کا !  
 ہاں، ایک جامِ میکہ ہوند ساز سے  
 اچھا دچھم لطف کا احسان ہے یہ راز !  
 سوزِ دروں بدل دیا دم بھر میناز سے  
 کیا زمانہ سہا اے معاذ اللہ !  
 قلبِ میکش ہے مخزنِ افکار



زندگی ہے، خواب وہ زندہ دل، زار و خوار ہے ہر اک مخلوق

ماذہا کس سے کہوں میں طال، برمن فیض شیخ دنیا دار

قدم آگے بڑھا، اسے مرد بیدار، دیکھتا کیا ہے

فرب و ہری دتی ہے دنیا، خود نما ہو کر

یہ برمن ہے، یہ شیخ حرم، یہ پر مغال، یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی میفروش نہیں!

## مفتی انتظام اللہ شہابی

قصبہ گوپامو (ضلع میتا پور) کے ایک علمی خاندان کے نام لیا تھے۔ ان کے مورث علی شیخ آدم بن محمد نیر حضرت شہاب الدین سہروردی ادھر سے ۸۰۰ھ میں گوپامو گئے۔ سب سے پہلے عہدِ بابری میں ان کے ایک بزرگ عہدہ افتا سے سرفراز ہوئے اور اس کے بعد ادھر کئی حضرات بھی مفتی مقرر ہوئے جس سے خاندان کے افراد کے نام میں لفظ مفتی کا جوہر و حکم کی طرح سے اضافہ ہو گیا۔

قادی عالمگیری کی ترتیب میں اس خاندان کے ایک فرد شیخ وجیہ الدین بھی شامل تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کے دادا مفتی انعام اللہ تحصیل علم کے بعد کلکتہ گئے اور وہاں مٹر کو لبروک کے بیٹے کے امایق مقرر ہو گئے۔ جب کو لبروک دلی میں ریڈیٹنٹ مقرر ہوا، تو یہ ریڈیٹنٹ میں سر مشتمل دار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اسی زمانے میں اکبر شاہ کی طرف سے انھیں خاقی کا خطاب عطا ہوا۔ غالب کے دوستوں

میں منشی غلام غوث خاں بھیر بھی تھے، یہ انھیں مفتی انعام اللہ کے ولادت تھے۔ مفتی انعام اللہ بالآخر ریاست ٹونک میں ہتھم بندوبست مقرر ہوئے تھے، وہیں سے زیادہ جو کر آگے آئے اور یہاں ۲۱ شوال ۱۳۷۲ھ کو انتقال کیا۔

مفتی انتظام اللہ صاحب تصنیف و تالیف بزرگ تھے۔ انتظام اللہ کی تعلیم سراسر فارسی اور عربی تک محدود رہی، لیکن آخری زمانے میں اپنے طور پر اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ مختلف کتابوں سے استفادہ کر سکتے تھے۔ متوسطات تک دینیات کی تکمیل کی۔ اس کے بعد نقشہ نویسی اور انجینئرنگ سیکھی، لیکن ملازمت کی بجائے تجارت میں لگ گئے، تہذیب و تمدن اور اصلاحیہ کی شرکت میں جانوروں (شیروں وغیرہ) کی خرید و فروخت کرتے رہے۔ یہ مشغلہ دس سال یعنی ۱۹۲۵ء تک رہا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق شروع سے تھا۔ اور انتظامی قابلیت بھی اچھی تھی، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں بائبل سوسائٹی کے طرز پر دائرہ معارف قرآنہ قائم کیا اور اسی کی طرف سے قرآن، حدیث، سیرت، رسول وغیرہ سے متعلق کئی چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کیے۔ ۱۹۳۵ء میں وہ یہاں دلی آگئے اور دنیا کتاب گھر (ناشرین) کے ہاں سو سو روپے مشاہرے پر ملازمت کر لی۔ یہاں سے ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں تعدد المصنفین سے بھی تعلق پیدا ہو گیا۔ اس ادارے کے لیے انھوں نے سلطان منہا اور تاج محل کے کئی حصے مرتب کیے۔ برہان (ماہنامہ) کی ترتیب میں بھی کچھ دنوں شریک رہے۔

۱۹۴۹ء میں وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں متعدد علمی و ادبی اداروں سے منسلک ہو گئے تھے۔ وہ آخر تک لکھتے رہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ”داعی اسلام“ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی، اور آخری ”قافیہ سخاں اکبر باد“ ۱۹۶۸ء میں۔ ان ۵۳ برس میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ مشاہیر اکبر باد“ میں انھوں نے اپنی ۱۲۹ کتابوں کی فہرست

## تذکرہ معاصرین

کی ہے۔ ان میں سے بعض کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ ان کے موضوعات بھی بہت متنوع ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری حالات اور حوالے وضع کرنا تھی۔ اس کے لیے وہ بے تکلف کسی کتاب کا حوالہ دے دیتے بلکہ دیکھ دیتے کہ یہ قلمی کتاب ہمارے خاندان گوپاٹو کے کتابخانے میں موجود ہے۔ حالانکہ وہ واقعہ ہی درست ہوتا، نہ اس جرم کی کوئی کتاب ہی عالم وجود میں ہوتی، اور نہ گوپاٹو میں کوئی کتاب خزانہ ہی تھا۔ لوگ ان پر اعتراض کرتے، لیکن یہ الٹا کا بندہ نہ کبھی اپنی حرکت سے پشیمان ہوا، نہ اس نے اپنی یہ افسوستانک اور گمراہ کن روش ترک کی۔ معترضوں سے کہہ دیتے، میاں، تم اعتراض کرتے رہو۔ میں اپنا کام کرتا ہوں، بعد کے لوگ درست کو لینگے؛ لیکن اس کے کسی نہ کسی طرح سے "یاد خاں" کا نام تو آجاتا ہے ورنہ کاتیکہ کلام تھا اور اس سے ان کا اشارہ اپنی طرف ہوتا تھا (خود میں ایک مرتبہ بہت پریشان ہوا۔ انہوں نے اپنی ایک تحریر میں ایک قلمی کتاب کا حوالہ دیا اور لکھ دیا کہ یہ غلطی نسخہ اراکٹ کے کتابخانے میں محفوظ ہے۔ چونکہ موضوع سے مجھے دلچسپی تھی، میں نے اپنے بعض مدراسی دوستوں سے استمداد کی۔ مہینوں کی ٹیگ وود کے بعد راز کھلا کہ سب جمل تھا۔ انالٹ ڈائنا لیب لاجون۔ پیر کے دن ۸ ستمبر ۱۹۶۱ء ساڑھے چھ بجے شام کراچی میں انتقال ہوا۔

## علی عباس حسینی (سید)

سید علی عباس حسینی ۳ فروری ۱۸۸۷ء کو ضلع غازیپور کے ایک محاکوں پارہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں بی اے کی سند لے کر انھوں نے ایل ٹی میں داخلہ لے لیا اور جب ۱۹۲۱ء میں یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو مدرسہ کا پیشہ اختیار کیا اور محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں پرائیویٹ امتحان سے ایم اے کی سند لے لی۔ ساری عمر درس و تدریس میں گزری اور تقریباً ۴۰ برس کی ملازمت کے بعد ۱۹۵۳ء میں پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے اپنی طائفہ علمی کے زمانے میں انگریزی زبان کے افسانوی ادب کا بہت وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اسی کے زیر اثر خود بھی افسانہ نویسی کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ پشمرہ کلیاں تھا جو انھوں نے ۱۹۱۷ء میں لکھا۔ لیکن ان کا سب سے پہلا مطبوعہ افسانہ جذبِ کامل ہے جو کانپور کے شہور رسالے 'زمانہ' میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'رفیقِ تنہا' شائع ہوا تو ایک پُر ہندستانی اکادمی، الہ آباد نے انعام دیا تھا۔

انھیں اپنی تصنیفات پر چار مرتبہ انعام ملا۔ ایک کو ہی خبرستانی اکادمی کی طرف سے؛ دوسرے مرتبہ پر سکالر یوجنا کمیٹی کی طرف سے اور ایک بار ایک امریکی اخبار کی طرف سے، جس نے مختلف ملکوں کے افسانوں کے مقابلے کا اعلان کیا تھا۔ اسی سلسلے میں انٹر پرڈیشی کمیٹی کے اس پانچ ہزار کے خاص انعام کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، جو ان کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں اپریل ۱۹۶۸ء میں دیا گیا تھا۔

دورانِ ملازمت میں انھوں نے درسی نصاب کے سلسلے میں بھی تیار کیے تھے۔ ایک نوکان لینگویج ریڈرس کے عنوان سے یہ تقریباً ۱۲ برس تک یوپی کے مختلف اضلاع میں رائج رہا۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں درجوں کے لیے اردو کو رس اور پھر ہائی اسکول کے لیے۔ اس وقت بھی ان کی کتاب گلستانِ شرد نظم "کشیر میں ہار سکندری درجوں میں پڑھانی جا رہی ہے۔ انھیں ترجمے پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ واللہ کا ترجمہ بہت مدت چوٹی، کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ یادگار دی بیکھر بعنوان

One World and India جو فقہر آفاق مؤرخ آرمڈ ٹائمن ٹی نے ۱۹۶۰ء میں لکھے، ان کا اردو ترجمہ بھی حسین صاحب کا کیا ہوا ہے۔ متعدد مسلمان حضرات نے کشیر کے موضوع پر ریڈیو سے اردو میں تقریریں نشر کی تھیں؛ ان کا انگریزی ترجمہ بھی ان کے قلم سے ہے۔

آخری دو تین سال بسترِ علالت پر گزروے۔ دل کے مریض تھے۔ اسی حالت میں، ستمبر ۱۹۶۹ء صبح ساڑھے آٹھ بجے اللہ کو پیارے ہوئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا اور رکھا گیا مگر جان لکھنؤ میں آخری خواہنگاہ نصیب ہوئی۔ ان کی وفات سے اردو نے ایک صاحبِ نظر مصنف کھویا، اور میں نے ایک بزرگ ہیران اور دوست۔ ان کی محبت یاد آتی ہے، مگر دل سنبھالے نہیں سنبھلا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تدانیف کی فہرست حسب ذیل ہے:-

## تذکرہ معاصرین

۱۔ افسانوں کے مجوسے : رفیق تہنائی، آئی سی ایس، کچھ منہ ہی نہیں، باسی بھول،  
میلہ گھومنی، ہمارا گاڈ، کانٹوں میں پھل، ایک عورت ہزار جلوے۔

۲۔ ناول :۱

سرشیدا احمد پاشا، شاید کہ ہمارا آئی، ندیا کنارے، حکیم بانا، ڈینگلوں کا  
بادشاہ (مضحکات)

۳۔ ڈراما :۱

نور تن (ایک اکیٹ کے ڈرامے)

ایر خسر و کی کہانی (اردو مندی)

۱۱۔ ناول کی تاریخ و تنقید۔

۵۔ مندی :

پھوپوں کی چھڑی، لگائے تباہ، کولن ٹھری۔

بہت سی چیزیں نامکمل اور غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ نامکمل میں دو ناول ہیں، اور مکمل، لیکن  
غیر مطبوعہ میں، ہماری اردو شاعری، دلچ بہت، اور تقریباً ۲۵ فلمی کہانیاں۔

## آربری، آرتھر جان (پروفیسر)

ماہرین علوم شرقیہ کے حلقے میں عموماً اور فارسی اور عربی کی دنیا میں خصوصاً پروفیسر آربری کا نام کسی تعاون کا محتاج نہیں۔ پچھلے ۳۰-۳۵ سال میں انھوں نے تصنیف و تالیف ترجمہ و تخریج کے میدان میں جو قابل تعریف اور مستقل کارنامے سرانجام دیے، ان کی بدولت انھوں نے عالمی شہرت حاصل کر لی تھی۔ انوس کو ان کا ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو کیمبرج میں انتقال ہو گیا۔

پروفیسر آربری کے والد ولیم آربری برطانوی بحریہ میں ملازم تھے۔ پروفیسر آربری ۱۲ مئی ۱۹۰۵ء کو پورٹس ماؤتھر میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم وہیں مقامی گرامر اسکول میں ہوئی، جو اس وقت قدیم (کلاسیکی) کی تدیس کے سلسلے میں خاص طور پر مشہور ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے سمپر وک کالج، کیمبرج میں داخلہ لیا۔ یہاں اپنی محنت اور قابلیت سے انھوں نے متعدد وظیفے اور تمغے حاصل کیے۔ وہ اس وقت قدیم اور اس وقت شرقیہ دونوں امتحانوں میں اول آئے، جس کے جلد میں انھیں ولیم براؤن



تقدیر اور ایڈیٹور جارج براؤن وظیفہ اور ٹائٹ وظیفہ عطا ہوئے۔ اب ہر ایک کی نظر ان پر تھی۔ مجھ پرین کے دل میں جائز طور پر توقع پیدا ہو گئی کہ عربی اور فارسی علوم کے آسمان پر ایک نئے ستارے کا طلوع ہوا ہے اور خوش قسمتی سے آربری نے انھیں مایوس نہیں کیا۔

تعلیم سے فراغت پر اولادہ چندے اپنے کالج میں جس تحقیق کے شعبے سے متعلق رہے، اولد اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیہ کے صدر مقرر ہو گئے۔ یہاں سے جب وہ ۱۹۳۴ء میں انگلستان واپس گئے، تو انڈیا آفس لائبریری میں نائب کتابدار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی، تو ان کا وزارت جنگ کے محکمہ رتنا جیٹر (سفر) میں تبادلہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ تھوڑے دن کے لیے وزارت اطلاعات سے بھی منسلک رہے۔ اگرچہ ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن اب اس کے نتیجے سے متعلق کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے ۱۹۴۴ء میں انھیں جنگی خدمات سے سکندرش کو دیا گیا۔ اس پر وہ دوبارہ تعلیمی میدان میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد موت تک تعلیم و تدریس اور تصنیف و تدوین کا شغل ان کا اور رہنا بچھونا بنا رہا۔ پہلے وہ لندن یونیورسٹی میں فارسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور دو سال بعد عربی کے۔ ۱۹۴۴ء میں وہ اپنے اصلی گھر اور علوم کی بھینچ پہنچے، عربی کے پروفیسر بن کر۔ یہ وہ کسی ہے جس پر کسی زمانے میں پروفیسر براؤن (ف ۱۹۲۵ء) مشکوک رہے تھے۔ اس لیے علمی دنیا میں اس حمد سے کی جڑی قدر و منزلت ہے۔ آربری کو ان کی جائز نشانی کا فخر حاصل ہوا اور انھوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا۔

آربری کے تصنیفی کارناموں کا جائزہ لینا آسان نہیں ہے۔ ان کی پہلی کتاب دینی ہوئی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دوران جنگ کے صرف ایک سال ۱۹۴۱ء کو چھوڑ کر

۱۹۶۸ء تک کوئی سال خالی نہیں گیا، جب ان کی کوئی نہ کوئی کتاب شائع نہ ہوئی ہو۔ بعض سالوں میں تو ۱۱ دو تین تین کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اکٹھے (۱۱) کتابیں میرے علم میں ہیں، اور ممکن ہے کہ بعض تک میری مائی نہ ہوئی ہو۔ انھوں نے انڈیا آفس، کیمبرج یونیورسٹی، چیمبرس میٹک کتابخانوں کی فارسی اور عربی کتابوں کی فہرستیں مرتب کیں، جو شائع ہو چکی ہیں۔ ان سے ان کی وصیت معلومات اور دقیقہ بینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے شائع کیے، کئی کتابوں کو حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ انھیں تصون سے بہت شغف تھا اور اسی سے انھیں قرآن کے مطالعے کا بھی خاص شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا، جو ہر لحاظ سے بلند پایہ تراجم میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اقبال کی دو کتابوں — مذہب و علم اور رموز پنجودی کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ پیام مشرق میں سے لائڈ۔ طور کا اور بانگ درا میں سے شکوہ اور حجاب شکوہ کا ترجمہ بھی کیا۔ امرات خودی پر مفصل حواشی بھی قلمبند کیے تھے۔

بسیار دگ اور زود نویس مصنفین کا تمام کام ایک معیار اور پائے کا نہیں ہوا کرتا، جلدت کی وجہ سے وہ اس کی نوک پا کر دست کر لے کے لیے وقت صرف نہیں کر سکتے، جس سے ان کی تحریروں میں طلب کے ساتھ بایں کا بھی اچھا خاصہ حصہ داخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے تعجب ہوتا ہے کہ اتنے کثیر التصانیف ہونے کے باوجود آدہ ریی نے کیس معیار کو گونے نہیں دیا۔ میری ان سے پچھلے دس بارہ برسوں سے خط و کتابت تھی، لیکن پہلی ملاقات ۱۹۶۰ء میں ہوئی، جب میں بلجیم میں مقیم تھا۔ رفتہ رفتہ تعلقات میں اتوار ی اور دوست اور قربت پیدا ہوتی گئی۔ انھوں نے میری فرمائش پر نذر عروشی اور نذر ذاکر کے لیے مضامین قلمبند کیے، جو ان کتابوں میں شامل ہیں۔ نذر ذاکر کی ترتیب کے زمانے میں ان کی تندرستی بہت خراب تھی اور اظہانے کام کاج سے سبک کر رکھا تھا۔ اس کے

## تذکرہ سحرین

ہو جو دماغوں نے میری درخواست پر اٹھارہ کیا اور ایک مختصر مضمون بھیج دیا۔ میں  
 گزشتہ جون میں لندن گیا تھا۔ قدرتا ان سے ملنے کی تمنا تھی۔ لہذا آگے  
 وقت مقرر کرنے کے لیے میں نے کیربج تمبلینوں کیا، تو ان کی ہجرت (سینا) نے بتایا کہ ان کی  
 طبیعت بہت علیل ہے، ڈاکٹروں نے کسی سے ملنے جلنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ لیکن  
 آپ اتنی دیر سے اور اتنی مدت کے بعد آئے ہیں، چاہیں تو آجائے۔ ایسے میں مجھے انہیں  
 زحمت دینے میں کھٹکھٹ محسوس ہوا۔ میں نے کہا، نہیں، میں ابھی چند دن اور یہاں ہوں  
 پھر کسی دن جب ان کی طبیعت بہتر ہوگی، حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ چار پانچ دن  
 بعد پھر معلوم کیا، تو انہوں نے بتایا کہ ہنوز ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں  
 ہوئی اور ڈاکٹروں کی پابندی بھی بدستور قائم ہے۔ غرض ان سے ملاقات کی فرصت  
 نہ مل سکی اور میں واپس چلا آیا۔ اب جب اطلاع ملی، کہ ان کا انتقال ہو گیا، تو حید  
 خلق ہوا۔ ان کی عزت گزشتہ، انکسار، لطف و کرم، عالماہ گفتگو۔۔۔ غرض  
 ایک ایک بات دہرہ دہرہ کے یاد آتی ہے اور دل سے اٹھ نکلتی ہے۔  
 ادلا دجھانی میں ایک بیٹی 'انا ہے' وہ اپنے گھر بار والی ہیں۔

## محمد اجمل خان

اصل میں ایک افغان خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کا پیشہ سیاہگری اور کشاوندی تھا ان کے والد کا نام اسماعیل خانی تھا۔ محمد اجمل خانی صاحب کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء کے جنگوں میں حصہ لیا تھا جس کی یادداشتیں وہ انگریز کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے۔ محمد اجمل خانی ۲ فروری ۱۸۹۷ء کو یوپی کے قصبے گوئتی (ضلع پرنب گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اور ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک دو ڈھائی سال الہ آباد یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے شعبے میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی بے کبھی کبھی بعض لوگ ان کے نام کے ساتھ پروفیسر کا لفظ لکھتے تھے۔ اس کے بعد چند وکالت بھی کی، لیکن یہاں وہ جم ریسکے۔ ۱۹۳۵ء میں ٹیگور کی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کھلتے چلے گئے۔ دو سال بعد ۱۹۳۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے انھیں اپنا سکریٹری مقرر کیا اور پھر ان کی وفات تک وہ اسی حیثیت سے ان کے وابستہ رہے۔

عربی زبان پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ مطالعہ قرآن سے بہت شغف تھا اور ترتیب ان حسب نزول قرآن ان کا خاص موضوع۔ چنانچہ انھوں نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحوی قرآنی پس منظر اور وحی کی ترتیب زمانی کے تعلق سے مرتبہ کے شائع کی تھی۔ اس کا مختصر انگریزی ترجمہ بھی چھپا تھا۔ دوسرے مذاہب سے بھی دلچسپی تھی، گیتا اور جیجی کے ترجمے اس کے گواہ ہیں۔ اور بھی چند چھوٹے چھوٹے رسالے ان سے یادگار ہیں۔ لیکن ان کا بہت بڑا کام ایک لغت تھی، انگریزہ حصوں میں اسے وزارت تعلیم نے طبع کروایا تھا۔ لیکن خدائے معلوم شائع کیوں نہ ہوئی اور یہ بھی کچھ نہ چلا کہ اس کا حشر کیا ہوا اس میں سرمایہ استعمال کے اور دہندی کے مرادفات دے چکے تھے۔ بڑے کام کی چیز تھی۔

میری ان سے ۱۹۳۶ء سے ملاقات تھی، آخری ان کے انتقال سے کوئی دس بارہ دن قبل ہوئی۔ ان کے سوچنے کا انداز چومکانے والا تھا، انھیں کسی بڑی سے بڑی مسئلہ روایت کے خلاف رائے کا اظہار کر دینے میں کسی باک نہیں ہوا۔ پھر لوگ جتنا اس پر بدگمان تھے، وہ اس سے لطف لیتے ہوئے آدھ پھرتے۔ اس کے باوجود میں نے انھیں کسی مذہب کی حمایت اور اخلاق کے احترام میں کسی سے کم نہیں پایا۔

مولانا آزاد کی وفات ۱۹۵۵ء کے بعد انھیں راجیہ سبھا کا رکن نامزد کر دیا گیا تھا۔ اپنی چلتی کھینچاں رہے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۶ء صبح دس بجے ان کی انتقال ہوئی اور اسی دن سپر کورٹ اپنی وصیت کے مطابق بستی نظام الدین (غزنی) میں احاطہ مخاندان خواجہ حسن نظامی میں دفن ہوئے۔ **فیض اللہ**۔

## رئیس احمد جعفری

ان کا وطن سیتا پور تھا اور ان کے خاندان کا وہاں کے عمامہ میں شمار ہوتا تھا۔ نا انصیاں اسی  
 ضلع میں خیر آباد کا مردم خیز قصبہ تھا۔ ان کے نانا نیا دا احمد صاحب مٹھہر شاعر ریاض خیر آباد  
 رف ۱۹۳۴ء کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ تین بھائی تھے، ریاض احمد، نیا دا احمد، ریاض احمد۔  
 اپنے والد سید فیصل احمد کی طرح یہ تینوں بھائی بھی پولیس میں ملازم ہوئے ریاض تو یکمڑاگ زیادہ  
 دن نہ نباہ سکے اور مستعفی ہو گئے۔ البتہ دوسرے دونوں بھائی آخر تک ملازم سرکار رہے۔  
 سید نیا دا احمد رئیس احمد کے نانا تہ توں بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے پر فائز  
 تھے۔ اور یہیں ملازمت سے سبکدش ہو کر مدتوں میثم بھی رہے۔ رئیس احمد جعفری کے والد  
 کا نام ناظر حسین تھا۔ رئیس احمد ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ (ایک جگہ تاریخ ولادت ۱۹۱۳ء  
 بھی لکھی جاتی ہے، جو ٹھیک نہیں ہے) ناظر حسین کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا، جب رئیس  
 بھی بہت کم سن تھے، اس لیے ان کی پرورش اور تربیت آپا نا انصیاں (خیر آباد) میں ریاض  
 کی سرپرستی میں ہوئی۔

سید ناظر حسین کی جوانی مرگ کے باعث جاہل کی مناسب دیکھ بھال نہ ہو سکی اور کارندہ

کی عہد بردگی باعث تباہ ہو گئی۔ اس کا اثر رئیس احمد ان کے بڑے بھائی معین و محمد صاحب کی تعلیم پر پڑا۔ معین احمد تو انھوں نے درجہ سے آگے نہ بڑھ سکے، البتہ رئیس احمد نے زور بازو سے بہت کچھ پیدا کر لیا۔ انھیں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیجا گیا جس کا ان ایام میں ترقی پسند حلقوں میں شہرہ تھا۔ یہ غالباً ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔

چونکہ ان کی پرورش قلعی وادلی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے شروع سے مطالعے کا شوق تھا۔ اس زمانے میں دارالعلوم ندوہ میں ایک انجمن التا صلا ح قلعی یہ اس کے دارالمطالعہ میں جانے لگے اور یہاں کے رسائل و جرائد کے مطالعہ سے انھوں نے اپنی استعداد میں خاص اضافہ کیا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ خود انجمن کے رکن بن گئے اور ایک ہفتی قلعی رسالہ بھی جاری کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ انجمن کے نائب ناظم اور ۱۹۳۰ء میں ناظم منتخب ہوئے۔ ان کے دورِ نظامت میں انجمن نے بہت ترقی کی۔

اپنی قابلیت اور محنت کی حادث کے باعث وہ اساتذہ کے بہت چہیتے تھے۔ خصوصاً شیخ الحدیث مولانا حمید حسن خان ٹونگی (ف ۱۹۴۲ء) شاگرد شیخ حسن بن حسن یانی و خلیفہ حاجی امداد اللہ ماجرنگی انھیں بہت چاہتے تھے۔ اپنے قیامِ ندوہ کے زمانے میں انھوں نے جن اساتذہ سے پڑھا، ان میں مولانا حفیظ اللہ (شاگرد مولانا عبدالحی فرنگی علی) مولانا عبدالحکیم صدیقی، مولانا عبدالرحمن نگرانی (ف ۱۹۲۶ء) مولانا عبدالودود حیرا چوری، مولانا سید علی ویشی، مولانا شبلی قتیہ اول کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صرف و نحو میں مولانا کلیم احمد بھنگی اور مولانا محمد سلیم کنٹوری ان کے استاد تھے۔

۱۹۳۰ء میں دارالعلوم ندوہ کے طلبہ میں ایک سخت احتجاجی تحریک پیدا ہوئی تھی، طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ بعد کو چند طلبہ کو مدرسے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ رئیس احمد بھی ان غلط باتوں میں تھے۔ چونکہ اب ان کا ندوۃ میں تعلیم جاری رکھنا ممکن نہیں تھا، انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دلی میں داخلہ لے لیا۔ وہ جامعہ میں تین برس (۱۹۳۰-۱۹۳۳ء) رہے۔ اس زمانے

میں انھوں نے انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اس دور کے جہلاءِ سائنہ کرام سے انھوں نے بڑھا اور استفادہ کیا۔

مضموں نے ایسی نوادۃِ اصلاح کے زمانے سے کر رہے تھے یہاں رسالہ جامعہ کی موجودگی نے گویا ہمیز کا کام دیا۔ انھوں نے اس کے لیے متعدد علمی مضامین لکھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے بعض عربی چیزوں کا ترجمہ بھی کیا مثلاً منقول علی کا افسانہ الی کو اخی الفقراء؛ مرحوم نے اس کا عنوان غریب خانہ تک رکھا تھا۔ یہ ترجمے کا شوق اور تجربہ بعد کوان کے بہت کام آیا۔

۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی نے لندن میں انتقال کیا، تو حامل علی خاں مینو مکتبہ جامعہ فن دسمبر ۱۹۶۲ء نے ان کی سوا انھری کھولنے اور شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی نظر انتخاب نوجوان رئیس احمد پر پڑی جو ان کی مردم شناسی کی روشن دلیل ہے۔ رئیس احمد مولانا محمد علی سے غیر معمولی عقیدت تھی؛ انھوں نے اپنی جوانی اور نابھہ پر کاری کے باوجود یہ کتاب ایسی محنت سے قلمبند کی کہ صحیح معنوں میں آج تک بھی محمد علی مرحوم کی کوئی میراث اس سے بہتر نہ دیکھا اس کے برابر بھی نہیں لکھی گئی۔ یہی کتاب ان کے مرکزی خلافت کمیٹی کے روزنامے خلافت (بھٹی) کے ایڈیٹر بننے کا باعث بن گئی۔

اس زمانے میں خلافت ہاؤس اور خلافت اخبار جگہ آل انڈیا خلافت کمیٹی عبارت تھی مولانا شوکت علی سے۔ اس کی بہادری اور شباب کب کا رخصت ہو چکا تھا، لیکن مولانا شوکت علی سے سینے سے لگنے بیٹھے تھے۔ آمدنی کم، خندہ نمادہ اور خرچ بہ ستور۔ ملازموں کی تنخواہیں چڑھنے لگیں اور قرضوں ہوں کے تقاضے بڑھنے لگے۔ اخبار کی اشاعت ببقاعدہ ہو گئی اور دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ باری باری کنارہ کرنے لگے۔ آخری ایڈیٹر چرہاں سے گئے، وہ آہستہ آہستہ مراد آبادی تھے۔ جب تک کوئی ڈھنگ کا آدمی نہ ملے مولانا شوکت علی اُسے جاری رکھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ ایک نئے ایڈیٹر کی تلاش میں تھے کہ



کسی نے انہیں سیرت محمد علی کے مصنف رئیس احمد جعفری کا پتہ دیا۔ شروع میں رئیس احمد نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن بالآخر وہ بھی پہنچ گئے۔ یہ جون ۱۹۳۳ء کی بات ہے، جب ان کی عمر بشکل ۳۶ برس کی رہی ہوگی۔

جب انہیں خود یہاں جم گئے، تو انہوں نے اپنے بعض قدیم دوستوں کو بھی بھیج دیا۔ ان میں مولانا عبدالسلام قندواؤں (حال شیخ انصاری جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ صاحب مدبر و مقررہمے تھے۔ غرض تبدیلی انہوں نے نہ صرف اخبار کا عمل مقبوض کیا، بلکہ خلافت کو از سر نو صاحب اثر و نامہ بنا دیا۔ لیکن پرچہ مسلسل نقصان میں جا رہا تھا، انجام کار مولانا شوکت علی نے فیصلہ کر لیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ جعفری صاحب نے ان سے کہا کہ اگر آپ اخبار اور مطبع کا انتظامی شعبہ بھی کھلیں میرے سرپرست کر دیں تو میں اس کا صحیح و خوب برابر کرنے کا ذمہ لیتا ہوں۔ مولانا شوکت علی نے بغیر تردد و تجربہ یہ چیلنج قبول کر لیا اور جعفری صاحب نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھا یا۔ پرچہ نہ صرف اپنا خوب پورا کرنے لگا، بلکہ اس سے منافع ہونے لگا۔

مولانا شوکت علی کے انتقال (دسمبر ۱۹۴۴ء) تک جعفری صاحب خلافت سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ اس سے الگ ہو گئے اور اپنا مستقل دفتر چھوڑ کر جاری کر دیا۔ اس نے بہت کم عمری ہی سے غائبانہ شہرہ کے نکلے تھے، لیکن اس دوران میں انہوں نے متعدد کتابیں، ناول وغیرہ لکھے اور ان کا نام ایک کامیاب صحافی اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوا۔

وہ شروع سے مولانا محمد علی سے بہت متاثر، بلکہ مرعوب تھے۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، اور خلافت کی ادارت کے زمانے میں تو وہ خلافت کے حامی اور کانگریس کی مخالف سیاست کے گویا نقض باطلہ بن گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ملک تقسیم ہوا، تو وہ بھی پاکستان چلے گئے۔ یہاں پرانی ادبی ساکھ ان کے بہت کام آئی۔

کراچی سے انھوں نے ایک روز نامہ خورشید اور ادبی ماہنامہ ریاض جاوی کیے لیکن مال شکلات کے فیصل انھیں بند کرنا پڑا۔ اور اودہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے جس کے صدر چیلہ خلیفہ عبدالکبیر تھے اور ان کی وفات (۲۰ جنوری ۱۹۵۹ء) کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مقرر ہوئے، انھیں لاہور طلب کیا اور وہ اس سے وابستہ ہو گئے۔

وہ زود نویس اور بسیار نویس تھے۔ بلکہ عام اطلاع یہ ہے کہ چند اصحاب ان کے ہاں ملازم تھے جب کسی عربی یا فارسی کتاب کا ترجمہ مطلوب ہوتا، اس کے پچاس پچاس ساتھ ساتھ صفحات ان میں تقسیم کر دیتے! یوں بڑی سے بڑی کتاب کا ترجمہ دس پندرہ دن میں مکمل ہو جاتا۔ پھر وہ اسے ایک نظر دیکھ کر کتابوں کے حوائج کر دیتے اور جیسے جیسے میں کتاب شائع ہو جاتی، جلاسا لے ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد سینکڑوں سے کم نہیں ہوتی، اور بعض ان میں سے اچھی خاصی ضخیم ہیں۔ پھر ان کے موضوعات بھی بچیدار متنوع ہیں، انادول، افسانہ، علم ادب، سیاست، معیشت، اسیرت و سوانح نامہ، تاریخ و تذکرہ، حدیث و فقہ، غرض تراجم و تالیفات کا ایک انبار ان سے یادگار ہے۔

ظاہر ہے کہ اتنی محنت، شاقہ اور محنت دو میں صحت کب تک ساتھ دیتی! تندرستی خراب ہو گئی اور بہت بیمار رہنے لگے۔ لاہور میں وہ اکیلے رہتے تھے، بیوی بچے کراچی میں تھے۔ یہاں دوسرے تہ دل کا دورہ پڑا۔ اس سے کچھ احتیاط برتنے لگے تھے، لیکن مدتوں کی بگڑی ہوئی صحت کیسے بحال ہو جاتی!

کراچی جانے کے لیے ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن گئے۔ یہیں دل کا دوسرا دورہ آگیا، ناگہاناً جان بحق ہو گئے۔ آٹالٹڈ ڈائنامیہ راجپوت۔

## واقف مراد آبادی، سید یعقوب الحسن

۲۶ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو سنسٹھل میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد مدنی کا پیشہ اختیار کیا۔ طبیعت میں مزاج کا مادہ تھا اور پڑھنے کا انداز بہت ڈرامائی اور مبالغہ آلود تھا اور اسی پہلو سے ان کی شہرت تھی، اسی باعث فلم دالان کی نظر بھی ان پر پڑی۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں قلموں کے گانے اور گیت اور مکالمے لکھنے کے سلسلے میں بھی پہنچے۔ تقسیم ملک کے بعد بھی بہت دن پریشان اور بیکار رہے۔ ۱۹۵۷ء میں بعض دوستوں کی مدد سے کیمپ کالج اور دیال سنگھ کالج، دلی میں اردو پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ ابھی چند برس ہوئے، وہاں سے الگ ہوئے تو اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ان کا پانچ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ تحقیق مقرر کر دیا تھا۔

بہت دن سے بیمار تھے، غالباً کینسر کی شکایت تھی۔ یہ مہیضی مرض لا علاج ہے۔ اسی میں ۱۶/۱۲/۱۹۶۹ء کی درمیانی شب میں انتقال ہوا اور ۱۹ دسمبر کو کوئٹہ فیروز شاہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

انہوں نے کسی زمانے میں رابعیات، جبرخیام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا، یہ عجیب چکا ہے۔

تذکرہ مسامرین

اور کلام بھی مقدار میں بہت ہوگا، جو غیر مطلوبہ رہ گیا۔  
غرض کلام میں دو نکاتیں ملاحظہ ہوں:

## ثرانہ نثر یا کانوں کا پتارہ

لڑکے ایلے تے بیا لڑکیاں بلیدیاں  
دیدنی پر آج سڑکوں پر نئی اک بھینچال  
آج جس رسیا کو دیکھیں ثرا نہ سڑتا تو ہے  
ہر حیراں کا جوشِ افسردہ اسی سے نازہ ہے  
وہ تباہ کتا ہے اب وحشت کی کیا آقا ہے  
بہر میں بھی وصل جاناں کا کیسے ہے بندوبست  
گیٹاوت، شمشاد کا کٹا اور کتا منگیشکر  
ہیں ثریا، نور دشتی اور اقبال دُسر لیش  
داعی، میر ونگ، شہنائی، اکلاہ ونگ، علی  
ڈھولا، نوشکی و کجری، آگاہ اور دودل کے سنگ  
گیت اور مینہ، تانہ، دوسے، میر کے گھن  
لہڑا، تانہ، تانچ کی گھٹ، گھونگرہ اور آدیاں  
ہے اسی ڈبے میں اب آواز اور تصویر بیا،  
اک ذرا اکھٹا دیا، اگر دن جھکا کی دیکھ لی  
چونکناٹھے رہیگر اک دم اس چاکلٹان سے  
دیکھ میں موقع محل، آگاہا ہے کیسا، میں کہاں  
اور رادھ چائو ہے گانا، آج کے سچ، رنگ پر

اس ترقی کے زمانے میں بڑھتی شہلیاں  
ریڈیو پر گھر گیا ہے یوں تو بجائے اک ہال  
کا ٹنڈا شوق ہے، یادقت کی سوغات ہے  
کیا کرنی سمجھے، جو اس کا فیض بجا غلہ ہے  
عشق کا میٹر ہے یہ، تب تو غلے کا بار ہے  
شانے پر مگھائے آنکھیں بند اس کی گھنچیں  
کتے موسیقار کا ہے اتنے سے ڈبے میں گھر  
خند ہیں اس میں رنج و زہرہ و طلعت، کیش  
چلتے پھرتے سنتے دینے، طلہ، سارنگی، ستار  
دھوکی، نوریت گھار، بانسری اور جلیترنگ  
دادا، بھری، غزل، ہنگامہ، شعر و سخن  
کرات قرآن، اماں بھی اور تو آئیاں  
اس سے ہلکا پر لگایا ہے بھر کا کالا بھار  
یار کی آواز میں جلوہ منائی دیکھ لی  
زن سے نکلی سائیکل، کافی بجائی شان سے  
کاش اپنے جوش میں ہوں، سر پھرے لہجہ  
اک تری بیجا رہی تھیں، گھٹک چٹی جن کی کمر

نیا دم ہم کو بنا لیا پھر مزہ ہے پسار کا  
 آنکھیں ان کو ہنسی، ہنسی وہ خوار کی کے لیے  
 اپنی نانی سے کرے یاری تو ہو گا دل بھی شا  
 گھر سے کیوں نکلا ہے باہر کے بھینکا کا فراق  
 ساتھ میت کے اوڑھ چنیں مٹی خاک کی  
 پھر صدائی کہ نہ دست برداری سے ہوڑنا  
 راجہ نای چلو ان دنوں ہے ٹرافک، کاشٹین  
 بے تحاشا چلو ان نے مر کے گردن دابلی  
 طالبہ کا بچھا کر کے پھٹ پڑیں دسوائیاں  
 جا رہی ہے ساتھ دھن کو لیے کوئی برات

"خاک ڈالو اس خوشی پر جب کہ جی گھرا دیا"

دھوم سے دیکھو محبت کا جنازہ جا رہا"

## مستقبل کی تعلیم و تعلیم گاہیں

اس ترقی کے زمانے کی جو کچھ رفتار ہے  
 آج کی تعلیم گاہیں، ہو نئی مستقبل پہ باد  
 ہوگی اپنے دانش میں تعلیم کی دنیا بحال  
 سنکر ترقی دانش کی پھر جی اٹھیں گی ایک بار  
 اک انوکھے ڈھنگ پر بہرے لیکتا تعلیمی نظام  
 کورس سے خارج وہ سب بیکار جو محنت کو  
 مہتری یا تھیولوجی، سائنس، کامرس و جٹا

وہ بتاتی ہے کذاب کلمہ کا بیڑہ پار ہے  
 اتنی جبرائیل تمک کا جانشین ایک تازہ بہار  
 حسبِ اندازہ ہے ڈیننگ پریٹ پیچیدگی  
 شوق سے ڈالے گلے میں، دیٹ کے کلچر کا نام  
 کیسے تہذیب نو کے کالجوں کے صبح و شام  
 باؤن کلچر میں، اسٹوڈنٹ سب پرفیکٹ جوں  
 جاگرتی، انجینئرنگ اور سیالوجی، دور از نصیب

گھیس، ریگ، بارنگ، اور انڈنگ کپڑی  
 ہر پر و فیسر بھی ہو گا ڈانس تو گری ہو لہ  
 مینو، آشا بھوٹے، موقی، اُورے، شکر، سریش  
 جس میں ہوگی دوڑ پوری چھوٹ مسنگ کے لیے  
 بیٹھکیں، ڈنڈ پلینا، خوش فعلیاں، جی ٹنگ  
 چل کتھی، نئے چھپا چھپ ہر طرف ترال ہو  
 کپٹیشن ساؤنگ کے میں، یہ پڑیاں، وہ پڑیا  
 پھر ان کے ڈھنگ سے تہذیب کی ہو چو  
 میرو، میر دین، دین اور دین کے سب مشغلے  
 ناؤن کچھ کے اپنانے پر ہو گا بارڈورس  
 گرجو آزادی کے ہیں سامے کھائے جائیگے  
 ننگی، ٹیک، بیاہ کے سارے تھیلے طاق پر  
 میں کچھ، نوڈلین، نوڈلین آف کاسٹ  
 یوں نظام کو اسہولت کے موافق آئیگا  
 سب بھلا دیکھا، دوکانی داس اور خاں کے نام  
 پھر تو دنیا نے محبت میں، مزہ دوانس کا  
 آئے دن لڑکوں سے ہوگی لڑکیوں کی محبت  
 گر ہوئے عاجز تو تھانے میں رہا نکو، انیکے  
 اور نہایت ہی ادب سے جھپک کر فرمائیگے  
 گھر میں اپنے بھائی سے فرمائے ایسا مذاق  
 ہوگی بنانا، ہاری ہر کوئی سسٹر، ٹینگا

ڈانس، میوزک، ایکٹنگ، سٹنگ، سوئیٹنگ، ٹر  
 گھیس اور گانے میں ماہر جو ننگے سارے ٹیک  
 ہو گئے پھر جیسے دار اسٹک اور طعلت، مکیش  
 پیر، چپلا، یہ دو دش اور دیلنگ کے لیے  
 لڑکیوں، لڑکوں کی کشتی، نگہ دار و جہاننگ  
 دور گھنٹ بجے، پانی میں دالی ہاں ہو  
 تیسرے گھنٹے میں میوزک، سائٹس اور گرسٹرا  
 ہو گا چوتھے پریڈ میں ڈانس بھی کپڑی  
 پانچویں گھنٹے میں فلمی ایکٹنگ کے سب فرے  
 پھر چھٹے گھنٹے میں سوشل اسٹڈی کا خاصہ کر  
 کیا فریڈم کے ہیں معنی وہ بتائے جائیگے  
 ہر طرح آزاد سب ہوں خود چننے اپنے بہر  
 پائیکنگ، دیش میں کوئی نہ سائن آف پائٹ  
 انوی گھنٹہ نقطہ تسلیم کا وہ جائیگا  
 کارلائل، ٹیکسیر، رینالڈ، ملٹن کا نکلام  
 ایٹ کے کچھ کا بے سرحی نہ ہو گا پاس کا  
 ڈسینٹ پھر ٹیکس کی بدے وہ ہو گا پائٹ  
 لڑکیاں لڑکوں کو چھیرائیگی تو وہ ٹرائیگے  
 ان میں کچھ جیاد اگر ہو گئے تو وہ موت جائیگے  
 دیکھیں مس صاحبہ، ہم کو سنی ایسی ہے شاق  
 گز گئی نے دیکھ پایا، آپ کا کیا جائیگا

ہم کو آوارہ سمجھ کر آپ کرتی ہیں خلیفہ  
ہم بھی باعزت ہیں اہل اور گھرانے کے شرف

اب کچھ خیاام کی دہائیوں کے ترجمے کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ مقابلے کی سہولت کے لیے خیاام کی اصلی رباعیاں بھی دے رہا ہوں

کل دیکھتا رہا میں حسین ایک کوزہ گر	دی کوزہ گرے بدیم اندر بازار
مٹی کو منہ رہا تھا جولا توں سے کھونڈ کر	برباد ہو گئے مکدہ ہی زو بسیا ر
مٹی زبان حال سے گویا یہ کہتی تھی	والہ گل زبان حال باوی گفت
کچھ گلخون کی خاک ہے مجھ میں بھی، بیخبر!	من بچو تو بدو ام، مرا نیکو دار
کہتے کو میں تحقیق سے محروم نہیں	تا بودم ز عشق محروم نشد
اک نکتہ اسرار بھی معلوم نہیں	کم بود اسرار کہ معلوم نشد
اڑھنے خرد اب جو یہ سب دیکھتا ہوں	اکنوں کہ سہی جنگم اڑھنے خود
معلوم ہوا، خاک بھی معلوم نہیں	معلوم شد کہ بچ معلوم نشد
بدست شرابی ہوں، دیوانہ کہ سودا گی	گر من ز بے مغانہ ستم، بستم
کافر ہوں کہ مشرک ہوں، موسائی کہ عیسائی	در کافرو گبر و بت پرستم، بستم
کیا میری بد اعمالی پیشگی زمانے کو	برہائے ہم گمانے دارو
لاکھوں مرے مذہب ہیں، مسلک اہر جانی	من راں خودم چنانکہ ستم، بستم
جو سے کاٹھن ہے، پتی جا کے ذی شعور میں	غربادہ خوری تو باخوردن مذاں خور
گلوں کی چھانوں میں، یا ناشگفتہ خود میں	یا باسنے سادہ رخ دختراں خور
دڈ گدگد کا کے احوال دت پڑے بھرم جانے	بسیار خور و در ممکن، قاش مساز
چپا کے تھوڑی سی، وہ گلابی حضروں میں	اندک خور و گدگد، گر خور و چہناں خور

## تذکرہ معاصرین

گرے خوری، طعنہ مزین مسالہ را  
گردست و ہا تو بہ گنم زوال را  
تو فخر بدیں گئی کہ من نے خودم  
صدکار گئی کہ نے غلام مستی

ہے فخر اسی پر کہ تو نے غوار نہیں  
دندوں کی بھی تو بہ کوئی دشوار نہیں  
احمال وہ بترے ہیں کہ شر ہے شراب  
صد شکر کہ ہم دندہ دیا کار نہیں

پیرے دیدم بنائے خمار سے  
گفتہ نکتی ز رنگاں اخبار سے  
گفتا: نے خور کہ ہموں بیار کے  
دقتد مکے باز نیام بار سے

میں لے اک بوڑھے کو میخانے میں دیکھا تو کہا  
واہ کیا کہنا! یہ سن آپ کا، یہ ریش و قبا!  
بولانا دان! غنیمت ہے یہ جہلت اپنی لے۔  
پھر کوئی لوٹ کے آیا ہے، یہاں سے جو گیا؟

زاہد بہ نے فاحشہ گفتا: مستی  
کز خیر گستی و ہ شر ہوستی  
زن گفت: اچانکہ ی نہایم ہستم  
تویر چنانکہ می غای، ہستی

اک پیر جی نے فاحشہ عورت سے یہ کہا  
بیشرم! تجھ کو خوفِ خدا ابھی نہیں ذرا!  
کی عرض اُس نے جیسی بھی ہوں، ہوں حقیقتاً  
فرمائیں کچھ اپنے بھی باطن کا ماحضر؟



## جامی حیدر آبادی انور شید احمد

حیدر آباد کے ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کا سقوط اس دورِ وصل پر یعنی (مارٹن) تھا، جہاں سے ان کے نانا قاضی صدیق احمد فہیم تخلص نقل مکان کر کے حیدر آباد آئے اور یہاں دیکھ لیا کہ سزا مقرر ہو گئے۔ جامی کے والد مولوی محمد یعقوب بھی عالم دین تھے۔

جامی حیدر آباد میں ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہو گیا۔ اس کے بعد تعلیم و تربیت اپنی والدہ اور نانی کی نگرانی میں پائی۔ عربی فارسی اور دنیا کی تعلیم گھر پر ہوئی اور بعد کے زمانے (۱۹۳۲ء) میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ماسٹر آف لٹریچر کا امتحان اہتمام سے پاس کیا۔ کسب معاش کے لیے چندے محکمہ آبکاری میں ملازم رہا اور اس میں انسپکٹری کے عہدے تک ترقی کی؛ لیکن جلد ہی دلِ اچاٹ ہو گیا اور استعفیٰ دے دیا۔

انھوں نے ۲۲ برس کی عمر یعنی ۱۹۳۷ء میں شعر کہنا شروع کیا اور اس میں فصاحت

جنگ جلیل، انجوری سے مشورہ رہا۔ ان کی وفات کے کچھ دن بعد علی اختر حیدر آبادی اور جوش ملیح آبادی سے بھی اصلاح لی۔ وہ شاعری میں اقبال، فراق اور فیض سے بہت متاثر ہوئے۔ جلد جلد ترقی کی منزلیں طے کیں، غزل اور نظم دونوں سے دلچسپی تھی۔ ادارہ ادبیاں اردو کی طرف سے ان کی متعدد کتابیں چھپیں، جن میں بچوں کے لیے بعض کتابچے بھی ہیں۔ ان کے تین ابتدائی شعری مجموعے، اشرا سے، نشانِ راہ، منزل کی طرف اچھے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے رنگِ سخن بدلا۔ اس کے بعد دو مجموعے اور شائع ہوئے: افسانہ چرخِ زمین ترقی اردو، کنھرا پردیش کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں چھپا، اور دوسرا برگِ آوارہ ۱۹۶۸ء میں۔ تیسرا دیوان بھی مرتب کر لیا تھا، لیکن اس کے چھپنے کی ذمت نہیں آئی تھی کہ اس سے قبل خود ان کی کتاب زندگی کا ورق اسٹا دیا گیا۔ یہ ان کی وفات کے بعد یاد کی خوشبو کے عنوان سے چھپا (حیدر آباد ۱۹۷۱ء)

لیکن جتنا کلام شائع ہوا، اس سے کہیں زیادہ انھوں نے دوسروں کی نذر کر دیا۔ ان کی بدولت کئی لوگ صاحبِ دیوان ہو گئے، ان میں سے بعض آج بھی مشہور شاعر ہیں۔ کنھرا پولیس سہاہتیا کالونی نے ۱۹۶۰ء میں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف انعام سے کیا۔ پانچ سال ان کے تراجم اور قدروانوں نے جتن جاتی سنانے کی تیاری شروع کی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'قیمتِ عرضِ ہنر' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔

وہ صحیح معنوں میں شاعر اور خادِمِ ادب تھے، لیکن خود نوشتیں سے کوسوں دور۔ مدتوں انھوں نے شاعروں سے کوئی سروکار نہیں رکھا، بلکہ احباب کی نجی مجالس تک میں بھی شعر سنانے کے رد اور انہیں تھتھتے۔ ادھر پچھلے دو چار سال سے احباب کے اصرار پر کبھی کبھی شاعرے میں چلے جاتے، لیکن اس طرح جیسے کوئی غناہ سرزد ہو رہا ہو۔ تاہم کاروگ پالادی انہیں ساری عمر بخیر رہی گزاری۔

صحت ہمیشہ بالعموم اچھی رہی۔ اگرچہ آخری ایام میں مختلف عوارض کی شکایت کرنے لگے

نہے، اور بد قسمتی سے کوئی آٹھ مہینے ہوئے، کیسر کے موذی مرض کا شکار ہو گئے۔ جب ان کی حالت تشویشناک شکل اختیار کر گئی، تو ۱۸ فروری کو انھیں بغرض علاجِ دوا خانہ عثمانیہ میں داخل کر دیا گیا۔ یہیں ۱۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو اور شاہ کے وقت جان جانِ آخرین کے سپرد کی۔ ہوش و حواس آخر تک درست رہے، بلکہ چند منٹ پہلے تک بات چیت کرتے رہے۔ لاش بھی دن اسپتال سے ان کے مکان (علاقہ سلطانپور) منتقل کر دی گئی، جہاں سے اگلے دن (۱۷ مارچ کو) بعد عصر جنازہ اٹھا۔ نماز جنازہ مسجد کھڑاویں داے شاہ صاحب میں ادا کی گئی اور احاطہ چونیٹی شاہ کے قبرستان (مٹا پورہ) میں سپردِ خاک ہوئے۔ نورانی بیگم نے قطعہ تماریحِ وفات کہا:

خوش رہے ملکِ معنیٰ میں بسا بے  
سالِ منقوٹہ یہ نورانی! نکھو  
ہائے کیا جابی کو ہم نے کھو دیا  
حیف کی غورِ شہید احمد نے قضا

(۱۹۷۰)

جابی کے کلام پر، سنجیدہ تفکر ہے۔ وہ زندگی اور زندگی کے مسائل پر انوکھے اغاذ میں سوچتے ہیں۔ ان کے ہاں تشبیہ و استعارہ کی تازگی بھی ملتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس دور کے ممتاز نگینے داے تھے۔

پہچان بھی نہ مری زندگی مجھے  
تیری وہ اردی میں کیس سا مٹا ہوا  
ترے قریب پہنچ کر بھی کم نہیں ہوتے  
غمِ حیات نے جو فاصلے بڑھائے ہیں  
ہنگامہ حیات میں اسے تسخیرِ دلبری!  
لمحاتِ دل طے، تو بہت مختصر طے  
کتنی شبوں کا زہریلا ہے نگاہ نے  
حالاتِ خود ہی پاؤں کی نہ بھرن گئے  
دردِ کچھ اتنی دور نہ تھی تیری آنکھیں  
شعورِ غم کے سوا کچھ نہیں ہے غم کا علاج  
مگر یہ بات زمانے کو کون سمجھائے  
ناصح! میرے ساتھ ساتھ ذرا  
تم بھی اس رنگِ نہرِ تنگ آؤ

بجلا ہے کس کا ہوا لات بھر چرائوں میں  
 اسی نگاہ نے جینا سکھا دیا مجھ کو  
 وہ حیات میں کتنے ہی پیچ و خم آئے  
 یہ ادب بات کہ دل سخن کے ہو گیا انجان  
 دیکھا تو بوجہ دل پر اترے نام کے سوا  
 کچھ دور آؤ موت کے ہمراہ بھی چلیں  
 جا ہی ہمارے خلوص نے سینے میں دکھ لیے  
 غم تاریک سی گیلیوں میں کہیں ٹھہرا کر  
 کچھ دیے اور جلاؤں کا سہرا وہاں  
 وہی راتیں ہیں وہی زخم وہی راگنیر  
 وہ غم آشوبہ حتم کی جسے کس کی گئی  
 رز گیا مری تہائیوں کے شانے پر  
 اک غم ساتھ ساتھ مرے زندگی وہی  
 کس سے کرتا دل خود دار غموں کا سودا  
 جب بھی ملے وہ مجھ سے اُسے روپ میں ملے  
 غم کی دلدلی ہے نیا دلوں کا سلگتا جھگل  
 اعتبار نشاط سے پہلے  
 بے کے پھرتی ہیں اندھیاں جس کو  
 دل کی راہوں میں کوئی سایہ لڑاں بھی  
 اس طرح ترے درد کو سینے سے لگا یا  
 کا نہ محلوں پر اٹھائے مجھے صدیوں کا اندھیرا  
 غرور جن سحر اب یہ پچھتا بھی نہیں  
 مری حیات کو اب جس کا آسرا بھی نہیں  
 بھرہ گیا ہے کوئی اکب کہاں تپا بھی نہیں  
 دگر نہ تیری صدا، اور کی صدا بھی نہیں  
 جلتے ہوئے نشان ستم اور بھی ملے  
 سخن ہے راستے میں نہیں زندگی ملے  
 یاران خود فریب سے جو زخم بھی ملے  
 چھپ گئی گرد کشا کش میں امیدوں کی سحر  
 میں نے کچھ سوچ کے دکھائے قدم کا تھوڑا  
 ختم ہو گا کہ نہیں تیرے نصیبوں کا سفر  
 میرا خیال ہے کہ مسجھائے دہر ہے  
 کوئی خیال کسی دست مہرماں کی طرح  
 لیکن کسی بھیل کی دولت سخی رہی  
 نکبت گل بھی نہیں ساری گیسو بھی نہیں  
 برسوں میں ملے ہوئے ہیں تعارف کے چلے  
 بے ایسے میں کہاں چھوڑ گیا ہے کوئی  
 غم دوراں سے مشورہ کروں  
 زندگی ہے وہ برگ آوارہ  
 ساتھ چلتا ہے، کسی چارہ گردل کی طرح  
 جیسے کوئی روٹنے ہوئے سانحہ کو سٹا  
 پھرتے ہیں مرد و ہر کی آغوش کے پالے

امید کی توفی ہوئی دیوار سے لگ کر      سوار جو سوچا ہے وہی سوچ رہا ہوں  
 اور اترن ہماراں کو ابھرک بارالٹ کر      دیکھو تو ہیں، نام ہمارا بھی کہیں ہے  
 صدیوں سے اسی طرح بھٹکتی ہے خدائی      صدیوں سے اسی طرح خدا غرض نہیں ہے  
 دقت نے مات کے ہاتھوں کو جکڑ رکھا تھا      صبح کے پاؤں میں حالات کی زنجیریں ہیں  
 آج مقروض وہیں دست عزیزوں کی طرح      میرے خوابوں سے گریزاں مری تعبیر نہیں  
 جیسے رشیم میں پیٹے، کوئی انگاروں کو      یوں حقان کے بدن پر ہیں خاندان کے لباس  
 دل میں اس طرح ترا درد ابھر آتا ہے      نرم مٹی پہ کوئی نقش کھٹ پا جیسے  
 یوں تو ہر سمت ترے شہر میں ہنگامہ ہے      اور بھر بھی ہے، ہر اک شخص اکیلا جیسے  
 اس طرح پھانسیوں نے پکارا ہیں کہ ہم      جیسے کوئی رسول تھے، اہل کتاب تھے  
 ہر جنبی سے اپنا پتا پوچھتے پھرے      ہم سے جہاں میں اور بھی خانہ خواب تھے  
 کل ہم وہاں سے آئے یہی سوچتے رہے      اسنو ہر ایک چہرے پہ کتنے نقاب تھے  
 بہت کچھ جو کتابوں میں نہیں تھا      وہ چہروں کی بگردن میں پڑھا ہے  
 زندگی ظفر ہے اور شام تہا رسوائی ہے      سب تماشا ہے یہاں، اکون تماشا ہی ہے  
 غم کی قندیل جلاؤ گا بہت ممکن ہے      کوئی ہمان سر شام، مرے گھر آئے  
 لوگ پھرتے ہیں یہاں حوتِ ملامت کی طرح      زندگانی کا یقیں آئے، تو کیونکر آئے  
 بس حرفِ جمع احباب کھڑا تھا اجابی      ہم پہ آئے تو اسی سمت سے تھپڑ آئے  
 اب زندگی کے نام پہ یوں چونکی ہوئی      جیسے نیا خیال ہے موضوع گفتگو  
 دہے پڑے ہیں کہیں شیر کی تے مدفن میں      وہ لوگ جن کو تالوں کا قرب حاصل تھا  
 بڑے عجیب ہیں یہ دردِ دہم کے دستے بھی      کہ جس کو دیکھیے، اپنا دکھائی دیتا ہے  
 زندگانی کو جھکتے ہوئے سارے کی طرح      دل کی گلیوں سے کئی بار گزرتے دیکھا  
 کتنے چہروں پہ غم دہر کی تحریر پڑھی      کتنی آنکھوں میں سداوں کو ابھرتے دیکھا

ہائے اک ازل تبسم کے لیے کلیوں کو مشورہ تلخی ایام سے کرتے دیکھا  
 تجھ کو پایا، تو دھڑکتے ہوئے دل میں پایا تجھ کو دیکھا، تو خیالوں سے گزرتے دیکھا  
 دقت کی تیزی رفتار کی زد میں، آکر ہم نے اک عہد روایات کو مرنے دیکھا  
 احساس کے شعلے زائیدوں کے سمندر انسان ہیں، یا صرف تراشے ہوئے پتھر  
 حباب کے خلوص میں شاید کمی ہوئی دل کے قریب، لاکِ بناں بھی نہیں گئی  
 حالات کے فریب لے پتھر ہٹا دیا اب زندگی تو بارگراں بھی نہیں گئی  
 اپنے قیفے میں تو زخموں کی بڑی دوسری کیوں نہ پھر وقت کا سب قرض بکایا جائے  
 دل میں اس طرح ترے درد کو رکھ لیتا ہوں جیسے گھر میں کس مجرم کو چھپایا جائے  
 اب زلفِ عنبر کی پناہیں نہیں تو کیا آوارگانِ غم کے ٹھکانے ہیں اور بھی  
 جلتا ہے ایک ذہن، ہکتا ہے ایک پھول روزِ ازل سے ہے یہی تخلیق کا اصول

## دیارِ بہند

دیارِ بہند کی عظمت کا نام زندہ ہے  
 اتر گیا ہے نیا آفتاب سینوں میں  
 دھڑک رہے ہیں شبِ درد کا دھانوں کے  
 ابھر رہے ہیں نئے خرابِ نرم مٹی سے  
 چمک رہے ہیں نئے حوصلے کسانوں کے  
 چلے چلو کی صداؤں سے گو غمتی ہے فضا  
 رو حیات میں ہیں قافلے جوانوں کے

## تذکرہ معاصرین

ہر ایک بھول کی پتلی ہے اب مشہد و نشان  
 ہر ایک شاخ ہے کھینچی ہوئی کہاں کی طرح  
 نئی انگٹے نئے جو شرت کا تقاضا ہے  
 حد پہ ٹوٹ پڑو امگ ناگہاں کی طرح  
 فریب کا راند حیروں کے فرق پر چمکو  
 بنام حسن سحر تیغ بے اماں کی طرح

چلے چلو کہ ابھی سہرہ میں ہیں خطرے میں  
 پک رہے ہیں جہنم کے چھینٹے سایے  
 چلے چلو کہ گلستانِ امن و آزاد ی  
 تھاری جرأتِ ریباک سے نکھر جائے  
 نظر میں آگ، ارادوں میں بجلیاں لے کر  
 چلے چلو کہ ہر اک فاصلہ سمٹ آئے  
 دیارِ مہد کی عظمت کا نام زندہ ہے

## عبدالشکور (پروفیسر)

ان کے والد عبداللطیف صاحب سرکار انگریزی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ڈپٹی کمشنری  
تک ترقی پائی اور پینشن کے بعد اپنی وفات (۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء) تک بریلی میں مقیم رہے۔ پروفیسر  
عبدالشکور درجہ مہیں بریلی میں ۳ جولائی ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول تک انھوں نے  
تعلیم بھی بریلی ہی میں پائی۔ اس کے بعد ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور یہاں سے  
یکے بعد دیگرے ایم اے، انگریزی اور بی ائی کی اسناد حاصل کیں۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے ملازمت کا آغاز علی گڑھ ہی سے کیا۔ یہاں وہ انگریزی کے  
مدرس (ٹیکچرر) مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں انھیں جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن سے دعوت ملی اور وہ  
علی گڑھ چھوڑ کر وہاں چلے گئے۔ یہاں ۱۹۳۳ء تک ڈربن کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے۔  
اس سال واپس وطن آئے، تو بریلی کالج میں جگہ مل گئی، اس کالج میں وہ ۱۹۳۱ء تک رہے  
اور اسی سال یہاں سے حلیم کالج کے پرنسپل ہو کر کانپور منتقل ہو گئے، جس میں اتفاق سے انھیں  
یہاں ترقی کا موقع میسر آگیا، اور رضا کالج، رام پور کی پرنسپل کی پیشکش ہوئی۔ چنانچہ  
انھوں نے کانپور سے رام پور کی راہ لی۔ ان کا ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۳ء تک کا زمانہ رام پور ہی



میں گودا ادا پور کے زمانہ ملازمت کے بعد وہ چند بے بیکار رہے۔ بالآخر ۱۹۵۲ء میں اکادہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ کالج سرسید کے ایک رفیق کار مولوی بشیر الدین احمد کی کوشش سے قائم ہوا تھا۔ اس کے ابتدائی زمانے میں صدر جمہوریہ سندھ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے بھی یہاں تعلیم پائی تھی۔ پروفیسر عبدالشکور نے اپنے زمانہ قیام میں کالج کی ترقی اور تنظیم میں بہت کوشش کی۔ یہاں جواہر سہو ذم کی توسیع میں ان کی سماجی جمیلہ بھی مفید ثابت ہوئی۔ اس عجائب گھر میں کئی بیش قیمت نادار کتب اور خطوط اور خطی نسخے محفوظ ہیں۔ فارسی خطوط کی فہرست رتبہ جناب محمد براہ حسین فاروقی ایم اے (علیگ) تذکرہ خواہرزاد ہر کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے (اکادہ ۱۹۵۹ء)۔

اکادہ میں چار سال رہنے کے بعد وہ ۱۹۵۸ء میں پھر علی گڑھ آئے۔ اب کے وہ ٹریننگ کالج سے وابستہ ہوئے۔ یہیں سے سال بھر بعد وہ مستقل ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد قیام برطانیہ میں رہا۔

مرحوم نے اپنے سہ سالہ قیام دور میں کے زمانے میں وہاں کے سماجی حالات کا غائر مطالعہ کیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کی پسماندگی کا بڑا سبب یہاں کی عورتوں میں تعلیم کی کمی اور گھر کی چار دیواری میں ان کا مقید رہنا ہے۔ اس سے وہ سبھی پردے کے مخالف بن گئے۔ اور کہا باعث انھیں لڑکیوں کی تعلیم سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بریلی کے بعض دور وندا اور ترقی پسند اصحاب نے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی تھی۔ ان میں خود عبدالشکور صاحب کے والد ڈوٹی عبد حلیف صاحب بھی تھے۔ چنانچہ ان اصحاب نے ۱۹۳۴ء میں بریلی میں اسلامیہ گورنمنٹ اسکول قائم کیا۔ اس میں انھیں اپنوں اور غیروں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آدمی تھے دھن کے کپے جو صلہ نہیں ہلے۔ جب عبدالشکور صاحب وطن واپس آئے تو یہ بھی اسکول کی کمیٹی کے ممبر بن گئے؛ بعد کو منیجر مقرر ہو گئے۔ یہ اسکول بہت کامیاب رہا، اب تو ترقی کر کے انٹر کالج بن گیا ہے۔

تعیین و تالیف کا شوق شروع سے تھا۔ انھوں نے متعدد کتابیں شائع کیں۔ آغاز کار میں دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا، اول مشہور تاریخی ڈراما گنگا دہترک، بہمن کے ڈولے ڈالڑاؤس کا مشرقی چربہ لکھنیا کا گھر کے عنوان سے شائع کیا (علی گڑھ ۱۹۲۸ء)؛ اور اس کے بعد مشہور ناول پرائڈ اینڈ پریجیڈ کو ڈس کا ترجمہ۔ ان کے علاوہ روضۃ الرضوان (۱۹۱۵ء) ۱۲ صفحہ (الہ آباد ۱۹۳۵ء)، تنقیدی سٹریہ حصہ اول (الہ آباد ۱۹۲۶ء)، تنقیدی سرمایہ حصہ دوم (گھنٹو ۱۹۵۶ء)، افانی (دلی ۱۹۴۰ء) وحسرت موہانی اور جیدید کے چند منتخب مسند و شعرا (گھنٹو ۱۹۴۳ء) شاہ علیگن حضرتی اور ان کا کلام، ان کی تصنیفات میں سے زیادہ مشہور میں حسرت موہانی سے ان کے ذاتی گہرے مراسم تھے۔ کاجور کے زمانہ قیام میں وہ اکثر ان کے ہاں آتے تھے۔ ان کی کتاب حسرت موہانی کے آخر میں کلام کا انتخاب خود حسرت کا کیا ہوا ہے۔ انھوں نے سلسلہ مطبوعات اسلامیہ گزرائی اسکول، بریلی کے عنوان سے کچھ کتابچے بھی شائع کیے تھے مثلاً گرام سدھارہ ضروری باتیں (مراحمیہ خاکے) یارانِ میکہ (دو حصے) وغیرہ اور نصاب کی پچھترہ باتیں مرتب کی تھیں، خود اکیلے بھی اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی شرکت میں بھی۔ رسالوں میں بھی لکھتے رہتے تھے، ان میں طبعاً و مضمون بھی ہوتے تھے اور انگریزی سے ترجمہ بھی۔ علی گڑھ میگزین میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ آخری مضمون "فضل الرحمن اسلامیہ کالج، بریلی میگزین" کے غالب بنر (بابت ۱۹۶۹ء۔ ۱۹۷۰ء) پر بعنوان "غالب کی انسان دوستی" چھپا ہے۔ ان کے یہ مضمون ہنوز کتابی صورت میں جمع نہیں ہوئے۔

شروع میں صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ لیکن آخر آخر میں مختلف امراض کی آماجگاہ بن گئے تھے، بلکہ ایک مرتبہ موت سے چند سال قبل حالت بہت خراب ہو گئی، تو مقامی مشین اسپتال میں علاج کے لیے داخل ہونا پڑا۔ جسم مٹاپے کی طرف مائل تھا، اس پر گھنٹوں اور گھنٹوں میں درد رہنے لگا، نمازیں رکوع و سجود سے بھی معذور ہو گئے۔ مجبوراً یہ فریضہ بھی

## تذکرہ معاصرین

بیٹھے ادا کرتے تھے۔ بہر حال موت کا ایک دن معین ہے، اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بھی درکار ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو سینے کے بائیں حصے میں درد کی شکایت کی اور یکایک جان بحق ہو گئے۔ بریلی ہی میں اپنے آبائی قبرستان واقعہ محلہ بھوڑ (شاہ آباد) میں دفن ہوئے۔ اتنا لشروالیہ راجہوں۔

اولادِ جہانی میں چھ بیٹیاں اور ایک بیٹا اپنی یادگار چھوڑی۔ بیٹیاں سب یہاں ہندوستان میں ہیں۔ اور بنیا پاکستان میں ہے، وہ وہاں کسی تنگ میں ملازم ہیں۔

## تاج، سید امتیاز علی

میری عمر کے جو لوگ آج سے ۵۰-۵۵ برس پہلے در سے میں پڑھتے ہونگے، ناممکن ہے کہ انھوں نے رکاوٹوں کا مفہم وار پرچہ پھول "اور لڑکیوں کا تہذیب نسواں" نہ دیکھے ہوں، یہ دونوں سالے دارالاشاعت لاہور کی طرف سے شائع ہوتے تھے۔ اور ان کے کرنا دھرتا تھے، مولوی سید ممتاز علی جو بعد کو شمس العلما کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔

وہ حضرت امام رضا کی نسل سے تھے۔ ان کے اجداد اوڈنگ زیب عالمگیر کے عہد میں خجارسے ہندوستان آئے۔ آئی خانہ ان میں سید ممتاز علی، ۱۸ ستمبر ۱۸۹۱ء کو دیوبند (ضلع بہار، پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ذوالفقار علی حکومت میں ملازم تھے۔ ممتاز علی خود مولوی محمد قاسم نانوتوی کے ابتدائی شاگردوں میں تھے، چنانچہ انھوں نے قرآن، حدیث، فقہ کی تعلیم ان سے اور مولوی محمد یعقوب سے پائی۔ اس کے بعد اپنے طور پر کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی۔ ۱۸۷۶ء میں وہ لاہور گئے اور کچھ ایسے کہ پھر عمر بھر کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ وہ سرسید کے گھر سے دوست اور ٹیوٹہ تھے۔ ۱۸۹۲ء میں، انھوں نے عورتوں کے لیے مفہم دار پرچہ تہذیب نسواں جاری کیا۔ اس رسالے نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ اسم باسٹنی

پرچہ ہمارے ملک کی عورتوں کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و ترقی میں بہت عمدہ معاون ثابت ہوا۔ یہ اسی کی کامیابی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۹ء میں انھوں نے لڑکوں کے لیے بھی 'پھول' جاری کیا۔ ہمارے بعض بہترین ادیب اور شاعر اسی 'پھول' کی دین ہیں۔ افسوس کہ یہ دونوں پرچے تقسیم ملک کے بعد بند ہو گئے۔

سید ممتاز علی خود بھی مصنف تھے، مجلہ اور کتابوں کے ان کی مرتبہ تفصیل البیان فی مضامین (جلد ۱) سورہ کے کی چیز ہے۔ اس میں قرآن کی مختلف موضوعات کے تحت تجویب کی گئی ہے اور یہ قرآن کے مضامین کا بہت مفید اور آسان اشاریہ ہے ان علمی اور ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا تھا۔ ان کا ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ ان کی بیوی محمدی بیگم بھی اردو کی اچھی اور بہنئیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا ۲ نومبر ۱۹۰۹ء کو شملے میں انتقال ہوا اور لاہور میں دفن ہوئیں۔

ان کے دو صاحبزادے تھے حمیدہ بیگم جلیبی بیوی سے، حمید علی اور محمدی بیگم سے امتیاز علی۔ یہی امتیاز علی ہماری زبان کے مشہور اور بہ سید امتیاز علی تاج تھے۔ مولوی ممتاز علی کے کا رہا جس خدا نے بہت برکت دی۔ لاہور میں ان کے بہت سے مکانات تھے، مطبع تھا، کچھ زرعی زمین بھی تھی۔ اس تمام جاہداد کی دیکھ بھال بڑے بیٹے سید حمید علی کے سپرد تھی، تعلیم یافتہ تو وہ ضرور تھے، لیکن انھیں تصنیف و تالیف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مکاتوں کا کرایہ اگلا بنے اور دارالاشاعت کے تجارتی حساب کتاب میں ملوث رہتے تھے۔ اس کے بالعکس سید امتیاز علی تاج کو سوائے علم و ادب کے اور کسی چیز سے سروکار نہیں تھا۔ وہ ابتدا ہی سے خاندان کے مالی معاملات سے کم و بیش کنارہ کش رہے۔

سید امتیاز علی ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کینرڈ اسکول میں پائی جو اس زمانے میں شہر میں انگریزی وضع کا ممتاز پبلک اسکول تھا۔ دسویں درجے کی سند منٹرل

## تذکرہ معاصرین

ماڈل اسکول لاہور سے ۱۹۱۵ء میں اور بی اے کی گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۲۲ء میں حاصل کی، بی اے میں انھوں نے غازی میں امتیاز (آنرز) پایا۔ مزید تعلیم غیر ضروری خیال کرتے ہوئے، وہ دارالاشاعت کے علمی اور ادبی شعبے کی نگرانی کرنے لگے، وہ تقریباً بیس صدی تک "ہندوستان" اور "پھول" کے ایڈیٹر رہے۔

انھیں نکلنے کا شوق بہت ابتدائی زمانے سے تھا۔ جب ان کا پہلا مضمون "دیگر اکبر آبادی کے مشہور رسالے نقاد" آگاہ میں چھپا ہے، تو ان کی عمر صرف چودہ سال کی تھی اور وہ نویں درجے میں پڑھتے تھے۔ ان کی پہلی مطبوعہ کتاب موت کا راگ، بھی زمانہ طالب علمی کا کارنامہ ہے، یہ بچوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے ماہنامہ "کھٹک" جاری کیا۔ یہ پرچہ جن ظاہری و معنوی کا نمونہ تھا اور اردو کے بہترین ادیب اس کے معاون اور مضمون نگاروں میں شامل تھے، تاج کوڈرے اور تمیش اور اداکاری سے شغف کالج کے زمانے سے تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈراماٹک کلب کے سرگرم رکن اور اداکار تھے۔ ان کا معرکہ آرا ڈراما "انارکلی" ہے اس کا آغاز انھوں نے بی اے پاس کرنے کے بعد کیا تھا۔ جب یہ ڈراما اگلے برس ۱۹۲۲ء میں مکمل ہوا، تو تاج نے اسے آغا حشر کو سنایا۔ آغا حشر دن ۱ اپریل ۱۹۲۵ء کا ڈرامے کی دنیا میں جو مقام تھا اور ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو "ٹیکسیرینڈ" لکھا کرتے تھے، حشر نے انارکلی کو دیکھا اور سنا تو بہت خوش ہوئے اور کہا: (ماضی ملاحظہ ہو)۔

۔ میں سمجھتا تھا کہ حشر کے بعد ڈراما ختم ہو جائیگا، لیکن اور دو ڈرامے کے بہادری

دن تو اب آ رہے ہیں :

یہ ڈراما مکمل شکل میں پہلی مرتبہ دارالاشاعت کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ ظاہری شکل و صورت میں بھی یہ استاد یہ ادیب تھا کہ جس نے دیکھا، شش، شش کر اٹھا۔ حکومت پنجاب نے اس پر انعام دیا اور یہ کتاب مدتوں بی اے ایم اے اور مشرقی علوم کے امتحانات میں

بلوچ نصاب شامل رہا۔ تاج ایک زمانے تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے اور آذادی ملک کے بعد پاکستان ریڈیو کے توگیا بانوں ہی میں تھے۔ دونوں جگہ انھوں نے ڈراما کی قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ انھوں نے اسی شوق کی تسکین میں اردو کے کلاسیکی ڈرامے کی ترتیب بتدوین ہاتھ میں لی۔ ان ڈراموں کی تلاش کے سلسلے میں وہ چند برس جوئے، منہ نہان بھی آئے تھے۔ جہاں سے بھی انھیں یہ ڈرامے ملے، انھوں نے حاصل کیے۔ اگر ملک نے کتاب (پاکنام) الگ کرنا منظور کیا، تو اس کی نقل کروائی، اس کے بعد انھوں نے ان ڈراموں کا متن صحیح کیا، ان پر روشنی رکھی اور انھیں اپنے تنقیدی تبصرے کے ساتھ شائع کر دیا۔ اردو میں ڈرامے کو کبھی قابل اعتبار سمجھا گیا خود ڈراما نگاروں نے بھی اپنی تعینفات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ڈرامے شائع بھی ہوئے وہ خود مصنف کی تصحیح اور نظر ثانی سے محروم رہے۔ قصہ مطلوبہ ڈرامے جینا قصص، اور ان کا متن بید غلط تھا۔ اس لیے جب تاج نے ان ڈراموں کو موبو عیارِ صحت متن و تنقید کے بعد شائع کرنے کا فیصلہ کیا، تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنا جان جو حکم کا کام تھا۔ لیکن ان کے مصروف مشغول کی عذر دینا چاہیے کہ ان سب مشکلات کا باوجود جہت نہیں ہارے۔ انھوں نے ان ڈراموں کو تیس جلدوں میں تدوین کیا، اور ان میں سے چند جہت ذیل لکھائی کی ڈراما نویسوں کی تخلیقات سات جلدوں میں شائع کر دیں،

(۱) سبھی میں اردو کا پہلا ڈراما۔ خورشید صبح اور دو دھامے کا تاریخی جائزہ؛ (۲) آرام کے ڈرامے (دو جلد)؛ (۳) نظریات کے ڈرامے؛ (۴) اردو فن کے ڈرامے (جلد)؛ (۵) حباب کے ڈرامے۔ سات مزید جلدیں بطبع کے لیے تیار تھیں۔ بقیہ جلدوں کا مواد جمع تھا اور ان کے لیے یادداشتیں بھی تھیں۔ انہیں کہ ان کی ناگہانی موت کے باعث یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ ان کی سی نظر اور تجربے کا آدی کہاں ملے گا کہ اسے پورا کر سکے :

ڈراموں کے علاوہ انھیں افسانہ اور محو رتوں اور نچوں کے ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے، خدا بھوٹ نہ بلوائے محو رتوں اور نچوں کے لیے کوئی سوتلی بیوی تو ضرور رکھی ہوگی جیسا کہ

اور ذکر ہوا "ان کی سب سے پہلی کتاب موت کا دھمکا، ابھی بچوں کے لیے تھی۔ ان کتابوں کی فکر تعلیم نے بھی قدر کی، ان میں سے بیشتر نصاب یا معاون نصاب قرار پائیں۔

افسانے سے دلچسپی کے باعث ہی انھوں نے کہکشاں جاری کیا تھا۔ اس میں وقت کے بہترین افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہو کر تے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مشہور انگریزی مزاح نگار جیمز کے ایک خاکے (This man is a Boat) سے متاثرہ کے مشہور اخبار نیرنگ خیال لاہور کے لیے ایک ہلکا پھلکا مزاحی افسانہ لکھا، چچا چکن نے تصویر بنائی۔ اس کے بعد انھوں نے اسی رنگ کے چند طبع آزمائی کے اور بھی لکھے۔ یہ سب "چچا چکن" کے عنوان سے ایک تیلی ہی کتاب میں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تیلی ہی کتاب (مشکل صفحات) کئی ضخیم کتابوں اور مجموعوں پر بھاری ہے۔ جس طرح سرشار کے افسانہ آزاد کا کردار خودی جہاں سے ادب میں ضربا شل کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح تاج صاحب کا کردار چچا چکن ہے۔

ابتداء میں تاج نے کئی انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے جن میں ٹیکسیر کا ڈاڈا، ستر شش، ایم لاڈلین کا ایلا یا اصر، غرناطہ خاص اور قابل ذکر ہیں۔ کسی زمانے میں لاڈلین کی اس کتاب کا ترجمہ جسٹس محمود (خلف سرید مرحوم) نے تہذیب الاخلاق کے لیے شروع کیا تھا۔ لیکن چند قسطوں کے بعد یہ سمجھ کر اس سے ہاتھ اٹھا لیا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے، تا کہ ترجمہ پوری کتاب کا ہے۔

انھوں نے سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کی شرکت میں حلاج بنارڈ شا کا ڈاڈا، امرانہ دی میں ٹی، ایس ایلٹ لکھا The Man at the Popomack. کیرل چپیک کی R. U. R. اور متعدد ایک ایکٹ کے ڈرامے اور میں منتقل کیے اور پھر انھیں کھیلے۔ ان کے علاوہ دیگر جیوگ، ایڈ گرائین پو، آسکوڈ ایڈ اور کئی اور یورپی اور امریکی مصنفوں کی نگارشات کے ترجمے بھی ان کے مرہونِ منت ہیں، پوری فہرست کہاں دی جاسکتی ہے!۔



یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ تاج ان کا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے نہ نثر لکھتے تھے۔ ان کی والدہ انھیں پیار سے تاج کہہ کر پکارتی تھیں جو گویا امتیاز کی تحریف تھی۔ رفتہ رفتہ گھر کے سب لوگ اور پھر ان کے احباب بھی انھیں ہی عرف سے پکارنے لگے اور بالآخر انھوں نے خود بھی اسے اپنے نام کا جزو بنالیا۔

ان کی بیگم اردو کی مشہور افسانہ نگار حجاب ہیں جو شادی سے پہلے حجاب سمیٹل کے نام سے تھکتی رہی تھیں۔ اولاد جسمانی میں صرف ایک لڑکی (پاسین) ہوئی۔

وہ پچھلے دس برس سے لاہور کے مشہور ادارے انجمن ترقی ادب کے ڈائریکٹر تھے۔ اس ادارے کی طرف سے اردو کا کلاسیکی ادب جس اہتمام اور آہٹے تاب سے شائع ہوا ہے، اس کے لیے بہت حد تک خود تاج صاحب ذمہ دار تھے۔ حکومت پاکستان نے ان کی گونا گوں علمی اور ادبی اور تہذیبی خدمات کے صلے میں انھیں ستارہ امتیاز کا تمغہ عطا فرمایا، جو ان کے نام کی مناسبت سے گویا انھیں کے لیے وضع ہوا تھا، اس کے علاوہ اعلیٰ ادبی کارکردگی کا انعام بھی ملا تھا۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۶۸ء میں ہوئی جب میں انٹر کے بعد مزید تعلیم کے سلسلے میں لاہور چلا ہوں۔ لگبھگ تھاکہ میں تندرہج جہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں پہنچتا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور چونکہ وہ ان حلقوں کے کئی سرسبد تھے، لہذا ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد میں ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء سال گزرا مئینڈی میں کرایے کے مکان میں مقیم رہا تھا۔ یہ مکان انھیں کی جادا کا حصہ تھا۔ اسی محلے کی پشت پر دیوے روڈ ہے، جہاں دارالاشاعت کا دفتر اور ان کے خاندان کے کوئٹی مکان تھے۔ اس زمانے میں بھی ان سے ملنا جلتا رہا۔ ان سے مل کر دل مشرب ہوتی۔ ان میں ہمیشہ علمی وقار اور علم دوستی کی طناری کا جذبہ پایا۔

انھوں نے کہ علم و ادب کے اس دیرینہ خادم کا انجام بہت المیہ تھا کہ ۱۹۸۰ء پر طبعی کی مشب میں دونوں میاں بیوی اپنے مکان کی چھت پر سو رہے تھے کہ دو نقاب پوش شخص آئے اور انھوں نے تاج صاحب پر تھانکنا حملہ کر دیا۔ آواز سے بیگم بھی جاگ اٹھیں اور انھوں نے بچ بچاؤ

## تذکرہ معاصرین

کی کوشش کی، لیکن بیہودہ۔ دونوں میاں بیوی زخمی ہو گئے۔ تاج صاحب کو بالخصوص ہیبت  
دخم آئے۔ اسی حالت میں انھیں اسپتال پہنچایا گیا۔ علاج معالجے میں کوئی فروگزاشت  
نہیں ہوئی، لیکن موت سے کس کو مستحکامی ہے؟ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکے اور  
اگلے دن (۱۱ اپریل) سہ پہر کو جان بحق ہو گئے۔ اٹالشیڈ اٹا ایلیرا چوون۔

جنازہ، کواٹھا اور انھیں مومن پورہ (سیکلوڈ روڈ) کے قبرستان میں اپنی والدہ محمدی بیگم کے  
پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ کلب علی خان فائق کی بھی ہوئی تاریخ ہے:

کہو با آہ سال رحلت تاج

تاج خلد بریں میں جا پیئے

۶ + ۱۳۸۳ = ۱۳۹۰

## شکیل بدایونی اشکیل احمد

۳ اگست ۱۹۱۶ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غفار احمد تھا جس سے سنہ ہجری ۱۳۳۴ (مذہب شوال) برآمد ہوتا ہے۔ ان کے دادا منشی ہدایت اللہ سوختہ محلہ سرے میں ملازم تھے اور اسی جگہ سے سکھ دس ہوئے۔ ان کے دیکھنے والے ان کی کدنگی، خوش مزاجی اور دینداری کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کا خاندان سوختہ کہلاتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں کوئی صاحب آگ سے جلے ہوئے تھے، اسی سے یہ نام چڑا۔ اس سے ایک بات یاد آگئی، کانٹوڑیس کے لیڈروں میں ایک صاحب نظر علی سوختہ ہوئے ہیں، وہ بھی اسی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد منشی مبارک علی سوختہ پنڈت موتی لال ہنرو مرحوم کے بھترہ تھے اور آئندہ بھون، ادا آباد میں رہتے تھے۔ پنڈت جی ان پر بہت مہربان تھے اور ان کے خاندان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ منظر علی کی تعلیم و تربیت بھی بہت حد تک پنڈت جی کی مرہونِ ہمت تھی۔

شکیل کے والد مولوی جمیل احمد قادری سوختہ نے مدرسہ العلوم بدایوں میں تعلیم پائی۔ ان کے دماغ میں بڑی کشش تھی، چنانچہ دورہ دور سے ایسے دعوتِ فقر پر یقین پستی رہتی تھی۔ اسی سے ان کے سہمی میں بہت لوگ قدروان ہو گئے۔ اور باآ خود مستقل طور پر نقل مکان کر کے وہاں

چلے گئے۔ یہاں وہ کم و بیش اٹھارہ سال تک خواجہ اہلسنت (خوجہ ستی) مسجد میں پیش امام اور خطیب کے منصب پر کام کرتے رہے۔ یہ ان کی اسی مذہبیت کا نتیجہ تھا کہ ٹیکس کی ابتدائی تعلیم بھی اور دو فارسی اور عربی تک محدود رہی اور وہ اس سلسلے میں کچھ زمانہ اپنے والد کے پاس بھی میں بھی رہے۔ یہ مراحل طے ہو گئے تو انھیں مشن اسلامیہ ہائی اسکول شیخوپورہ ویدیا میں بھیج دیا گیا یہ اسکول اب حافظہ صدیقی اسلامیہ انٹر کالج کہلاتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں یہاں سے دسویں درجے کی تکمیل کی اور اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

۱۹۳۹ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کی مالی حالت بہت سیکم ہو گئی، لیکن مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری اور قیصر حسین قادری کی دھمکی اور داؤد بھائی فضل بھائی ٹرسٹ (بھائی) کے ذیلی نے یہ مشکل آسان کر دی۔ چنانچہ انھوں نے تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۴۲ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مرکزی حکومت ہند کے محکمہ ہنڈلاری میں کلرک بھرتی ہو گئے اور وہ یہاں دہلی میں ۱۹۴۶ء تک رہے۔

ان کا دلی کے قیام کا زمانہ دوسری جنگ عظیم کے متوازی ہے۔ حکومت کو لوگوں میں امن و فضا پیدا کرنے اور انھیں جنگ میں حصہ لینے پر بھادنے کی خاطر طرح طرح کے پارٹیاں پڑے تھے۔ انھیں میں ایک سانگ پبلیش کا محکمہ تھا۔ اس کے کرتا دھرتا مشہور شاعر حفیظ جالندھری تھے۔ یہ محکمہ شہر بشہر اور قریہ بقریہ ملائے سمیتا رہتا تھا، جہاں ڈرامے تو ایسا شاعرے لگانے بجانے کا پروگرام ہوتا۔ لوگ جمع ہوتے اور تفریح کے پردے میں انھیں جنگی سامع سے سہرہ دی کا سبق سکھایا جاتا۔ اس زمانے میں شکیل نے بھی بہت نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ اس سے ان کی شہرت اور مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔

شکیل اسم بھمنی تھے، شکل و صورت اچھی تھی اور آواز بھی دلکش پائی تھی۔ شر خوب پڑھتے تھے اور سننے والے اس کی تعریف کرتے تھے۔ اکثر حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام پڑے جوش و خروش سے سنایا کرتے تھے۔ یہ ان کے لیے پسندوار کام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

انھیں خود بھی شاعری سے دلچسپی تو بہت دن سے تھی، لیکن اس سے صحیح شغف علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں پیدا ہوا۔ یہ وہ دور ہے، جب جگمراؤ آبادی مرحوم کا ڈمکانج رہا تھا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے محققوں میں بہت ہر دلچزین تھے، یہاں اکثر آتے اور مہینوں مقیم رہتے۔ اسی زمانے میں شکیل ان کے ایک شاگرد اور آدمہ آبادی کی وساطت سے جگر کے زیر اثر آئے۔ وہ اس سے پہلے اپنے والد کے جگری دوست مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری سے مشورہ سخن کرتے رہے تھے۔ ضیاء القادری تفصیل بدایوں میں ناظر تھے۔ ان کے تعلقات شکیل کے والد مولوی جیل احمد سے اتنے گہرے اور غلط فہم تھے کہ عام لوگ انھیں بھائی بھائی خیال کرتے تھے۔ شکیل بھی انھیں چمکھ کر پکارتے تھے۔ ضیاء خود مولوی علی احمد خان اسیر بدایونی (پروفیسر عربی و فارسی سینٹ جانس کالج، آگرہ) کے حقیقی بھائی اور شاگرد تھے۔ دونوں ماموں بھائی نے نصرت رسول صلیم بکھتے تھے۔ ضیاء کی بلا مبالغہ سینکڑوں نعیم میری قلم سے گزری ہیں۔ ان کی مرتبہ اکمل انیس چھپ چکی ہے (بدایوں ۱۳۳۲ھ) اس کے دو حصے ہیں۔ دراصل یہ انھوں نے اپنے مرشد مولانا فضل رسول کی سوانح عمری کے طور پر لکھی تھی اس کے پہلے حصے میں بدایوں کے اہل دل اور اہل علم کا بہت اچھا تذکرہ محفوظ ہو گیا ہے اور دوسرے میں مولانا فضل رسول کے مفصل حالات ہیں۔ ضیاء صاحب پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں کچھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی کر رہا تھا۔ معلوم نہیں ہنوز حیات ہیں یا اپنی منزل آخر کو روانہ ہو گئے، جہاں ہم سب کو ایک ذلیق دن جانا ہے۔ ادھر دو تین برس سے ان کی کوئی چیز بھی نظر سے نہیں گزری۔ بشرط حیات وہ اس وقت ۹۰ کے پیشے میں ضرور ہونگے۔

ایک تو شکیل کا اپنا خاندان ہی مذہبی خیالات کا اور استاد قادریہ کا مریض و متفقد تھا، اس پر ضیاء القادری کا تلمذ گویا سونے میں سہاگ ہو گیا۔ خود شکیل نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

بارگاہِ فیض تعلیم ضیاء نے لے سکیں!

خود بخود رنگِ تفرل عارفانہ ہو گیا

ایک اور شعور میں کہتے ہیں :

نقطہ غلط آج پر فیض جیسا ہے اسے شکیل

رفتہ رفتہ شاعر کا دل ہوا جاتا ہوں میں

جنگ کے کسی کو اپنا باقاعدہ شاگرد نہیں بنایا، اگرچہ ان سے کئی اصحاب نے وقتاً فوقتاً استفادہ ضرور کیا۔ شکیل بھی اسی گروہ میں شامل تھے جنگ کے اس تعلق سے انھیں یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ جلد اور آسانی سے ادبی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ اور باہر کے شاعروں میں بھی شریک ہونے لگے۔

فروری ۱۹۴۶ء میں شکیل ایک شاعر کے سلسلے میں بھی گئے۔ یہاں ان کی مشہور فلسفہ ساز مکتبہ کا مدار سے ملاقات ہوئی۔ وہ شکیل سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان سے اپنی بعض غلوں کے لیے گیت لکھنے کی فرمائش کی۔ یہ دعوت شکیل کی زندگی کا موثر ثابت ہوئی۔ ان کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش تھی۔ اس زمانے میں وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ان کا شاہرہ صرف ساٹھ روپے تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے کا مدار کی فرمائش یہ کہہ کر رو کر دی کہ جب تک ملازمت میں ہوں، میں کوئی پرائیویٹ کام نہیں کر سکتا۔ اس پر کا مدار کا اصرار بڑھا۔ بالآخر انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کا مدار کی چار سو روپے کی پیش کش قبول کر لی۔ خوش قسمتی سے انھیں ایک اور طرف سے بھی کمک ملی۔ مشہور موسیقار ڈاکٹر سید نوشاد علی نے اعلان کر دیا کہ آئندہ وہ صرف شکیل کے لکھے ہوئے گیت لکھائیں گے۔ سب سے پہلی فلم ”درد و امید“ شکیل کے گیتوں اور نوشاد کی موسیقی کی دھوم مچ گئی، جس نے کامیابی اور بڑے ترقی کے تمام دروازے کھول دیے۔ شکیل نے اپنی زندگی میں سو سے زیادہ فلموں کے لیے گیت لکھے۔ اس میں کوئی شہرہ نہیں کہ وہ اس میدان میں بہت کامیاب رہے۔ انھوں نے ”درد و امید“ کے علاوہ ”پروہی زبان میں بھی گیت لکھے۔ لکھے کو تو فلموں کے لیے گیت بھی لکھے اور اس گروہ میں چار سے بعض صنفِ اول کے شاعر بھی ہیں۔ لیکن ایک بات کا اعتراف

ضروری ہے کہ بیشتر دوسرے حضرات کی طرح شکیل نے اپنے گیتوں اور نغموں میں اجماع اور سویت کا نظا ہر کبھی نہیں کیا، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ بہت حد تک ان کے گیتوں میں ادبیت اور ہندی شاعری کا چاؤ ملتا ہے۔ انھوں نے اس سے بہت روپیہ کمایا۔ بھی میں ان کے دو دو مکان ذاتی ملک کے تھے۔ اولیٰ دنیا نے بھی ان کی بہت قدر کی۔ ابھی پانچ سال غالب صدی تقریباً تھ کے دنے میں گورنر نیو پی (شری گوپال ویدی) نے ان کے وطن باریاں میں شکیل روڈ کا افتتاح کیا تھا۔ تین چار سال ہوئے؛ بھی اور دتی میں خالصے بڑے چانے پرچہ شکیل منایا گیا تھا۔ اور اب ایک اور جشن کی بھی میں داغ بیل چڑھ چکی تھی کہ موت کا بلاوا آگیا۔

وہ بھی کے متاثر شہری تھے وہاں کی اولیٰ سرگرمیوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انھیں شاعر کہنے کا بھی شوق تھا، بالعموم یا تو اس کی صدارت کرتے یا افتتاح، غرض عجیب باغ دیبا شخصیت تھی۔

شکیل کو بہت دن سے ذیابیطس کی تکلیف تھی، یہ مرض انھیں ورثے میں ملا تھا، ان کے لڑے مولوی جیل احمد کا بھی ۱۹۳۶ء کو بھیج میں اسی موزی مرض سے انتقال ہوا تھا۔ جنتی سے شکیل کو ذیابیطس کے ساتھ تب دق کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔ تب دق عام حالات میں بہت ہلک نہیں رہتا، لیکن ذیابیطس نے انھیں بہت کمزور کر رکھا تھا، جس سے تب دق کا بھی ٹھیک سا علاج نہ ہو سکا، جبکہ آخری ایام میں گلے میں بھی کچھ شکایت پیدا ہو گئی تھی اور بعض لوگوں نے اس پر کینسر کا شبہ کیا ہے۔ غرض پوری دوا و دوش کے باوجود حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ۲ اپریل ۱۹۷۷ء صبح کے وقت انھیں خون کی تہ ہوئی، جس پر بھی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن وقت یقین آگیا تھا، علاج معالجے کی اب کیا گنجائش تھی؛ اسی دن وہیں ہسپتال میں سرپرہ کر ساڑھے چار بجے انتقال ہو گیا، لاش مکان پر آئی۔ عشا کے بعد جنازہ اٹھا، اور سینکڑوں دوستوں، انداؤں، ہماروں اور سوگواردوں نے

تذکرہ معاصرین

انہیں گیارہ بجے شب باندھ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا خدا مغفرت کرے۔ کئی دوستوں نے تاریخ وفات کہی ہے۔ ساجد صاحب نے عیسوی تاریخ کہی، غلام شاہ صاحب نے (۱۹۶۰ء) ہجری میں ۵۲ کے قہر کے ساتھ ہے:

’حیدر کے نام کا جو سہارا زرا ملا

ہے غلام میں قیامِ جانبِ شکیل کا

منشی ہریت اللہ سوختہ کے دو بیٹے تھے: ایک مولوی جلیل احمد سوختہ یعنی شکیل کے والدِ بزرگوار سے ان سے بڑے منشی حضور احمد جن کی بیٹی ریاض تولد مولوی قیصر حسین قادری کے عقد نکاح میں تھیں (ان کا اوپر ذکر ہوا ہے) انہیں قیصر حسین کی صاحبزادی ’سلما‘ سے شکیل کی شادی ہوئی تھی (۱۹۳۶ء) اپنے پیچھے پانچ بیٹے، تین لڑکیاں (رضیہ، صفیہ، نجمہ) اور دو لڑکے (عباد، طارق) اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

مرحوم کے پانچ شری مجھے شائع ہو چکے ہیں۔ رعنائیاں (دلی ۱۹۴۴ء) صنم و حرم (دہلی ۱۹۴۶ء)، انگیناں (لاہور ۱۹۴۹ء) اور شبستان (لاہور ۱۹۵۰ء) نغمہ فردوس (دہلی ۱۹۴۹ء) نعمتوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی سوانحی بھی مرتب کر لی تھی، جو سنہ دہلی پہنچی نہیں۔ خدا نہ کرے، اس کا مسودہ کہیں ضائع ہو جائے:

اب چند شعر دیکھیں

حالِ دل، احوالِ غم، شرحِ تنہا عرضِ شوق	بجودی میں کہہ گئے، افسانہ و افسانہ ہم
پارسائی، خندہ زون، اودھ، خلافتِ طہذیب	لے لے کس مشکل سے پہنچے، اتار دے سینا دہم
آگے، خدا ہی جانے، انجا ہم عشق کیا ہر	جب اے شکیل! اپنا یہ حال ہے ابھی کہ
درمہل، آدمی نہ سمجھا اُسے مشکل!	جو آدمی دنیا نہ کرے، آدمی کے ساتھ
’ابہرکی‘ نہ منکر منزل کی	کر نام ہوں میں پیر دی دل کی

مے دل نے مجھے ’غربت میں‘ شکیل ہی یہ کہہ کر کہہ دیا  
وہ منزل ہے ’وہ گریہ‘ رواں معلوم ہوتی ہے



تذکرہ معاصرین

ہر ایک عنوانِ دردِ فرقت ہے ابتدا شرحِ تدعا کی

کوئی بتائے کہ یہ فائدہ سنائیں ان کو کہاں سے پہلے

قسم فریبِ نگاہِ دہل کی، ہیں تو اس جستجوئے کھویا

وہیں تھی وہ اہل اپنی منزل، قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے

ازل سے شاید دیکھے ہوئے تھے انکیل: قسمتِ جتنی بہیم

کھلیں جو آنکھیں اس انجمن میں، نظر ملی آسماں سے پہلے

بے تعلق ترے آگے سے گزر جاتا ہے یہ بھی اک حزنِ طلب ہے ترے دیوالے کا

مجھ احبابِ دارِ بابِ دفا مجھ احباب ہے ترے غیر

دھنائی بہارِ گل و گلستاں گئی وہ کیا تجھے کہ وقتِ بزمِ جہاں گئی

غم ہو کہ بضاطہ کسی کو نہیں قرار فصلِ بہار آئی، تو فصلِ خزاں گئی

دل بے نیازِ آرزوئے اشفات ہے شاید اسی کا نام سکونِ حیات ہے

وہاں حیرت کہ بھری عقل میں بعد کو تہا نظر آتا ہے کوئی

چاہے خود یہ یقینِ کامل حوصلہ کس کا بڑھاتا ہے کوئی

لمحاتِ یادِ دوست کو صرف دھندل آتے ہیں زندگی میں یہ عالم کبھی کبھی

فریبِ دفا، وعدہ ہے سلسل بھی پر یہ مشقِ عنایات کیوں ہو

اب صرف تکلم ہیں تو نظریں ہیں کہیں اور ان باتوں سے جو تپا ہے، محبت کا یقین اور

وہ بھی دل گرفتہ ہیں اپنی کیا کہوں ناصح! مجھ سے گھٹکا کرنا، ان سے گھٹکا کر کے

ہزار قیدِ خواں سے بچت کر، بہار کا آسرا کر چلے

بہار بھی تم نفسِ زودوں کو نہ اس آئی، تو کیا کرینگے

جہاں کی نیرنگیوں سے بھر بدل گئی آشاں کی صورت

نفس سمجھتی ہیں جن کو نظریا، وہ درحقیقت نفس نہیں ہے

## تذکرہ معاصرین

جمن کی آزادیاں موقوفہ، تصور آستیاں مقدم

غم اسیری ہے نامکمل، اگر غم خار و خس نہیں ہے  
ذکر بچے شرمسار، ناصح! میں دل سے مجبور ہوں کہ جبر کا

بے یوں تو کون دسکان پہ قابو، مگر محبت پہ نہیں ہے  
اڑائی و اعطائے چھپ کے بہیم، چڑھائی رنڈوں نے مل کے بہیم

یہاں تو یہ سوچتے ہی گزری کہ بادہ نوشی حرام کیوں ہے؟  
تذکرہ عنوان: حرفِ مطلب، ادھر خوشی، اُس طرف تغافل

تو پیرہ افسانہ، محبت زباں زد خاص و عام کیوں ہے؟

دل نے غم سے شکست پائی ہے	عبر رفتہ تری دہائی ہے
میرے معبد نہیں ہیں دیو و دھرم	احتیاطاً جہیں جھکائی ہے
وہ ہوا دے رہے ہیں دامن کی	ہلے، کس وقت غیند آئی ہے
مغل فسرہ، جمن اداس، شکیل!	یوں بھی اکثر بہا ر آئی ہے

کلوا دیاں کی سیاست ہے، ناکا و وجہ	آدمی کام کا ہوتا، اگر انساں ہوتا
کھل گیا تجزیہ غم سے ہر اک دازبجیات	زیست بہیم کھیں، اگر دل نہ پریشاں ہوتا
تو نے سوچا کبھی 'دامن کو بچانے والے'	کچھ سکھاتھ میں ہوتی، تو یہ داماں ہوتا

سچی تشریح آرزو کی نسیم!	محریم آرزو، نہ تم، نہ ہم
سوچ انفاں ز اداں، تو بہ!	بجھ نہ جائے کہیں چراغِ حرم
دل کو نہ ہوگی تباہ غم بے تو چھی	لٹا، داستانِ محبت نہ پر چھی

تذکرہ معاصرین

یوں دیکھتے ہیں، جیسے ادھر دیکھتے نہیں اس لطفِ بے طلب کی نزاکت نہ پوچھے

---

کیسی بہار، کس کے ستارے، کہاں کے پھول  
جب تم نہیں، تو دیدہ و دل میں سائے کون  
ذوقِ عمل نہ ذوقِ جنوں، ہر طرف سکون  
جنت اگر یہی ہے، تو جنت میں جانے کون!

---

ذوقِ لطیف و چشمِ حقیقت نگہ کہاں! حسنِ ازل تو عام ہے، حسنِ نظر کہاں!

---

اے شکیل، ان کی محفل سے جاتے تو ہو اور اگر دل نے پوچھا، کہاں چل دیے؟

---

## منور لکھنوی، نشی بٹیشور پر شاد

منور صاحبین کا ۲۴ مئی ۱۹۷۰ء کی صبح دلی میں انتقال ہو گیا، پستین شاعر تھے۔ بٹیشور  
 ملاحظہ ہو، نشی اودے راج مطلع لکھنوی  
 نشی ایشور پر شاد شاعری لکھنوی  
 نشی پورن چندا ڈوہ لکھنوی

النشی رام سہائے متی لکھنوی      نشی اس پر شاد نیاں لکھنوی      نشی ڈاکٹر لالہ لکھنوی  
 (د ف ۱۹۳۲)      (ف ۱۹۳۸)

نشی بٹیشور پر شاد منور لکھنوی

یہی نہیں، نشی جگد مہا پر شاد قیصر لکھنوی ان کے ماموں تھے اور مشہور تاریخ نگار اور نقاد ہی گو  
 نشی لکھن پشاد صدر لکھنوی ان کے غسر۔ اگر ان حقائق کے پیش نظر منور کے بچا:

شاعری سے منور کو جو کیونکر رغبت

پانچ پشتوں سے ہی شوق چلا آتا ہے

تو یہی کوئی کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے مبالغہ کیا، یا غلط لکھا؟

منور سکینہ کا نسل خانہ ان کے فروختے۔ ۸ جولائی ۱۸۹۷ء کو اپنے آبائی مکان محلہ نوبستہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان سے بڑے ایک اور بھائی تھے، بابو رام شنکر پرشاد۔ وہ بھی خاندانی روایات اور ماحول کے زیراثر صحافت اور شروعاتی میں دھیمی پیتے تھے۔ تعلیم کے بعد اودھ اخبار (دکھن) کے شعبہ ادارت میں ملازم ہو گئے تھے، اور ایک اپنا مفتہ دار اخبار تفریح بھی شائع کرتے تھے۔ بد قسمتی سے وہ یکایک فردی ۱۹۱۳ء میں پلنگ کا شکار ہو گئے۔ ان کے علاوہ دو چھوٹے بھائی اور تھے اور ایک بہن۔

منور کے والدین بڑے پرگوشا اور ادیب تھے۔ انھوں نے ہماری زبان کی جو خدمت کی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ قسمی سے انھیں شراب نوشی کی نامزدگی تھی۔ اگرچہ ان کی آمدنی زچے اور صحافت سے، اچھے شریفانہ خرچ کے لیے کافی تھی، لیکن جس بلا کے وہ چنے والے تھے، یا کے لیے یہ کسی طرح کفالت نہیں کر سکتی تھی۔ بڑا بیارام شنکر پرشاد ان کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہوا تھا کہ وہ بھی جو انارنگی کا داغ دے گیا۔ اس حادثے کا منور صاحب کی تعلیم پر بہت ناخوشگوار اثر پڑا۔ اس وقت یہ آنکھیں درجے کا امتحان دے چکے تھے۔ لیکن اب گھر کی مالی حالت اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ یہ آگے تعلیم جاری رکھ سکے، لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مصیبت اکیلی نہیں آتی، ابھی خاندان کے حواس نام نہن پرشاد کی بیوقت موت کے صدمے ہی سے ٹھکانے نہیں آئے تھے کہ اس کے ۸ مہینے بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء کو خود افاق بھی بعمر ۱۱ سال انتقال کر گئے، جس سے وہ رہا سہا آمدنی کا ذریعہ بھی منقطع ہو گیا

یوں کم عمری میں پورے خاندان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری منور صاحب کے کمر و کمر چوہ پر آ پڑی۔ ان کی عمر اس وقت ۱۱ سال کی تھی۔ بہت مزاں آمد خدا! یہ اودھ اخبار کے نام نہن تو اپنے بھائی کی وفات کے بعد ہی مقرر ہو گئے تھے، اب انھوں نے کوشش کر کے دلیہ کے حیات کے دفتر میں عارضی ملازمت کرنی (ستمبر ۱۹۱۳ء) شاہرہ ۱۸ ڈپے مقرر ہوا۔ خوش قسمتی سے ٹھکانے دن بعد یہ ملازمت مستقل ہو گئی۔ اسی ملازمت کے دوران میں انھوں نے ۱۹۱۹ء میں پراسیٹ

امتحان دے کر دسویں درجے کی سند حاصل کر لی، اس سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ لیکن انھوں نے ذاتی مطالعے اور محنت سے اپنی استعداد میں بہت اضافہ کیا اور فارسی اور سنسکرت میں بھی اتنی اچھی لیاقت ہتیا کر لی کہ بعد کے زمانے میں وہ ان زبانوں کی کتابیں باسانی ترجمہ کرتے رہے۔

منور صاحب عمر بھر دیوبند کے اسی محلہ سے وابستہ رہے اور مختلف مقامات (لاہور، کھنؤ، دلی وغیرہ) بتا دے پر گئے۔ آخری مرتبہ وہ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں دلی آئے اور اس کے بعد یہیں کے ہو رہے۔ یہیں سے جنوری ۱۹۵۷ء میں ملازمت سے نشپن پر سکد و ش ہوئے۔

انھیں شعر و سخن سے دلچسپی بہت ابتدائی زمانے میں پیدا ہو گئی تھی اور ہونا بھی چاہیے تھی۔ مگر کی فضا میں اس کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ شروع میں ان کا کلام اپنے بڑے بھائی کے پرچے، تقریج اور ادوار اخبار میں چھپتا رہا۔ اس کے بعد ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں بھیجنے لگے۔ ان کے چچا منشی رام سہاے متا بھی ایک مامور پریچر دارو اشائع کرتے تھے؛ اس میں نظم و نثر دونوں ہوتی تھیں۔ منور صاحب کتابوں کے مشہور ناچر لاگت میں گزین اینڈ سنز کے ملازم تھے اور اسی باعث بیشتر دورے پردلی سے باہر ہوتے تھے۔ پرچے کی دیکھ بھال اور ترتیب و تدوین میں ان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر گواری سہاے اور منور صاحب کے پسردہلی۔ نر کا حصہ ڈاکٹر صاحب دیکھتے اور نظم کا منور صاحب۔ ان کے ایک عزیز دوست شیونرائن بھٹناگر دلی کے مشہور روزنامہ تیج کے ایڈیٹر تھے۔ منور جب دلی آنے تو ان کے اصرار پر باقاعدگی سے اپنا کلام تیج کو دیتے رہے کئی سال بعد شیونرائن نے تیج کی ملازمت ترک کر کے اپنا ہفتہ وار اخبار بھارت جاری کر دیا اور پھر ۱۹۳۷ء میں ایک روزنامہ بھی دہلی کے نام سے چھاپنے لگے۔ منور صاحب کا کلام ان دنوں میں بھی چھپتا رہا، بلکہ کئی سال تک وہ دہلی کا فن کا ہیہ کالم کچھ نہ کچھ کے عنوان سے بھی لکھتے رہے۔

دلی میں پنڈت امر ناتھ ساحر کی شخصیت ایک ادبی ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہر ماہ اپنے زیر اہتمام مشاعرہ کرتے تھے جس میں اردو اور فارسی دو مصرعہ طرح دیے جاتے تھے۔ شاعر شعرا کے علاوہ باہر سے بھی اساتذہ کو شریک کی دعوت دی جاتی تھی۔ جب منور دلی آئے تو وہ ان مشاعروں میں جانے لگے۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے اردو کے ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی شروع کی۔ اردو میں اگرچہ شروع میں انہوں نے چند سے اپنے والد اور بھتیجہ چمنی رام ہائے قتل سے مشورہ کیا، لیکن صبح معنوں میں وہ ۱۹۱۵ء سے نشتی نسبت رائے نظر اف اپریل ۱۹۲۳ء سے اصلاح فیتے رہے۔ اب فارسی کا شوق ہوا، تو اس میں اسے مدد دینا بلی فراقی دیو آبادی سے مشورہ کرنے لگے۔ منور کا فارسی کلام (طواف عجم) بقدر ایک دیوان کے صحیح ہے، لیکن اس کے چھپنے کی نسبت نہیں آئی۔ کچھ کلام ہندی میں بھی ہے۔

منور کو ہندی، سنسکرت، فارسی تینوں زبانوں پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ اور انہوں نے اردو ادب کو نوبل لینڈ تاجم الامال کرنے میں استعمال کیا۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس میدان میں کوئی ان کا حریف و ہم نہیں تھا۔ آخر میں ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی فہرست دی جا رہی ہے، اس سے آپ اندازہ لگانا چاہیں گے کہ اس پہلو سے ان کی خدمات کتنی وسیع اور پائیدار ہیں۔

میں انہیں ۱۹۳۷ء سے جانتا تھا۔ چونکہ اس کے بعد میرا کوئی نوے سالہ صدی کا زما د ملک باہر گزرا، جہاں کہیں برسوں کے بعد آنے کا موقع ملتا تھا۔ اس لیے ہمارے تعلقات میں بے تکلفی کا رنگ تو کبھی نہ پیدا ہوا، لیکن دوستانہ مراسم تھے اور ہم ایک دوسرے سے ملاقات میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ ان سے جب کہیں ملنا ہوا، مجھے ان کی شرافت نفس اور انسان دوستی اور وضع داری نے متاثر کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب رہنے لگی تھی، چکیوں (ذائقہ) کا حادہ تھا، ذیابیطس کی شکایت بھی ایک زمانے سے تھی جس نے جسم گھلا دیا تھا۔ آخری ایام میں بینائی بھی بہت

مکروہ ہو گئی تھی۔ ان سب عوارض کے باوجود یہ گمان تک نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب گیا ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں کسی مجلس میں نظر آجاتے تھے۔ وہ حقیقت انہیں کوئی خاص شکایت بھی نہیں تھی۔ بس ۲۴ صبح پونے سات بجے اسی خاموشی سے، جو ان کے مزاج کی افتاد تھی، اہل سفر پر روانہ ہو گئے۔

۱۹۱۸ء میں ان کی شادی نئی لکھن پرشاد صدر کی صاحبزادی چندرکلا دیوی سے ہوئی تھی۔ انہیں بھی شہرگونی کا شوق در شے میں ملا تھا۔ شرم تخلص کو قی ہیں۔ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں دیکے بعد دیگرے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ پہلی کوئی ہفتہ بھر کے بعد داغ مفارقت سے گئی، دوسری سال بھر کے بعد چل بسی۔ کوئی چار برس ہوئے، انہوں نے اپنے باپ پر نسبتی کے خور و مال پرتے کو گردے لیا تھا، غرض ان کے اٹھ جانے سے علم داؤب کی وہ مسخ جڑا پنج سال سے روشن تھی، اس کے لیے گل ہو گئی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

### تصانیف

- (الف) مطبوعہ: (۱) نذر داؤب (مجموعہ رباعیات) ۱۹۲۹ء؛ (۲) کائناتِ دلی (مجموعہ نظم) ۱۹۳۹ء؛ (۳) کائناتِ دلی (انتخابِ نظم) ۱۹۵۵ء؛ (۴) نوے کفر (مجموعہ غزلیات) ۱۹۶۱ء؛ (۵) اداسے کفر (مجموعہ غزلیات) ۱۹۶۲ء؛ (۶) دو انہر و سو آنخوری نشہ ۱۹۶۶ء؛ (ب) غیر مطبوعہ: (۱) سوز و دہن (رقی نظموں کا مجموعہ) (۲) جگرائے تختِ تخت (نظموں کا مجموعہ) (۳) ریزہ گل (مجموعہ رباعیات) (۴) سا خراب سنور (نظموں کا مجموعہ) (۵) چراغِ ذرا (۶) ہنمِ خابہ (۷) ہر سنور و غزلوں کے تین مجموعے (۸) زعفرانِ زار (مزامیر کلام) (۹) نگاہِ حقیقہ سے؛ (۱۰) شعری خاکے؛ (۱۱) خون کے آئینہ (نوحے) (۱۲) دشتِ دیدنا (مندی ستکومات)؛ (۱۳) طوافِ عجم؛ (۱۴) کسی کلام کا مجموعہ (۱۵) معروضات (نثری مضامین کا مجموعہ) ۲۔ تراجم:

- (الف) مطبوعہ: (۱) راماین دایک (نثر) ۱۹۳۵ء (۲) بھگوت گیتا موسومہ نسیمِ عرفانی (مستطک)



(۱۹۳۷) (۱۹۵۵) (۱۹۶۱) (۳) کا ترجمہ - منظوم (۱۹۵۳) (۴) دھیمہ یا گپ راہ منظوم (۱۹۵۴) (۵) درگا پست شتی - منظوم (۱۹۵۵) (۶) دجلانی حافظہ - منظوم (۱۹۵۶) (۷) گنبد رومکش - منظوم (۱۹۵۶) (۸) ادھوت کاترا - منظوم (۱۹۵۶) (۹) دارا کشش ڈراما (۱۹۵۸) (۱۰) روحانی حکامہ - منظوم (۱۹۶۰) (۱۱) ننگن نے کہا - نثر (۱۹۶۰) (۱۲) ڈٹے سے آفتاب - نثر (۱۹۶۱) (۱۳) ایلینرز زو ویٹ - نثر (۱۹۶۳) (۱۴) ساگر سنگیت - نثر (۱۹۶۲) (۱۵) گیتا غلی - نثر (۱۹۶۳) (۱۶) شکنتلا - نظم و نثر (۱۹۶۳) (۱۷) گیت گووند - منظوم (۱۹۶۳) (۱۸) سندری جوان اور دوسرے نامور جمن افسانے - نثر (۱۹۶۸) (۱۹) فاؤسٹ - منظوم (۱۹۶۹) (۲۰) آریہ ابھو دے منظوم (۱۹۶۹) (۲۱) سوزا قبال - منظوم (۱۹۷۰)

(ب) غیر مطبوعہ: (۱) چارودت (ملکوت ڈراما) (۲) صبا سے (۳) ام (۴) اربا حیات عزیز خاں (۵) تعبیر منظوم (قرآن کریم کی کچھ سورتوں - کے مطابق منظوم) (۶) گیتا غلی (منظوم) (۷) انکا بلند (مشاہیر کے اقوال کا منظوم ترجمہ)؛ (۸) الہامات ایرانی (۹) یوگ سار (جین دھرم کے مقدس صحیفے کا منظوم ترجمہ)؛ (۱۰) الہامات مغرب (انجیل کے کچھ حصوں کا منظوم ترجمہ)؛ (۱۱) نالابیکس (تلسی داس کی بنے پڑ کا نثری ترجمہ) (۱۲) سری روپ کلا (ہار کے ایک بالکاں بھگت کی سوانحی کا نثری ترجمہ) (۱۳) ہاویکا گن متر (کالی داس کے نامک کا ترجمہ) (۱۴) نامتی مادھو (بھو بھوتی کے نامک کا ترجمہ) (۱۵) میری یادداشتیں - نثر (خود نوشت)

(ج) نامک تراجم: (۱) دگھو دتھ (کالی داس) منظوم؛ (۲) نامکھیا (رامائن) منظوم۔  
مبکھ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہوا۔

ہر گاہ اب اس سے اور سوا کیا کر م ترا ! بے خوش نصیب جس کو میسر ہے غم ترا !  
ہوتا ہے کچھ عجیب بہا عالم غریب کا کرتے ہیں ذکر جب بھی تھوڑے ہم ترا

کا ہشیں لے اڑیں فراغ اپنا      دل کا دشمن بنا داغ اپنا  
 کیوں کریں دل کسی کا افسردہ!      کیا دکھائیں کسی کو داغ اپنا  
 ہے کچھ اگر سلیقہ، ہے کچھ اگر قرینا      مرنے کی طرح مرنے، جینے کی طرح جینا  
 بُرا دیکھ لینا، بھلا دیکھ لینا      دکھائیں جو ارض و سما، دیکھ لینا  
 یہ دنیا سلامت، یہ آنکھیں سلامت      جہاں اس کی ہو انتہا، دیکھ لینا  
 نہیں بے صدا، گوا بھی سا زہتی      یہ ہو جائیگا بے صدا، دیکھ لینا  
 بلائے جانے والے ہے برق و باد کا خوف      سکوں نہ پھر بھی طلاء، آشیاں بنا تو یا  
 گہنگاری کی نینت کو گہنگاری نہیں کہتے      سفر کے قصد سے ہوتی ہے کب عمر سفرِ نیا  
 ضابطے سے ثواب کیا ہوتا      قاعدے سے گناہ بھی نہ ہوتا  
 دوستی کا تو خیر ذکر ہی کیا      دشمن کا نباہ بھی نہ ہوتا  
 اب اس سے ضبط کی ناکامیاد یوں شکوہ کیا؟      دل اس کا اہل نہ تھا، دل کو غم نہ دینا تھا  
 یہ کچھ کو دیکھ کے، آنکھیں جھپک لیں کس کی!      مرے مٹانے والے پر یہ کس نے صدا کیا؟  
 یہ زندگی کا سفر بھی ہے کچھ عجیب سفر      قدم قدم پر مقامات آئے ہیں کیا کیا!  
 ٹیکڑوں جلوہ نمائی کے نکالے انداز      سامنے آپ سے لیکن کبھی آیا نہ گیا  
 روزِ جزا کا ہوجو کوئی منتظر، تو ہو      درد کھلی ہیں خلد کی ماہیں ہزار آج  
 ہر ایک رسم کی، ملت کی، توڑ دی ہیں جوتہ      نہیں نہیں، کہیں میری نظر نہیں ملے  
 نہ بے نشست مصلے، نہ گودِ شربتِ تسبیح      نہ میں رکوع میں شامل، نہ میں شریکِ سجود  
 میری نظر سے بچا ہے تمام بسترِ خاک      میری نظر سے ہے پیدا تمام چرخِ بکود  
 منافقوں کا بھی سایہ ہوں و دشمنوں کا بھی دست      کھلی ہے میرے لیے ہر طرف رو بہبود  
 مرا کالاستور! نہ جانے کیا ہوگا      نہ سہدا، نہ مسلمان، نہ کافر، نہ یہود  
 تاکجا پاؤں میں زنجیرِ عسراں یہ آخو!      تاکجا سلسلہ عمر رواں یہ آخو!

تاکجا فیکر کم و بیش میں بر باد دی عمر!  
 تاکجا مستی بیہود میں یہ طلبِ اہل!  
 تاکجا یہ چین آرائی جذبہ بات جیس!  
 تاکجا تم کو گوارا یہ دستور! تو ہین  
 یہ کہہ رہے تھے فرشتوں سے میگدے والے!  
 دنیا کی عشرتیں ہوں کہ مجھے کی راحتیں  
 خدا پرست بھی ہیں! کچھ خدا کو از بھی ہیں  
 یہ حرف و شکل کے قائل ہیں کس قدر بیاک  
 لازم ہے کچھ گناہ کی عظمت کا پاس بھی  
 ہم نے دریاؤں کو بتیاب ہی دیکھا ہے ہم  
 اپنی بخیر کیا کوئی نصیبت آنے والی ہے؟  
 مری صبح و اسبتہ شام کیوں ہو؟  
 شکایت کی حد تک شکایت بجا ہے  
 جو ہو صبحِ حسرت، جو ہو شامِ حرام  
 تم سے ممکن ہو گفتگو نہ اگر  
 جس کے سننے سے ہو تھیں انکا ر  
 ان خوش نوائیوں سے منور حصول کیا  
 درد کی نعمت سے محرومی نہیں درمانِ درد  
 کیا کر چکے آئے منور! چادر گریز علاج  
 نہ آگ ل میں بھراکتی رہے اگر ہر وقت  
 نہ دوستی کا مزہ ہے نہ دشمنی کا مزہ

تذکرہ مصنفین

ہے مشروط سجدے سے بے نیاز ذی، وگرہ معلوم مرفرد ذی  
جہیں سے دھولے جہاں تھ اُس کو اجازت بندگی ملے گی

ہے دل کا رونا غضب کا رونا ۱۱۱ سے چھپانا ہے سخت مشکل

ہزار آنکھیں ہوں خشک پھر بھی چمک چمک میں کی ملے گی

تاثرات کی رادھا کا عکس پڑنے سے تحقیقات کی جہنا حسین ہے کتنی !

جمال انفیس کی شانِ رعنائی نہیں جاتی بجزرت گو ہیں جلوے بھر بھی کینا کی نہیں جاتی

بتاؤں کیا کہ غرض کیا سفر میں رکھتا ہوں یہی بہت ہے کہ منزلِ نظر میں رکھتا ہوں

دراستہ سبیل کے مشور ! ہے مرحلہ نازک خود ہی کے جوش میں آکر خدا نہ ہو جانا

چاند سورج ہیں یا تار سے ہیں یہ محد و خال سب تمہارے ہیں

ان کی تفسیر کیا کرے کوئی کتنے خاموش یہ اشارے ہیں

سبزہ و گل نے کر دہیں لے کر نقش کتنے حسین اہلاد سے ہیں

رکھ لیا غیرت ناموس جنوں کا پردا نہ بیا باں سے پٹ کر کبھی گھر تک پہنچے

جو مشکل چاہتے تھے منور ! نہ بن سکی کچھ دل سے کچھ نگاہ سے بھی کام لے لیا

تسخ ہونے پہ بھی غم دل کی دوا ہے تو بھی خواہ مر مر کے ہو جینے کا مزا ہے تو بھی

پڑھ کے افسانہ دل کیوں چپ ہو؟ کوئی مطلب تو عبارت کرتے

تم کو تردید سے اُٹھن ہوتی ہم جو اظہارِ بخت کرتے

کفر سے دین کی غفلت بڑھتی عشق کو کج و عبادت کرتے

اور بھی دل کو اذیت ہوتی تم سے کیا نہ کر مصیبت کرتے

تم مخاطب ہوا تو کھولی ہے زباں ہم تو اس کی بھی نہ جرات کرتے

شاعری وحی سے، الہام سے آگے نہ بڑھی اک قدم بھی روشِ جام سے آگے نہ بڑھی

کارفرمائی معمارِ تخیل کیا ہے؟ کوئی تعمیرِ در و دام سے آگے نہ بڑھی

## تذکرہ سامریا

وقت کی رو نئی بہر حال جڑوں کی پابند  
 صرف مرغیان گرفتار پہ ڈھانا تھا ستم  
 اک قدم بھی سحر و شام سے آگے نہ بڑھی  
 ایک جھلی بھی دگ دام سے آگے نہ بڑھی  
 داستان جب بھی دل بڑا نے اپنی چھتری  
 ذکر بے مہرِ ایام سے آگے نہ بڑھی  
 وہ گجیا کنبہ دیں اس سے متور! محروم  
 دلبری حلقہٴ احصاء سے آگے نہ بڑھی



## ضیاء القادری بدایونی، مولوی محمد یعقوب

خدا کی شان میں نے ابھی پچھلے شمارے ہی میں شکیل بدایونی کے حالات میں ضمناً مولا ضیاء القادری بدایونی کا ذکر کیا تھا، اور دکھایا تھا کہ معلوم نہیں، وہ کس حال میں ہیں، اور زندہ بھی ہیں یا اپنے آخری سفر بردواز چکے۔ اس کے چند ہی دن بعد خبر موصول ہوئی کہ ان کا ۱۵ اگست ۱۹۷۷ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ انا اللہ و اتنا الیہ الرجوع۔ اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ بلحاظ کثرت ان سے بڑا صفت گو، احمدیہ تو درکنار، کسی اور زبان میں بھی مشکل ہی سے ہوا ہو گا۔

ان کا نام محمد یعقوب تھا۔ ۲۷ رجب ۱۳۷۷ھ (۳ جون ۱۹۸۳ء) کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ پیر محمد فضل الرحمن "سارنگی" نام ان کے خالو مولا ناعلیٰ احمد خان اسیر بدایونی نے رکھا تھا اور دکان "صغیر" ان کے والد نے۔ ان کے والد شیخ یحییٰ بدایوں کے مشہور مصلحانہ لکھنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں میں اکبری دود کے مشہور مولیٰ اللہ شیخ عبداللہ بدایونی کی مہتی قابل ذکر ہے۔ جن کے شاگردوں میں قاضی عبدالقادر بدایونی (دف ۱۰۴/۵۹۷ھ) بھی سناوڑہ روزگار مہنت تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جیسا کہ خواجہ نظام الدین نے طبقات اکبری میں لکھا ہے،

شیخ عبدالرشید اصل منہ تھے۔ ایک ن گلتان کا سبق پڑھ رہے تھے کہ اس میں ہوں سلا کا ذکر آگیا۔ استاد سے ان سے متعلق تفصیل پوچھی اور انہوں نے جو مناقب بیان کیے، ان کے سننے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ پھر اپنی ریاضت سے علم و فضل اور ورع و تقویٰ سے وہ مقام حاصل کیا کہ خلق خدا نے ان کی برگزیدگی کا احترام کیا۔

محمد یعقوب کوئی چار سال کے تھے کہ ان کے والدہ انگریز نے عالم جادو الی ہو گئے۔ سوال ۱۳۰۴ھ اس کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت اپنے خالہ آسیہ کے زیر سایہ ہوئی۔ آسیہ کی جہالت اور لادھرنی ایک مٹی تھی؛ انہوں نے محمد یعقوب کو اپنے بیٹے کی طرح پرورش کیا؛ انہوں نے غالباً فارسی بھی آسیہ سے پڑھی تھی۔ پھر دارالعلوم شمس آباد میں باقاعدہ تعلیم پائی۔

۱۸۹۷ء میں اردو ٹیڈ پاس کیا۔ اس کے بعد چچا کے ساتھ ساگے اور وہاں چار سال تک محکمہ سروے میں رہے۔ واپسی پر محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ اسی سلسلے میں مدتوں گتور میں مقیم رہے۔ بعد ازاں ۱۹۱۳ء میں بایں تحصیل میں بطور جسٹس رگرڈ اور قانڈوگ تعینات ہو گئے تھے۔ اگرچہ مشاہدہ کچھ زیادہ نہیں تھا؛ لیکن طبیعت قانع اور سادہ پائی تھی، انہوں نے جس جہد و مشق سے لبر کرتے رہے اور یہیں سے بلکہ خرما مارچ ۱۹۲۰ء کو سکندرشہ بھی ہوئے۔ اسی سال کی عمر میں حضرت مولانا عبد القادر بدایونی کا مرید کر دیا تھا۔ جب ان کا دھال ہو گیا تو انہیں کے فرزند رشید مولانا عبد القادر قادری سے تجدید بیعت کی شہر میں مشورہ بھی آسیہ ہی سے رہا۔ آسیہ اود اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے اور دعوت پر خاص توجہ تھی۔ ضیاء صاحب نے بھی ان کے تشیخ میں عمر بھر نعت نبی یا پھر خلیفۃ المسیح دھما بے کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔

یہاں ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض اصحاب نے آسیہ کو غائب کا شاگرد لکھا ہے؛ مگر یہ ٹھیک نہیں۔ وہ احمد حسین امجد (تلمیذہ لادھلی مذاق بدایونی) کے شاگرد تھے۔ علی احمد خان آسیہ کے والد جنگ باز خان بریلی کے رہنے والے تھے۔ یہیں اسی ۱۸۵۶ء ۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے اور

## تذکرہ معاصرین

ابتدائی تعلیم بھی بریلی میں پائی۔ ان کے والد شکیکہ داری کا کام کرتے تھے ایک رتبہ اپنے کام کے سلسلے میں انھیں کچھ لاگھاٹ پر قیام کرنا پڑا، جو بدایوں سے ۱۰۰ میل دور ایک قصبہ ہے۔ اس دوران میں ان کی بدایوں کی آمدورفت بہت ہو گئی اور بالآخر انھوں نے بدایوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ امیر کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی۔ سب سے آخر میں مدرسہ عالیہ دہلی میں مولانا عبدالحق خیر آبادی (د ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء) سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کی۔ تعلیم کے بعد انھوں نے اولاً ایک صاحب کی شرکت میں بدایوں میں "طبع نسیم عمر" قائم کیا اور یہاں سے اس کا نام کا اخبار بھی نکالنے لگے۔ جب ۱۸۸۸ء میں محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی تو مطبع اور اخبار اپنے شریک کار کے حوالے کر کے الگ ہو گئے۔ امیر اپنی ملازمت کے پوسٹہ زمانے میں بدایوں سے باہر نہیں گئے، اور یہیں سے ۱۹۱۳ء میں پنشن پائی۔ پھر اسی سال آگرے کے سینٹ جونس کالج میں عربی پڑھانے پر مقرر ہو گئے، یہاں وہ ۱۹۲۱ء تک رہے۔

۱۹۲۷ء میں حج کے لیے گئے۔ انھیں ایک زمانے سے ردضہ بنوی کی زیارت کی تمنا تھی چنانچہ حج کے بعد مدینہ منورہ پہنچے اور مدینہ کی مراد پائی۔ آٹھ دن بعد پنجشنبہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۷ء (۲۰ محرم ۱۳۴۶ھ) کو عین نماز میں اپنے خالق کے حضور پہنچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جناب ضیاء افکار کی ہی نے تاریخ بھی۔

کیسے ضیاء! سالِ دصال جناب

خاتمہ بالخیر ہوا بے حساب

(۱۹۲۷ء)

بہت سا کلام نظم و شعر، مخطوطہ اور غیر مخطوطہ اپنی یادگار چھوڑا۔ ان میں ایک کتاب مشہور مرثیہ عبدالقادر بدایونی کی سوانح عمری بھی تھی۔ ضیاء صاحب کو جب کی ولادت ہونے کے باعث یہی شریف منانے کا خاص شوق تھا۔ اپنے میلان طبع کی تشکیلات کے لیے وہ ہندستان میں



جہاں جہاں بھی ادبیا اللہ کے مزار ہیں وہاں محسوس کے موقع پر حاضری دیتے رہتے تھے۔ بلکہ انکی دُھن میں وہ عراق بھی گئے اور یہاں نبھن، کافلیں اور کربلا میں عقیباتِ عالیہ کی زیارت سے شرفیاب ہوئے رنج بھی کیا تھا۔

تقسیمِ ملک کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے اور کراچی میں مستقل طرح اقامت ڈال دی یہاں انھوں نے ایک انجمن "مجلس شیدائیانِ نبی" کے نام سے قائم کی تھی۔ اس کا مقصد میلادِ ابنی، سراجِ ابنی، یومِ خلفائے راشدین، یومِ شہیدِ کربلا اور بزگاہِ دین کے عرس کے موقع پر جلسے کرنا تھا۔ ان اجتماعوں کے ساتھ فقیر اور فقیرتی شاعرے بھی منعقد کرتے رہتے تھے۔ اس سے لوگوں میں شعورِ شاعری سے بچپن کے علاوہ دینی شغف و شعور بھی پیدا ہوا کر گیا۔ اس ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے کلامِ نثر نے ایک "زمین" کی تشکیل کی تھی غالباً کچھ پری میری مریدی کا سلسلہ بھی کر دیا تھا۔

ان کے فقیرتِ کلام کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی نظم و نثر میں ہیں مثلاً "دیارِ نبی منظوم" یعنی سفرِ نامہ (سج)؛ "مرقعِ شہادت" (منظوم واقعاتِ کربلا)؛ "جو ابرِ غوث اور" (منظوم سفرِ نامہ عراق)؛ "نغمہٴ ربانی" (منظوم میلادِ شریف)؛ "سراجِ مضامین" (منظوم مناقبِ ادیبانِ قادریہ بدایوں)؛ "ستارہٴ جنت وغیرہ۔

لیکن میری نظر میں ان کی سب سے اہم تالیف، اکل التوا رہنے ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں بدایوں کے عثمانی خاندان کے علما اور بزرگوں کے حالات ہیں؛ اس طرح بہت سا مواد جو منتشر حالت میں تھا، یکجا ہو گیا اور مضامین ہونے سے بچ گیا۔ دوسرے حصے میں حضرت مولانا فضل رسول کی مفصل سوانح عمری ہے جو کتاب بکھنے کی علتِ عثمانی تھی۔ ان کی ایک اور کتاب "مجموعہ مفتاح احمد" (بدایوں ۱۹۶۳ء) بھی قابلِ قدر ہے۔ اس میں بدایوں کے ساتھ ادبیا، اللہ

سے لطیف ہے کہ میاں نے مثنویوں کی مدح جو کہ تو اس پر ایک صدی کی دگر بخت بھڑک اٹھی۔ چنانچہ

قاضی قاضی (ن ۱۹۴۸ء) کے نام سے سیرۃ النبی (احوالِ سیدِ شاہ) ہوئی (۱۳۳۳ھ)

کا ذکر ہے جن کے نام کا جزاء احمد ہے۔

یادگارِ جہانی ایک بیٹی اور ایک بیٹا یوسف حسن نور ایم اے ہیں، یہ پاکستان حکومت میں ملازم ہیں۔ قطعہٴ تمارینِ وفات ان کے شاگرد صابر براری نے لکھا ہے جس کا آخری شعر ہے:

سالِ رحلت کو ہے، صابر بہمنگند کی صدا

”اے امان اللہ ضیاء القادری جنتِ بکاء“  
(۱۹۹۷ء)

بھری تمارین میں بھی انہیں کا مصرع ہے: آہ دلِ زماں ضیاء القادری بدایونی (۱۳۹۰ھ)  
اب ان کی مختلف رنگوں کی نظموں کا نمونہ ملاحظہ ہو:

## مناجات

اے خدایا، اے مالکِ کل کائنات	اے کریم و اے رحیم و حق صفات
خالقِ وقیم، تیری نوا ت ہے	روشنی ہر چا تر کا دن رات ہے
تو نے ہی پیدا کیے ہیں ہر دماہ	تیرے ہی انوار ہیں شام و گھاہ
تو نے ہی پیدا کیے جن و لبشر	تو نے ہی پیدا کیے ہیں بحر و بر
تو نے مخلوقات کو پیدا کیا	ہر موجدِ ذات کو پیدا کیا
اور میں تہا آسمان ہے تیرا نور	تیرے جلوؤں کا ہے عالم میں ظہور
تو ہے خلاقِ مالک، اے کریم!	ہے تو انساں پر احسانِ عظیم
تو نے ہی پیدا کیے لوح و قلم	عش و کرسی ہیں ترے زبرِ قدم
حر و حلاں ہیں ترے تسبیحِ خواں	محوِ طاعت ہیں ترے سبوحیاں
تو نے آدم کو بنایا خاک سے	روحِ ڈالی اپنے نورِ پاک سے
حضرتِ آدم کو یہ رتبہ دیا	سجدہ ان کو سب فرشتوں نے کیا
منورِ ابلیس سجدے سے ہوا	راندھا درگاہِ نوراً ہو گنگیا

آدم دتھا کو جنت کی عطا ہو گئے تھا سے آدم پھر جدا  
 آفران کی ہو گئی تو یہ بتول سلسلہ اولاد کا جاری ہوا  
 ان سے پیدا انبیاء لاکھوں ہوئے سب سے آخر رحمتہ طعالمیں  
 تمت برحق کا چکا آفتاب عرش سے چکا یہ کبے کا سراج  
 دور دورہ مسلم و عرفاں کا ہوا تمت حق کی ہوئی تقسیم عام  
 اے خدا! جب تک رہے قائم جہاں دل بالامت حق کا رہے  
 ہر نہاں پر تیرا نام آتا رہے ہر نہاں پر تیرا نام آتا رہے  
 تیری طاعت اور عبادت عام ہو کام ہو دنیا کا یتیم اتام ہو

منیکوں کا ہو خدائی میں رواج

ہو فقط تیری حکومت، تیرا راج

### نعت

ایمن کہیے رب! آپ پر ہزاروں سلام خیمہ حجاز و عرب! آپ پر ہزاروں سلام  
 عام کرتے ہیں سب آپ پر ہزاروں سلام ہوں آپ پر شہد و الاحب ہزاروں سلام  
 سلام آپ پر حضور و شبہ امری  
 سلام آپ پر شاہنشاہ شبہ امری

وہ آئے کچے سے دم بھر میں جانبِ اقصیٰ بنے امامِ رسل اور پڑھا یہاں خطبہ  
سب انبیاء سے ملاقات کی یہاں خبردا یہاں بلند یہ نعرہ ہوا سلاموں کا

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئیؑ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئیؑ

یہاں سے لے کے براقِ آپ کو رواد ہوا ہر حضور پہ رحمت کا شامیانہ ہوا  
بساطِ عرش پہ اک جہنمِ خسروا نہ ہوا ادا فرشتوں کے لب سے ہیں ترانہ ہوا

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئیؑ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئیؑ

کھلے حضور پہ ساتوں فلک کے دروانے سلامِ شوق کے ہر آسماں پہ تھے نعرے  
ادب سے اہلِ فلک اور رسول ملتے تھے سلام کہتے تھے سب رسلین خوش ہو کے

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئیؑ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئیؑ

حضورِ داوئی ہفت آسماں کیوں گزرا کہ جیسے نور گزرتا ہے پادشہی سے  
ہر اک فلک پہ تھے سامانِ خیر مقدم کے سب انبیاء و گرامی سلام کرتے تھے

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئیؑ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئیؑ

خدا کا نورِ خدا کے حضور آ پہنچا حبیبِ پیشِ خدا سے حضور آ پہنچا  
قریبِ نبی، شبِ اُسرئی کا نور آ پہنچا حدِ نظر سے وہ ماہِ پارہ دور آ پہنچا

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئیؑ

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئیؑ

حجاب اٹھ گئے، وہ بے حجاب حق سے ملے      حبیب حق، شرعاً حجاب حق سے ملے  
 نقاب دوڑ ہوئی، بے نقاب حق سے ملے      ہو اسلام، مبارک خطاب حق سے ملے  
 سلام آپ پر خضرِ رو شبِ آسریٰ  
 سلام آپ پر شائستہ شبِ آسریٰ  
 لطافتِ شبِ آسریٰ کا واسطہ یاد کیا      جمالِ نورِ سراپا کا واسطہ یاد کیا  
 وقارِ گنبدِ خضریٰ کا واسطہ یاد کیا      مدینہ، کعبہ و اقصیٰ کا واسطہ یاد کیا  
 سلام آپ پر خضرِ رو شبِ آسریٰ  
 سلام آپ پر شائستہ شبِ آسریٰ  
 حضورِ شاہ میں مقبول ہو سلامِ نیاز      سنو سلام، غلاموں کا اپنے بندہ نرازا  
 غلام کیوں شبِ آسریٰ لکریٹ آجے نانا      سین سلام، تجلیں حضورِ تبارِ حجاز  
 سلام آپ پر خضرِ رو شبِ آسریٰ  
 سلام آپ پر شائستہ شبِ آسریٰ

## نعت

اِسْلام اے چراغِ عرشِ ہریں!      فخرِ کون و مکان، رسولِ امیں!  
 اِسْلام اے بنائے ارضِ سما!      باعشرِ خلقِ آسمان و ذیں  
 اِسْلام اے مرادِ قدرتِ حق!      بہترِ پیکرِ جلیل و حمیں!  
 اِسْلام اے نگارِ محفلِ کون!      جانِ ہر علم و روحِ حسنِ یقین  
 اِسْلام اے امامِ بزمِ رسلا!      خاتمِ الانبیاء یا تمکین  
 اِسْلام اے تجلی و آتش!      تو الفنیٰ حیرا عکسِ لوحِ جبین  
 اِسْلام اے محرمِ حریم!      ادا دل تا ابد حقیقتِ دین

اسلام، اے فروغِ بخشِ حیات! تاجِ عرفان و معرفت کے نیکیں  
اسلام، اے رفیقِ غم و گمراہی! خستہ جاؤں کے عمن اور معین

آپ سرِ مایہِ ہدایت ہیں آپ ہیں تاجدارِ مخلوقات  
آپ کے مقتدی تمام رسول آپ پیغمبرِ خلیق و شفیق  
آپ پر ہے مدارِ حسن و جمال آپ عزائِ لطف و رحمت ہیں  
آپ نبیاءِ آدمیت ہیں آپ سرچشمہٴ رسالت ہیں  
آپ قاسمِ دولتِ شرافت ہیں عشق کی جا دواں حقیقت ہیں

در پہ آئے ہیں دادرِ غم پانے آپ کے رونے پاک کے شیدا  
تخ ہے جن کی داستانِ حیات ہو چکے ہیں الم سے چکنا چور  
روزِ آتی ہے مگر دشنِ ایام جن کو اپنا خیال کرتے تھے  
زخمِ خوردہ ہے پیکرِ ہستی خاواروں میں ہو گئے تبدیل  
موشِ گوشہ میں بن گئے دل کے کفر و باطل کے لاکھ بت خانے  
مردانِ وفا کو بہکانے بختے جاتے ہیں سب وہ بیگانے  
داغ اتنے دیے ہیں دنیا نے روح کے لالہ زار کا شانے  
موشِ گوشہ میں بن گئے دل کے کفر و باطل کے لاکھ بت خانے

المدد، المدد! رسولِ انام  
مٹ نہ جائیں حضور کے یہ غلام

## منقبت امیر خسرو

صد و ہر پیر و عرفاں، حضرت امیر خسروؒ  
 ولداۃ نظام و قطب و فرید و خواجہ  
 لذت کش وصال پیرِ مغان و سحر  
 تم ہو بہشتِ مکن، تم خلعاںِ ستاں ہو  
 خیر البشر کی امت، خیر البشر کے شیدا  
 مہبلے سحری کا اک دور ہو ادھر بھی  
 قیدانے من و است محبوب پاک، یعنی  
 یک خسرو جہاں شعر و ادب، مسلم  
 عالم، دل، شائع، عارف ادیب شاہ  
 احسانِ سلطنت کے ماننے ہوئے معلم  
 بد و ہر سپہا یاں، حضرت امیر خسروؒ  
 قلّٰ حبیب رحمان، حضرت امیر خسروؒ  
 مست شرابِ عرفاں، حضرت امیر خسروؒ  
 تم ہو جہاں بہا ماں، حضرت امیر خسروؒ  
 قدسی صفات انساں، حضرت امیر خسروؒ  
 اسے پیرِ بزمِ داناں، حضرت امیر خسروؒ  
 نوشا و حبیبِ خوشاں، حضرت امیر خسروؒ  
 میرِ صفتِ سخندان، حضرت امیر خسروؒ  
 سب آپ کے شاخوئل، حضرت امیر خسروؒ  
 قدرتِ شناس شاہاں، حضرت امیر خسروؒ

دستِ مجاہدِ نواجذ، یعنی ضیائے بگیں  
 غربت میں ہے پریشاں، حضرت امیر خسروؒ



## اجس کھنوی، میرزا محمد اقبال

گلدستہ ۱۶ اگست کو مشہور مزاج نویس، اجس کھنوی کا کھنوی میں انتقال ہو گیا، اور یوں ہماری بزم شعرا و ادب سے ایک باغ و بہار شخصیت اٹھ گئی۔

رحم کا پوتا نام میرزا محمد اقبال تھا۔ اسی لیے لوگ عرف عام میں انھیں ایم ایم اقبال بھی کہتے تھے۔ اپنے آبائی مکان محلہ کا طین گیٹ میں ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب اودھ کے شاہی خاندان سے ملتا ہے۔

سلطنت اودھ کے تیسرے فرمانروا محمد علی شاہ تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ تخت پر بیٹھے، اور ان کے بعد واجد علی شاہ، جنھیں انگریزوں نے ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے کلکتے بھیج دیا اور اودھ کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا، اسی پر سلطنت اودھ کا خاتمہ ہو گیا۔ رہے نام اللہ کا۔

محمد علی شاہ کے امجد علی شاہ کے علاوہ بھی متعدد اولادیں تھیں۔ ان میں دو بیٹے میرزا رفیع اللہ شاہ اور میرزا فرخندہ بخت بھی تھے۔ میرزا فرخندہ بخت کے چوتھے میرزا امجدی حسین (ابن میرزا رضا علی) اجس کے والد تھے۔ دوسرے شاہزادے میرزا رفیع اللہ کے بیٹے میرزا ابراہیم علی



عیش تخلص کی بیٹی (سلطان جہان بیگم) میرزا ابراہیم علی حسین کے عقد نکاح میں تھیں۔ یہی ماہم کی والدہ تھیں، ان کو یا ابراہیم علی عیش ان کے نام تھے۔ ایک تو شاہی خاندان میں اولاد کی کمزرت تھی ہی، اس پر زہلنے کا وہ مانج بھی کہہ ایسا ہی تھا، غرض شاہزادوں کی تعلیم کی طرف سے بہت غفلت برتی جاتی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ اگر کسی کو اردو میں شہدہ ہو گئی، یا قرآن کا ایک آدھ پارہ ناظرہ پڑھ لیا، تو گویا تعلیم کی معراج حاصل کر لی۔ لڑکوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ انھیں کہیں لڑکری یا کوئی پیشہ تو اختیار کرنا نہیں تھا، اس لیے شاہی خاندان کے بچے عام طور پر جاہل رہتے تھے۔ اس ماحول کے برخلاف عیش کو پڑھنے سمجھنے سے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مختلف اساتذہ سے عربی اور فارسی کی معقول تعلیم حاصل کی۔ خیر، یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے طب پڑھنے پر توجہ کی جب اس کی خبر ان کے والد میرزا رفیع اتقان کو ملی تو وہ بہت خفا ہوئے کہ ہمارا بیٹا ہو کر طب پڑھنا کیا معنی؟ یہ تو ہادی شان ریاست کے معافی ہے۔ میرزا ابراہیم علی نے اس کے باوجود چوری چھپے اپنی تعلیم جاری رکھی اور رفتہ رفتہ اسے مکمل کر لیا۔ جب رفیع اتقان کو معلوم ہوا کہ صاحبزادے نے میرے بچے کی پروا نہیں کی اور حکیم بن گیا ہے تو حکم دیا کہ کالج سے ابراہیم علی ہمارے سامنے ڈاکے، ہم اس مرد کو کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتے، اس نے طبابت کا پیشہ اختیار کر کے ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے نام کو بیٹہ لگا یا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد عمر بھر باپ بیٹوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی، اور بیٹے نے صرف ان کی مٹی میں شریک کی۔

لیکن نام بڑا اور روشن چھوٹے۔ نام کو تو یہ شاہی خاندان تھا، لیکن دانشوروں کا یہ حال تھا کہ سبب رفیع اتقان کا انتقال ہوا ہے تو ابراہیم علی کو ساٹھ روپے اور کچھ آنے و بیٹے کے ملے اور تیس روپے کی پورٹیکلیشن باپ کے ترکے میں سے ملی، لڑکے کو کل ساٹھ روپے۔ ان کا ذریعہ معاش طبابت کا پیشہ تھا۔ اگر یہ نہیں ہوتا، تو خیال کیا جاسکتا ہے کہ کیا گذرتی۔

میش اپنے زمانے میں خاصے مشہور ہوئے۔ اور دفاتر کی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں رحلت کی۔ چچی بس عمر پائی۔ وفات کے وقت ۹۰-۹۵ برس سے کم کے نہیں ہونگے۔

ماچس کے والد میرزا امجدی حسین نے عین جوانی میں ۱۹۴۹ء میں انتقال کیا۔ بعد وراثت کے معاش کے باعث فراغت کا تو کیا ذکر، گزشتات بھی شکل سے ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے بچوں کی معقول طریقے پر تعلیم بھی نہ ہو سکی۔ آپس میں مدد سے میں نزل سے اگے نہ بڑھ سکے۔ وہ تلمذ و بستہ کے اسکول میں پڑھتے رہے جو ان کے مکان کے بالکل قریب تھا۔ اس کے بعد کچھ انگریزی کی شد بد گھر پر اور عربی فارسی اپنے ماما میرزا ابراہیم علی میس سے پڑھی لیکن دونوں سے واقفیت اور محوری رہی۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میس کبر سن کے باعث ضعیف ہو چکے تھے اور زیادہ محنت کے قابل نہیں رہے تھے۔

۱۳۰۱ھ میں کاسن تھا، جب ماچس کو شاعری کی چٹنگ لگی، اور اس میں وہ انور حسین آرزو لکھتوی مرحوم (ف ۱۹۵۱ء) کے فارغ الاصلاح شاگرد آئن صاحب دقار سے مشورہ کرنے لگے، جو انھیں کے محلے میں رہتے تھے۔ وہ ابتدا میں انہیں تخلص کرتے تھے، اور سنجیدہ غزلیہ کلام کہتے اور مشاعروں میں ملتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں دقار کا انتقال ہو گیا۔ اس کے کچھ دن بعد آرزو صاحب کلکتے سے وارڈ لکھنؤ ہوئے، تو ماچس ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، دقار سے اپنے تلمذ کا ذکر کیا اور ان سے اصلاح کی درخواست کی۔ آرزو نے کلام پر اصلاح دینا منظور کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جتنے دن لکھنؤ میں ہوں، شوق سے آؤ، لیکن میری عدم موجودگی میں سید اکبر رضا اینڈ وکیت (تلمیذ آرزو) حال مقیم کراچی) سے مشورہ کرو کیونکہ خط و کتابت کے ذریعے سے نہ مکمل استفادہ ممکن ہے، نہ کلام پر اصلاح ہی، تجربہ خیز ہو سکتی ہے۔

سید اکبر رضا سے بہ تقارن ماچس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ ان کی وساطت سے یہ نہیں بہادر ادب لکھنؤ کے رکن بن گئے، جس سے انہی حلقوں سے ان کی شناسائی کا دائرہ وسیع تر

ہو گیا۔ اسی زمانے میں آل رضا صاحب یتیم خانے کے سکتر مقرر ہو گئے، تو انھوں نے آپس کو یتیم خانے کے لیے کیش پر چندہ جمع کرنے کا کام سپرد کر دیا۔ جب تک آل رضا سکتر رہے یہ کام ان کے پاس رہا، بلکہ شاید ان کے الگ ہونے کے بعد بھی کوئی سال بھر یہ کام کرتے رہے۔ غالباً ۱۹۴۴ء میں ماچس کا پور کی مشہور ہارنس فیکٹری میں ملازم ہو کر وہاں چلے گئے۔ یہاں کی نوکری دو سال رہی۔ اس کے بعد راشن کے محکمے میں ملازمت میں گئی۔ جب یہ محکمہ تخفیف میں آگیا، تو اپریل ۱۹۴۸ء میں سلیس ٹکس کا محکمہ قائم ہوا اور راشن والے بیشتر ملازموں کو اس میں جگہ دی گئی۔ چنانچہ ماچس بھی جون ۱۹۴۸ء میں اس دفتر میں عارضی ملازم ہو گئے۔ مشکل یہ تھی کہ مستقل اس وقت تک ممکن نہیں تھی، جب تک ان کے پاس ہائی اسکول کا فائنلکس نہ ہو۔ ماچس (اور ان کے بعض اور ساتھیوں نے بھی) خاص طور پر انگریزی سیکھنے کا انتظام کیا اور بورڈ کے امتحان میں بیٹھے اور یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ یوں ۱۹۵۶ء میں وہ ملازمت میں مستقل ہو گئے۔ وہ کا پور میں ۱۹۶۱ء تک رہے اور اس سال والدہ کے اصرار پر بکھنؤ تیار کر لیا۔ والدہ کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔

آرزو اور ان کے تلامذہ کی فنی جہارت مسئلہ ہے اور اس کا سبب اعتراف کیا ہے۔ وقار ادا، آل رضا کے علم و فضل سے ماچس نے بھی استفادہ کیا اور فن عروض و شعر میں خاصی واقفیت ہم پہنچائی تھی۔ لیکن بہت جلد اپنی طبیعت کے اقتضا سے وہ اقبال سے ماچس ہو گئے۔ اور مزاحیہ رنگ میں کہنے لگے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ کسی مشاعرے میں طرح ہوئی، ادلی نادلیا تھے ہو کیا ہے؟ جب کسی نے یہ مصرع اقبال صاحب کے سامنے پڑھا، تو انھوں نے گہرے لٹاکر اسے یوں پورا کیا:

دلِ ناداں اچھے ہوا کیلے

حلقِ تک آ کے جھانکتا کیا ہے!

اس پر ان کے برادر بزرگ میرزا محمد عزیز معزز لکھنؤی نے کہا کہ تم اپنی غزل اسی مزاحیہ رنگ

میں متکثر کرد اور شاعرے میں پڑھو۔ اس کامیابی پر وہ مستقل مزاجیہ شاعر ہو گئے۔ انہوں نے کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں کیا، غالباً باقاعدہ بیاض بھی نہیں لکھی۔ محافظ اس بلا کا تھا کہ جو کچھ کہا، اذ برنخدا۔ دوست احباب کی مجلسوں میں گھنٹوں اپنا کلام سناتے اور کہیں غلطی نہیں کرتے تھے۔ سڈنوں ان کی نظمیں اور دھپچ (دورثانی) اور شوکت تھاری کے سرخی میں چسپی رہے۔ شوکت مرحوم ہمیشہ ان کے نام کے ساتھ ظریف الملوک کا خطاب لکھا کرتے تھے۔

انہوں نے بعض مشہور نظموں کی کامیاب پیروٹی لکھی ہے مثلاً ان کی اقبال کے شکوہ کی پیروٹی ”شکوہ شکوہ“ معرکے کی چیز ہے، اس میں راشن کے زمانے میں شکر کی قلت کی شکایت کی ہے چنانہ کا، پیرائش، ہنگامی، خاندانی منصوبہ بندی بھی ان کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ ان کا کچھ سنجیدہ کلام بھی ہے، خاص طور پر نو حے اور سلام۔ ان میں وہ بہت متین رہے ہیں۔ موضوع کی سنجیدگی کے پیش نظر ان میں مزاج بھل بھی ہوتا۔ اس کلام میں تخلص سوختہ کیا ہے۔

ان کے احباب کو فوراً توجہ کرنا چاہیے، منتشر کلام لکھا کر کے چھاپ دیا جائے۔ طنز مزاح شاعری میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ جاری زندگی کی جو افتاد ہے اور کشمکش جیات حریفانہ سے تیز و تند ہوتی جا رہی ہے، اس کے پیش نظر اب کسی اچھے مزاج شاعر کے پیدا ہونے کی امید کم ہے۔ اس لیے یاد اب کی خدمت ہوگی کہ جلد ان کا کلام محفوظ ہو جائے۔ طنزیہ اور مزاح شاعری کے لیے بڑے سلیقے اور فطری اور جذباتی ضبط کی ضرورت ہے۔ جذبتی سے آہی کا سار ہاں فقدان ہے۔ اگر شاعر کو اپنے اوپر قابو نہیں ہے، تو اس کا استدلال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ جس مرحوم کے مزاج میں بڑی سنجیدگی اور شگفتگی اور بھنگی ہے اور ان کا کلام بہت پُر وقار ہے۔ اردو ادب کی یہ نہایت قیمتی ہوگی، اگر یہ ضائع ہو گیا۔

پچھلے جن میں انھیں کینسر ہو گیا۔ دو تین مہینے بہت تکلیف میں گزرے۔ آخر وقت نوحو

آگیا اور وہ ۷۷ سال کی عمر میں ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء شام آٹھ بجے راہی ملک بقا ہو گئے۔ انہوں نے شادی ابھی تری عمر میں ۱۹۶۴ء میں کی تھی اپنے پیچھے بیوی کے علاوہ تین بالکل خوشحال بچے (دو لڑکے اور ایک لڑکی) جہانی یادگار چھوٹے۔ اگلے دن کربائے امین لدولہ (کھٹن) میں آخری خواجگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے بھتیجے فرخ نواب سنگا کھنوی نے تاریخ کبھی ہے:

مصرع تاریخ بھری میں یہ مکھ دوڑے سگاوا

ہلکتہ خلد بریں اقبال ماچس کھنوی

خود کلام میں سب سے پہلے شکوہ شکر ہی دیکھیے، جو اقبال کی شہرہ نظم، شکوہ کی پڑائی کیوں نمک خوار بنوں، زور و فراموشیوں فکر زدہ نہ کروں، محو غم و دوشس رہوں گڑے گلے بھی سنوں، اور مرتب گمش رہوں۔ ہمنشیں میں کوئی مودہ ہوں کہ خاکوش رہوں نفع اندازوں سے الفت کی جلن ہے مجھ کو

شکوہ شکر سے یہ خاکم بدہن ہے مجھ کو

خاص وجہ کے منہاسوں میں تو مشہور میریم اب کہ چستی سے مرتبے سے بھی مجبور ہیں ہم مرتباں کہتے ہیں، فریاد سے، معذور ہیں ہم، نالہ آتا ہے اگر بپا تو معذور ہیں ہم

اے شکوہ شکوہ ارباب خدا بھی سن لے

تو حکاموں سے ذرا اپنا گلہ بھی سن لے

تجربے بیگانہ تھے، سلوک بھی تو رانی بھی ابلیس چین میں، ایران میں ایرانی بھی

تھے بڑے شہرہ آفاق تو یونانی بھی ایک سے ایک سہودی بھی تھے انصرانی بھی

کی ہے بل بل سے کہیتوں پر چڑھائی کس نے؟

ہر کے گلے کو، تری بات بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں ناؤ پر لاد کے بھیجا تجھے دریاؤں میں

کلیک میں ڈھال کے پہنچا یا کلیباؤں میں گائے جھنڈے ترے ہر شہر میں اور گلاؤں میں

کہیں فہرست میں چوتے جو بھانداروں کی  
تیرا دم بھرتے اپنی چھاؤں میں تلواروں کی

اب بھی ہے دل میں ہمارے دی سوزاؤں ہی ساڑ  
تیک ہی صفیں کھڑے ہو گئے محمود ایازؒ  
”بندہ صاحب و محتاج ڈپٹی ایک ہے“

آکے دکان پر راشن کی سبھی ایک ہوئے

اور دکان سے راشن کی جو ناکام پھرے  
بڑی دکانوں پر لے لے کے ترانام پھرے  
چھوٹے چھوٹے مٹی دکان دار نہ چھوٹے ہم نے

جو بازار میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

آکے دکانوں پر گیموں کے مقابل تو نے  
سر پٹوں کو کیا عشق کا حاصل تو نے  
کیا کہا سینے ہمارے مشک آباد نہیں

تیرے بڑوں پر لہے پڑتے تھے کیا یاد نہیں؟

بادکش غیر میں گلشن میں بوجھ بیٹھے  
ہیں جو دکان پر راشن کی ہر اک ٹوٹی تھکے  
گلکب منشی کو پیام رقم افروزی ہے

تو نے دلے کو فرمان نظر سوز کا ہے

صنعت باز کے کیا فاش جو تھکے بحر کا راز  
میزاؤں دریاں ہیں مرکز صد ناز و نیاز  
چاہے بیتاب ہے، بندل سے نکلنے کے لیے

کھینچ رکھی ہے بھٹی پہ ابلنے کے لیے

شکلیں ہم سے شریفوں کی تو آساں کر دے یہ نہیں کہنے کہ ہمد و شر سیماں کر دے  
جنس لذت کو باہی حال اب اذراں کر دے بلکہ ہر ذائقہ دشمن کو مسلاں کر دے

پھر بعدِ جنت یاور حجاز ویرینہ ما

ہی رسد در شکم ما ز رہ سینہ ما

میری بیگم کہی جو: بزکھی حیران بھی ہوئی جانے پی پی کے نمک کی وہ پریشاں بھی ہوئی  
بھاڑ میں جانے شکر ہمد کے گزراں بھی ہوئی کیشلی ٹوٹ گئی چابایاں ویراں بھی ہوئی

غم ہے شوہر کو کہ دولت ہوئی بباد اس کی

خوش ہیں بیگم کو سنی کوئی نہ فریاد اس کی

چاک پھر شاہو بیکیں کی فنا سے دل ہوں جاگنے والے اسی بانگِ دل سے دل ہوں

پڑ ہوں بیوی کے آتش ہر کی دفناٹے ل ہوں بدلے غصے کے محبت ہی کے پیاسے دل ہوں

ماجھی اس واسطے گل شعلہ طرازی ہے مری

لاکھ غصہ ہے پہ بیوی تو خنازی ہے مری

مندرجہ ذیل نظم شمارِ یادہ نیکی کی ایک نظم کی پیروی ہے،

یونانی پتلو گئے، مجھے معلوم نہ تھا (۱) نام سے میرے چڑو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

گایاں گو سے دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا یوں مری قدر کر دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

کیا کہوں! میں نے محبت کی جہالت کیوں کہ (۲) کیا کہوں! طرزِ بغاغل کی شکایت کیوں کی

کیا کہوں! عرضِ بتا کی حماقت کیوں کی یہ سوالات کر دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

بات ہے کل کی کہ پہنچے ہوئے چھوٹی سی فراک (۳) پونچھ دیتی تھی کھلائی، جو ٹپک پڑتی تھی تاک

کج یہ ذیل، یہ ڈول، اور یہ لمبی پوشاک شل نمکری، ہی کے بڑھو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

یاد ہے یاد ہے! بچپن کا وہ عالم کو نہیں؟ (۴) منت نے کھیل جو کرتے تھے باہم کہ نہیں؟

چو کیوں تختوں پہ رہتی تھی دھما دھم کہ نہیں؟ بڑھ کے اس طرح کھلو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

ایک ہی مولوی صاحب سے پڑھا کرتے تھے (۵) ایک سے ایک خمرات میں بڑھا کرتے تھے  
 کھینٹے کودنے کو تھے پڑھا کرتے تھے بات بھی اب نہ کرو گے، مجھے معلوم نہ تھا  
 گھر سے پیسے بھی چرا کرتیں دے جاتا تھا (۶) بے تمہارے نہ کوئی چیز کہیں کھاتا تھا  
 تم جو روتے تھے، تو میں ساتھ میں لڑا تھا میرے رونے پر منہ لگے، مجھے معلوم نہ تھا  
 من اور عشق میں رہتے ہی ازل سے جھگڑا (۷) ہاں اگر تم سے سیانے کہیں دیکھے نہ سنے  
 واخلای بھی دیے، ہاتھ بھی کچھ جھاڑ دیے اس طرح جرم کے لڑو گے، مجھے معلوم نہ تھا  
 جس طرح باپ کا ڈر ہے تھیں بھائی کا خیال (۸) جس سے ہر خلق کی انگشت نمانی کا خیال  
 کاش آجائے یہی وعدہ وفا کا خیال عہد سے اپنے پھر و گے، مجھے معلوم نہ تھا  
 ایسے بھڑکو گے کہ بالکل ہی بدل جاؤ گے (۹) آکے آغوش تمنائیں اچھل جاؤ گے  
 اس طرح دام محبت سے نکل جاؤ گے پھر دوبارہ نہ پھنسو گے، مجھے معلوم نہ تھا  
 قلع خوشی اس کی کو تم میرے بنو گے عمن (۱۰) بیٹہ کے ہاتھ سے خود اپنے سیو گے کہ دن  
 اسی امید پر بھاڑا تھا گریباں، لیکن سوئی تاگا بھی نہ دو گے، مجھے معلوم نہ تھا  
 طلب پڑھی میں نے کہ تم کو جو شکایت ہوگی (۱۱) میرے ہی زیر علاج آنے کی حاجت ہوگی  
 ایکس نے حیر کرے ہاں، یہ ضرورت ہوگی ایسا بیمار پڑو گے، مجھے معلوم نہ تھا  
 مختصر یہ ہے کہ جس کی کوئی امید نہ تھی (۱۲) وہی آنکھوں سے مقد نے دکھائی ہے گھر  
 آخری وقت بھی تم متیہ کے باپیں پھری کھیاں تک نہ جھلو گے، مجھے معلوم نہ تھا  
 تم کہاں ہو ایس کیا کرتا ہوں تم سے شکوہ (۱۳) ہائے مجھ کو تو جدائی نے مڑی کو ڈالا  
 یہ خبر ہوئی، تو واللہ میں پہلے مرتا مجھ سے تم پہلے مرو گے، مجھے معلوم نہ تھا  
 وہ پر ملک کے بھی متھے سے اکھڑا جاؤ گے (۱۴) گوی عشق کے موسم میں اکڑا جاؤ گے  
 اس طرح منزل انکار پہ اڑ جاؤ گے اک قدم بھی نہ بڑھو گے، مجھے معلوم نہ تھا  
 آخر میں ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں



## تذکرہ معاصرین

شیخ آئے جو خسر میا ڈا عمل ندارد جس مال کے تاجر تھے، وہی مال ندارد  
 مال باپ بھائی ان کے بسبھی ساتھ ہیں سیر اب گھر مدرسہ ہے، سسرال ندارد  
 معلوم کیا ان کا جو شجرہ، تو یہ پایا کچھ روٹی سی نہ خیال ہے، وہ خیال ندارد  
 ماچس بندھیں آتش سوزاں سے گلے آگ  
 ہر جلے نہ پنڈال کا پنڈال ندارد



## سیلمان ارب حیدر آبادی

پچھلے سال بھرمی حیدر آبادی ادیبوں پر یہ موت کا تیسرا حملہ ہوا ہے۔ ہنوز محمد دم علی لدین اور خود شیدا احمد جہاں کی دائمی مفارقت ہی سے چارے اوسان بیا نہیں ہوئے تھے کہ، شہرگاہ سیلمان ارب کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ارب نے نسبتاً بہت کم عمری میں ان کا صحیح نام محمد تھا اور وہ سیلمان بن عبدالرزاق کے بیٹے تھے۔ ۱۵ اپریل ۱۹۳۲ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد یا فنی قبیلے کے عرب تھے۔ بزرگوں میں کوئی خاص صاحبِ حضور موت سے ہجرت کر کے حیدر آباد آگئے تھے۔ سیلمان بھی بیشتر دوسرے عربوں کی طرح حیدر آباد کی فوج (اسے سی گارڈ) میں در سالہار تھے۔ ابھی پانچ چھ برس ہوئے انتقال کیا۔ ارب کی والدہ اکوڑی ٹھکان خانہ دان سے تھیں۔

گھر کے حالات تو جیسے تھے، وہ ظاہر ہی ہے، لیکن ارب کو کم عمری ہی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا اور ۱۹۴۴ء سے تو انھوں نے اسے اپنا اوڑھنا بھونہا ہی بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی تعلیم سے بے وقوفی برتی اور دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ وہی سہی سہی ریاست نے پوری کر دی۔ ۱۹۴۸ء میں کیونسل پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس میں قید و

تک کی نوبت آئی۔ اسی سال جب حکومت ہند نے حید آباد کے خلاف اقدام کیا، تو ارب نے 'مجاہد سنگاڈ' کے عنوان سے ایک نظم جلت عام میں شائع کی۔ اصحاب افتداری کی نظر میں یہ نظم قابل اعتراض ٹھہری اور وہ گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور دو برس قید کی سزا ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء میں رہا ہوئے، تو اب مقامی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے اور امن کمیٹی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری بن گئے۔ ۱۹۵۲ء میں حید آباد کے طلبہ نے زبردست ہڑتال کی تھی، ارب نے بھی اس میں جوش و خروش سے شرکت کی، چونکہ نقص امن کا خدشہ تھا، اس لیے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ بارے، اب کے دو چھپنے بعد، اپنی نصیب ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے مزاج میں کچھ تغیر پیدا ہو گیا، اور ۱۹۵۴ء میں وہ کیونسٹ پارٹی سے بھی الگ ہو گئے۔

ارب بہت دلی تمکاد اور صحافت سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۴ء میں اپنی گرفتاری سے پہلے وہ مسقط دار جہور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور رہائی کے بعد ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ چراغ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پندرہ سالہ جون ۱۹۵۱ء میں نکلا تھا۔ اس کے کل ۴ شمارے شائع ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۵۳ء میں وہ ادارہ ادبیات ہند کے ماہنامہ سب اس کی ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے ماہنامہ قضا جاری کیا۔ دراصل یہ پرچہ انجمن ترقی اور وحید رآباد کے تعاون سے شروع ہوا تھا، لیکن بعد کو انھوں نے اپنا ذاتی پرچہ بنالیا۔ مالی مشکلات کے باعث اس کی حالت میں محمد بیقاہدگی ہوتی رہی، لیکن ششم ہفتم انھوں نے اسے جاری رکھا، چنانچہ ایران کی موت تک شائع ہوتا رہا۔

انھیں پچھلے دو سال سے کینسر کا جھک عارضہ لاحق تھا، لیکن ان کے تجسس اور وقت بڑھت کی داد دینا چاہتی ہے کہ اس سے ان کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں پارسال (مارچ ۱۹۶۹ء) کے اوائل میں غالب صد سالہ یادگار کی نقاد ارب میں شرکت کے لیے حید آباد

گیا، تو وہاں کے جلسوں میں انھیں موجود پایا۔ ابھی تین چار مہینے ہوئے، یہیں دکن میں ایک ادبی اجتماع میں پھر ان سے ملاقات ہوئی؛ وہ آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر کسی سرکاری مشاعرے میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔

اگرچہ علاج میں کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن کیسر سنوز لاء علاج ہے۔ حالت روز بروز ناکام صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ بالآخر انھیں حیدرآباد کے کیسر اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۱ء کی شام تک وہ بظاہر بالکل ٹھیک تھے اور شب کی دوائی لے کر حسب معمول سو گئے۔ صبحی رات کے قریب طبیعت کا ایک خراب مو گئی اور تھوڑی دیر بعد ساڑھے تین بجے (علی الصباح) جان بحق ہو گئے۔ جنازہ ۷ ستمبر کی شام کو اٹھا اور انھیں خیریت آباد (حیدرآباد) کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

ادیب نے شہرہ نام میں غزلیں بھی بہت کچھ لکھا؛ اس میں افسانے اور ڈرامے تک شامل ہیں لیکن بعد کہ وہ کاٹا شعر گوئی کے لیے وقف ہو گئے۔ شعروں ان کا صرف ایک مجموعہ ”پاس گریبا“ کے عنوان سے شائع ہو سکا (حیدرآباد ۱۹۶۱ء) حیدرآباد کے شاعر کا دوسرا حصہ بھی انھیں نے مرتب کیا تھا یہ بھی ۱۹۶۱ء میں چھپا۔ بہت سا کلام غیر مرتب صورت میں مندرثر پڑا ہے۔ وہ نظر اور غزل دونوں کہتے تھے۔ حال آنکہ وہ جدید دور کے شاعر تھے اور ان کے خیالات و افکار لمبی روایتی نہیں تھے، لیکن زبان کے معاملے میں وہ بہت سخت روایت پسند تھے؛ اور اس میں کسی آزاد خیالی اور پیرا ہروی کے دادا نہیں تھے۔

پس ماندگان میں ان کا اکلوتا بیٹا حسین اور بیوہ صفیہ ادیب ہیں۔ ادیب کی پہلی شادی واحد خان سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ایک لڑکی ہوئی۔ لیکن دونوں ماں بیٹیاں کے بعد دیگرے چل بسیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی والدہ کے احاطہ کے باوجود سات آٹھ سال تک دوسری شادی نہیں کی۔ اب وہ مشاعروں کے پُر لغو مزید شاعری کی حیثیت سے روشناسِ عالم تھے۔ صفیہ نے انھیں مشاعروں میں دیکھا اور سنا؛ اور اس کے بعد اپنے والد (جناب محمد نواز)

ایڈوکیٹ کی مخالفت کے باوجود ان سے شادی کر لی، مالی امکانات کی اپنی تعلیم ایم اے تک تھی، اور ادیب بیا کر کچھ چکا ہوں، انٹرنس سے زیادہ نہیں تھے۔

عشق ازیں بسا، کر وہ است و کند

اب ان کے چند شعر دیکھیے:

بے دامن و بادید تر زندہ ہوں	آئینہ بکف، خاک بسر زندہ ہوں
بھ زند خراب کو دیکھ، اے دنیا!	ہر سانس پر مڑا ہوں، مگر زندہ ہوں
گزر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے	حیات دے کے تجھے جیسے کوئی بھول گیا
بیزنگی اوقات ابھی باقی ہے	بہری حالات ابھی باقی ہے
سے ماہ بد چھوڑ کے ایسے میں تجھے	میخانے میں کچھ بات ابھی باقی ہے
سوچتا ہوں دنیا کچھ بزرگ کہاں جاؤں	تیری بے ہیزا بہن ہر نفس سے آتی ہے
ہر مرحلہ دہر کو آساں کر لوں	مرنے کے لیے جینے کا سا ماں کر لوں
چلتا ہوں، مگر چلنے سے پہلے، اے موت!	پہانے کے ہر خط کو رگ جاں کر لوں
مٹ گئے جس کے لیے نام، تم اس کا دنیا	کاش اس بات کی اس کو کبھی خبر ہو جاتی!
حق تو مریم کی ضرورت پر تری یاد کے ساتھ	ایک نثر سامنے دل کے قرین گنج بھی ہے
دہاں میں ہوں، وہی دل ہے، وہی حشر، وہی ٹوا	کو یہ خاکستری دل آج بھی آتش بد اداں ہے
جیسے اک ٹپے کو رک جاتی ہے بغض عالم	جب سے پاس سے وہ ہو کے لکل جاتے ہیں
رد زاک دامن تو کوئی نہاں سے لائے	شیوہ دیدہ خو بار، وہی ہے کہ جو تھا
تیری خوشی سے بھد نہ سکی اس کا غم نہیں	غم سے ترے بھاء کی خواہش ضرور ہے
انجام رسم و راء اگر چہ ہے سامنے	پر تجھ سے رسم و راء کی خواہش ضرور ہے
ہیج نادر نہیں بھی محبت نہیں، مگر	الطاف گاہ گاہ کی خواہش ضرور ہے
غضب تو یہ ہے کہ تیر کو بھی کچھ خبر نہ ہوئی	ہوس کا سلسلہ کب تیرے پیار تک پہنچا

حادثہ یہ ہے اہل کرم بھی نہ دیکھا تو نے      حادثہ یہ نہیں، تو مجھ کو نظر آیا تھا  
 دشت پڑ ہوئی کا اندھیرا کیا      عشق میں شام کیا، سویرا کیا  
 زمیں بھی اپنی نہیں ہے یہ مارا آج کھلا      مجھ رہے تھے دوانے، ہے آساں پنا  
 جیس کیا کیا زمانے میں بنائے ہم نے      ایک چہرے پہ کچی چہرے لگائے ہم نے  
 تیرے جلو سے بھی پہنچے دترے جلو تک      فاصلے قرب کے گو لا کھ گھٹائے ہم نے  
 وہ دن گئے کرکئی قیامت بھی انتظار      ہم ہر تھارے جوتے، قیامت گور گئی  
 یہ بھی شاید ترا انداز دل آدائی ہے      ہم نے ہر سانس پہ جینے کی سزا پائی ہے  
 تو میرے چاک گریباں سے قہر جو      میں نے کب تیری محبت کی قسم کھائی ہے  
 کیا ترساں بھی اسے انجمن آد ہے بھی      میرے پاس ہوں، لیکن وہی تنہائی ہے  
 تمام عمر میاں باکوں ساتھ دیتا ہے      جلی تھی شمع، ابھی جل رہا ہے پرواز  
 پیار کا کدکا مذہب نہیں ہوتا کوئی      کھدویر سے مطلب نہیں ہوتا کوئی  
 پچ تو یہ ہے کہ میں ہر زمیں میں تنہا ہی رہا      یوں گر پاس مرے کب نہیں ہوتا کوئی  
 چاندنی بھول، ہوا اجام، شائے خوشبو      زہر کا نام ہیں جس شب نہیں ہوتا کوئی  
 مجھ کو خود مجھ سے کب ملنے نہیں دتی دنیا      چھپ کے ملتا ہوں کبھی، جب نہیں ہوتا کوئی  
 نہیں نشہ، ہیں بخود ہی تو ہے مجھ کو      اگر شراب نہیں، تشنگی تو ہے مجھ کو  
 پرتے ہیں کب سے سر کو بھینچنے پر رکھ کے کم      کیا شہر بھر میں اب کوئی قاتل نہیں رہا  
 آج بھی ہاتھ پہ ہے تیرے پسینے کی تری      یمن ہے آج بھی شاخ شجر درد دہری  
 دل کی تسبیح سے کبھی یوں نہ گزرتی تھی صبا      اب نہ پتیا مری ہے نہ کوئی نامہ مری  
 ہم نے بھی چھوڑ دیا، مسلک بار باب دفنا      وہ بھی اب بھول گئے شیوہ بیدادگری

کرادی خوشبو

ایک شگامہ بیابان ہے ہر سو

ان گنت صدیوں سے یہ ہنگامہ  
یوہنی بپا ہے ہر سٹو  
حبس میں  
میں بھی تو بھی  
اس طرح جکڑے ہوئے دسعت و بختیک آقا دہی ہیں  
جس طرح کڑی کے جالے کے اسیر

پاس سے ہر کے مرے کوئی جوان رہنا  
جب بھی گزرا ہے مرا جی چاہا  
اس کو لٹاکے کھڑا پیار کر دوں

اے وہ پیکرِ ناخوڑہ صد عشوہ طراز  
جب بھی آیا ہے تصور میں مرے -  
میں نے جینے کی تمنا کی ہے

رات چپکے سے مرے کمرے میں  
چاند کی ایک کرن در آئی ۔  
اس نے سرگوشی میں مجھ سے یہ کہا ،  
”آؤ ہم چاند تک ہوا نہیں ذرا“  
چاند کی سیر سے جب میں لانا  
گھر کی دہلیز پر سورتج تھا کھڑا

تذکرہ معاصرین

اُف یہ ہر سادہ یہ ہنگام گل، یارب !  
عام کر دے کہ یہاں کوئی بھی  
تشنہ لب رہنے کا شکوہ نہ کرے  
ساقی کو خر سے دہاں

اب بھی ہنگام ہر ہے ہر کو  
شام سے صبح مگر کیسے ہو  
رات کی صبح نہیں ہوتی ہے  
ذہر کی ہر ہے، یا موت کی کرا دی خوشبو  
لہر لہر سے جی جاں سے گزرجاتی ہے  
پتھڑن لینے سے کچھ دیر کو غیز آتی ہے  
زندگی

آج یہ معلوم ہوا  
کچھ بھی نہیں  
چھپکلی بھی نہیں

ہاں، اسکی کئی دم ہوگی

فرسٹرین نمبر دس

ہم نے دو کتے پالے ہیں  
ایک کو مامائے آئی تھی  
جب وہ اتنا سا پلا تھا

دوسرا کتا بھی بن مانگے اک صاحب نے بھیج دیا تھا



تذکرہ مساحرین

میری بیوی دو دو کتے دان کے نہیں ہونے کی وجہ سے،

\_\_\_\_\_ رکھنے پر تیار نہیں تھی

لیکن میرے بچے کی ضد کی پا کا خر جیت ہوئی تھی

اب یہ کتے ماما کوئی گھر کی رکھوالی کرتے ہیں

ساتھ ہمارے ہی رہتے ہیں

ان کتوں سے میری بیوی پہلے بھی نفرت کرتی تھی

اور اب بھی نفرت کرتی ہے

میرا بچہ جو تنہا ہے \_\_\_\_\_ ان کتوں سے

اب بھی پیار کیا کرتا ہے

گھنٹوں ان کو ساتھ لیے گھوما کرتا ہے

میرا ان کتوں سے رشتہ، خونی یا روحانی

کیا ہو سکتا ہے؟

کتے بھی واقف ہیں اس سے

میں کہ نہیں اصحاب کھف سے

لیکن اب یہ حال ہے میرا \_\_\_\_\_ رونا

جب تک کتوں کے داتیب کا بندوبست نہیں ہوتا ہے

مجھ کو اپنا کھانا پینا جرم انسانی لگتا ہے

یہی نہیں بلکہ مجھ کو تو اکثر یہ احساس ہوا ہے

کچھ بھی نہیں اب زسیت کا مقصد

کتوں کی خاطر جیتا ہوں

## حقّی حویں، توفیق الحق میرٹھی

حویں تخلص، توفیق الحق نام، حقّی خاندانی نسبت، وطن میرٹھ۔ حقّی نسبت خاندان کے نوادر  
علی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ف۔ جون ۱۷۴۲ء) کی طرف ہے جن کا نام اس ملک  
میں حدیث کی ترویج کے سلسلے میں رہتی دنیا تک یاد رہیگا جیسا کہ ظاہر ہے، یہ خاندان دہلی  
آئی کا رہنے والا تھا۔ یہاں سے نقل مکان ان کے والد وحید الحق حقّی نے کیا: ۱۹۰۲ء میں سلسلہ ڈیگ  
میرٹھ چلے گئے اور وہیں بس گئے؛ وہ وہاں بکھری میں ملازم تھے۔

جناب وحید الحق نے میرٹھ میں ایک بڑے خاندان سے شادی کر لی تھی۔ حویں تقریباً ۱۹۲۱ء میں  
پیدا ہوئے۔ ابھی بچپن میں ایک بڑے والد کا انتقال ہو گیا۔ بچپن بہت تنگی ترشی سے بسر ہوا۔ ان کا  
خیالی بھائی قاضی نعمان احمد نے جو جی میں پیکار تھے، دیکھ بھال نہ کی ہوتی تو خدا معلوم کیا  
حشر ہوتا، بارے انھوں نے دیکھیری کی۔ توفیق الحق اور ان کی آدھوئی بہنوں کی پرورش  
اور تعلیم و تربیت انھیں کی گئی تھی۔ ابتدا میں تعلیم مذہبی علوم تک محدود رہی قرآن  
حفظ کیا اور مدرسہ اسلامیہ (گندوی بازار)، میرٹھ میں عربی اور فارسی پڑھی، گویا اچھے خاصے  
نیم طالب بن گئے۔ لیکن قدرت کو بہتر منظور تھا۔ مدرسہ اسلامیہ کے زمانہ تعلیم ہی میں انھیں

فمنوی معنوی اور دلیان حافظ نے بہت متاثر کیا اور یہ خود بھی کچھ غموں غاں کرنے لگے ۱۹۴۲ء میں ایک مقامی دفتر میں معنوی ملازمت بھی ل گئی، جس سے سبزدقات کا کچھ سہارا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ یہی نہیں، بلکہ ذاتی کاوش سے نثر و نثر میں بھی خاصی استعداد پیدا کر کے فیض عام انٹر کالج سے دسویں درجے کی سند حاصل کر لی۔

اور رفتہ رفتہ ۱۹۴۷ء میں انگریز یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد وہ باقاعدہ شاعر بننے لگے۔ شعر میں کسی سے اصلاح و مشورہ کی نوبت نہیں آئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جگر مراد آبادی کے شاگرد تھے، لیکن غالباً یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ ملازمت معنوی کلرک کی شرح کی تھی۔ ایم اے کی سند سے بھی کچھ مادی منفعت نہ ہوئی۔ اور صحر ۱۹۴۸ء میں (بمصر ۲ سال) شادی ہو گئی اور اہلی و سر وادیاں بڑھنے لگیں۔ چھ تھے تھے (جا) لڑکے اور دو لڑکیاں) یہ گرانی کا زمانہ اور آناکم مشاہرہ پریشان رہنے لگے اور آہستہ آہستہ دماغ کا توازن بگڑنے لگا۔ بات بات پر الجھا اور زود زود رنجی ان کا شیوہ ہو گیا۔

بدھ کے دن ۳۰ ستمبر ۱۹۷۰ء کو دوسرے وقت گھر آئے۔ یہاں کوئی خلاف پسند بات پیش آئی، تو جھنجھلا کر باہر چلے گئے۔ پہلے تو کسی نے خیال نہیں کیا، لیکن جب ویرنگ واپس نہیں لوٹے، تو سب کو تشویش ہوئی۔ بہت تلاش کے بعد ان کی لاش جامع مسجد (میرٹھ) کے صحن کے کھنڈوں سے برآمد ہوئی۔

اگلے دن دیکھ کر کتبہ کو چشتیہ قبرستان (نزد عید گاہ ۱۸ برس دفن ہوئے۔ ۱۹ برس کی عمر پائی۔ بالعموم غزل ہی کہتے تھے۔ کوئی مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں کچھ کلام مختلف رسائل سے جمع کر کے دیا جا رہا ہے۔

حلق کا ہو گا یہ چچا، مجھے معلوم نہ تھا      تم بھی ہو جاؤ گے دوسرا، مجھے معلوم نہ تھا  
مجھ سے پھر جا نیکی وہ چشم تو جہ بھی حواسی!      یوں بدل جا نیکی دنیا، مجھے معلوم نہ تھا  
ذوق طلب مرا حواسی کام محجب یہ کر گیا      ان کا ہی سانس ہوا، آج تو میں جدھر گیا

آج بھی ہر عرضِ بزمِ میری زباں نہ کھل سکی  
 جیسے کہ تیری ذات سے دور کا واسطہ نہ ہو  
 لیے لے تیری یاد جو بن گئی جزوِ زندگی  
 انگلیوں میں یہ نمی ہے کیوں نہ ہے چال بھا  
 عشق ہے، بخود کا نام خود ہے جو لبتِ نیا  
 جب ہو کسی کا انتظار آگئے دل کو جب سرا  
 شیوہ عشق ہے یہی، ان پہ قد اہر و زندگی  
 اگرچہ کوئی نہیں رہنمائے کوئے حبیب  
 د عرضِ حالِ شبابِ نظر، د مجناتِ شوق  
 اُٹھی کی اک نگہ لطف کا کہ شہسب ہے  
 مشاہد جاں ہے سطر جو ہر نفسِ میرا  
 کیوں ابھی ہے دل پہ دعبِ جمال  
 آپ نے سن لیا یہ بات ہے اور  
 کس سے اب ناجراے درد کہیں  
 روزِ شب کی اذیتیں، تو بہ !  
 دشواری ہے نہ ہنگامہ نہ کوئی مشوقِ مشا  
 نظر کو جستجوے کیفِ نظر رہا بھی لیکن  
 ماس کو تو مرا حالِ فقیرانہ مجھے  
 محوان کی یادیں ہوں مجھ کو اس سے کیا عرض  
 کیا بتاؤں تم کو قداحِ اس جمہوری ہوا  
 بتیلق ان سے ہو کے جانے یہ کیا ہو گیا  
 آج بھی آگے وہ مرے حال سے بھر گیا  
 یوں بھی کبھی کبھی ترے پاس سے میں گزر گیا  
 اُن سے تراخیل جو دل سے نہ غم بھر گیا  
 بیٹھے بٹھائے آج اُن کو مرا خیال کیا  
 عشق کو اس سے کیا عرض، ہر ہے کیا صاف کیا  
 لہر ایک نفسِ بہت، عرصہ ماہ و سال کیا  
 جان بھی دی اگر خوشی تو نے کیا کال کیا  
 مگر قدم ہیں اگر خود اٹھ رہے ہیں مجھے حبیب  
 نہ جلے کون سا عالم ہے رو بروئے حبیب  
 کہاں ہم اور کہاں درد نہ آرزوئے حبیب  
 بسنی ہوئی ہے مرے پر یہی میں لے حبیب  
 پُراناہ دریا بھی اُٹھا تو نہیں  
 آپ سے ہم نے، کچھ کہا تو نہیں  
 اب کوئی درد آشنا تو نہیں  
 زندگی ہے، کوئی سزا تو نہیں  
 ہیں اسے زندگی، تجھ پر گماں کچھ اور نہیں  
 حریفِ بلفِ حجاب درمیان کچھ اور نہیں  
 اس نے دیکھا تو باندازِ مریات نہ تھے  
 لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں کہ افراتہ تھے  
 یاد جب آئی تری بے اختیار نہ تھے  
 اب تو اک دنیا نظر آتی ہے جگہ نہ تھے

ہو گئے دل پر منکشف، تھے جو دمزد زندگی  
عشق تمام مگر ہی، حسن تمام سرکش  
حسن مسرودہ میں بھی کچھ پانی نہ حسن کی گئی  
اپنا ہی سو کر باطنی، کام نہ جب تک سکا  
گاہ وہ بیرنجی میں بھی ایک اداسے انکشاف  
اور بھی جو گئی فزون، عشق کی بیکراریاں  
آج تو اُن کی یاد کا دل پہ اثر نہ پوچھیے  
کہ یہ جبر عشق کا کتنا عجیب حکم ہے!  
جس کا خیال بھی حویں، نشر جاں سے کم نہیں  
یوں پر غبر خاشی، لگی ہے عشق میں گر  
ہزار شک ہے کہ ہم نثار عشق ہو گئے  
نظر اٹھی نہ لب بلبے بالآخر اُن کی زہم سے  
ترے لیے دل حویں، کہیں مگر سکوئی نہیں  
یہ کس منزل پہ آخو آگئی وادعت کی اپنی  
بتائیں کیا محبت کا اثر! بس یہ سمجھ لیجئے  
زہے جذب کشش دوری بھی اب میں حضور کی  
وہ جب سے واقف غم ہو گیا ہے  
خوشی سے خوش نہ غم سے ہو یہ عقلیں  
وہاں ہر ایک سے بیگانگی سسی  
میرا اپنے گرد ششام دسھر تو ہے  
کیسے کہیں کہ عشق کی دوست نہیں رہی

اُتے ہی باخبر ہوئے، بزم گئی جتنی بخودی  
ساتھ جہاں سے گئی، اُن رہے جنوں آگئی  
اُس رُخ پر حال کی، بزم گئی اور دکھی  
کم نہ ہوئی کسی طرح دیدہ و دل کی تیرگی  
گاہ وہ انکشاف میں، ایک اطلے بیرنجی  
پوچھیے اور حال غم، کیسے اور دل ہی  
آج تو زخم کہنہ میں آگئی جیسے تازگی  
دل میں ہو گو ہو ہم غم، رُخ پر رہے شعلگی  
یا وہ آئے اب بھی کاش، وہ دوز زندگی  
نفس نفس ہے درد دل کی داستان لیے ہوئے  
دہانے کتنے رہ گئے، شاع جہاں لیے ہوئے  
ہم اٹھ گئے خیال سہی رائجیاں لیے ہوئے  
پھرا کیے ہیں ہم تجھے کہاں کہاں لیے ہوئے  
کہ اکثر خود بھی محسوس ہوتا ہے کسی اپنی  
بہت عجب ہو کر وہ گئی، بے زندگی اپنی  
دہائی سے حویں، کچھ کم نہیں اب نہ سکی اپنی  
تو پنا خود بخود کم ہو گیا ہے  
عجب کچھ دل کا عالم ہو گیا ہے  
جو اُن کا تھا، وہ عالم ہو گیا ہے  
اس زندگی میں کوئی مرا مسفر تو ہے  
دل میں وہی خلش، وہی درد جگر تو ہے

ڈر ہے لگاؤ نہ ہو کہیں اُس طبعِ ناز پر  
 دیسے مرا فسادِ غمِ مختصر تو ہے  
 سراپا دردِ غم جب زندگی تھی  
 عجب اُس زندگی میں دکھشی تھی  
 وہ اُن کا لطف تھا یا بر بھی تھی  
 بہر صورت ادا سے دوسری تھی  
 بیاطن گفتگو ہوتی تھی اُن سے  
 بظاہر لب پہ مہرِ خاموشی تھی  
 جو کچھ پچھو تو اس جہلِ خود سے  
 حویں! اچھی مری دیوانگی تھی  
 یا نہیں! مودار پہ تھیں جن کی حضورِ انبیا  
 یا یہی بام و در ہیں! جو تیرہ و تاد ہو گئے  
 یوں تو جاں میں ہے کسے موت پرانی، سن کر  
 بتاؤں تم کو کہ مدغم جانے پر تم سے تم کیا کیا کرو گے  
 آہ وہ خوش نصیب جو ان پر شاہ ہو گئے  
 تانہ کا جب غم چلا، کر گیا کوئی نہ مہنوائی  
 کس کا کیا ذکر تو سے کبھی کچھ خفا خفا ہے یا کرو گے  
 ہزار چھوٹے مجھ سے دوری رہی کئی میں تو نا جھوٹی  
 مجھے یقین ہے نہ ہو سیکھا، جو پاس بہرِ جفا کرو گے  
 یہ بعد ظاہر ہے قربِ وطن کھلیا کہ تم پر بھی کئی اک  
 مجھے خیال ہے تم، پنے بتاؤ کیوں کر حد کرو گے  
 مری نظر سے بھی دور، و کمری نظر میں پھر کرو گے

حویں کو آسان نہیں بھلا، کرو گے تم ضبط یہ تو مانا  
 چھیننے دل میں وہ خار ہے کہ جو اشکِ غم تمہارا کرو گے

## بیدل بیکانیری شیخ محمد عبداللہ

شیخ مولابخش کے فرزند ہندو شیخ محمد عبداللہ جن کا راجستھان کے سربراہ اور وہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اپنے مولا سے حقیقی سے جا ملے شاعر تو وہ تھے ہی اور شاعر بھی بزرگ۔ یہ ایک وہ اس سے بھی زیادہ بحیثیت انسان بہت بلند تھے۔ ان کے تمام لئے داسے ان کی شرافت، نفس، دیانتداری، افسانہ دوستی، جذبہ خدمتِ خلق کے تباح و معزین ہیں۔ اگر زبانِ مطلق: نفاذِ خدا کا معقولہ درست ہے، تو یقین ہے کہ خدا اپنے فضل و کرم سے ان کی مغفرت فرما بیٹھا۔

شیخ محمد عبداللہ جنوری ۱۸۷۷ء میں بیکانیر میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان جبپور اور بیکانیر کی صنعتی روایات کا وارث تھا: یہ لوگ مصویری اور کھول چتی بنانے کا کام کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کام کی مانگ میں انحطاط پیدا ہوا اور ان کی اپنی مالی حالت بھی سقیم سے سقیم تر ہوتی چلی گئی۔ مگر کماحولِ مائیں نہ ہی تھا، اس لیے ابتدا میں دینی تعلیم اور عربی فارسی کی پڑھائی نجی طور پر ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں (یکم جنوری ۱۸۹۰ء) باقاعدہ تعلیم کے لیے دوبارہ ہائی اسکول (بیکانیر) میں داخلہ لیا۔ وہیں کی بڑائی کا یہ کرشمہ تھا کہ انھوں نے ۱۹۰۳ء

دو درجے ایک ایک سال میں پسے کیے اور ۱۹۰۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، تو اسکول بھر میں اول آئے مختلف مضامین میں اول آنے پر انعامات تو ملے ہی تھے والی ریاست بہادر جہانگیر گنگا سنگھ نے اپنی طرف سے سونے کا تمغہ عطا فرمایا۔

گھر کے حالات مزید تعلیم جاری رکھنے کے موافق نہیں تھے اور یہ مجبور تھے کہ کہیں ملازمت کر لیں۔ ان کے بیٹے ماسٹر جناب کرشن سنگھ تیواری نے جوان کی ذہانت اور ہونہاری کے قائل تھے، خود وہ یاد کرتے ہیں اسکول میں پڑھی کر لیا اور پرائیوٹ طور پر تعلیم بھی جاری رکھو۔ اس پر یہ اپنے اسکول ہی میں پڑھانے پر مقرر ہو گئے اور ساتھ ساتھ امتحانوں کی تیاری کرنے لگے۔ بالآخر ۱۹۱۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی سند ملی۔ وہ ریاست بیکانیر میں پہلے مسلمان گریجویٹ تھے (بلکہ اس زمانے میں یہاں غیر مسلم گریجویٹ بھی صرف دو ہی شخص تھے) بہادر جہانگیر گنگا سنگھ مرحوم کی خبر پہنچی، تو بہت خوش ہوئے اور اس کا عملی اظہار یوں کیا کہ انھیں ریاست کے چیف کورٹ کا جسٹس مقرر کر دیا۔ آدمی تھے محنتی اور دیانتدار، آقا قادر ان ملا، تو انھوں نے اور بھی تندہی اور اخلاص سے اپنے فرائض کو سرانجام کیا جیسا کہ چیف جج داسے بہادر جہانگیر گنگا سنگھ انھیں اپنا دست راست سمجھتے تھے۔

بہادر جہانگیر نے ان کی کارگزاری دیکھ کر ۱۹۲۳ء میں انھیں اپنی وزارت کا سکریٹری بنا دیا۔ یہاں وہ تقریباً دو سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد یہ جلد جلد ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ اس دوران میں ریاست کا انتخابی قانون بھی پاس کر لیا۔ اور قیادت میں رد و بدل ہوا، تو چونکہ ۱۹۲۳ء میں یہ منصف مقرر ہو گئے۔ ان کے عدل و انصاف اور ہمدردی کی تعریفیں کہ وہ سب دھبہ اللسان تھے۔ ترقی کر کے ۱۹۳۲ء میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ زیدی ریاست میں صرف تین اضلاع تھے، جو اس زمانے میں ریاست کے عدلیہ میں بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہیں سے ۲۳ سال بعد ۱۹۵۶ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

چونکہ خدا نے فراغت نصیب کی تھی اور درود کی دولت سے نوازا تھا اس لیے خواہاں



کے کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ درگاہ نوگزا اپرکا مدرسہ اسلامیہ انجمن کا قائم کردہ ہے،  
بلکاس درگاہ کی عمارت بھی اپنے خرچ پر تعمیر کروائی تھی۔

فارسی کے منتہی تھے۔ اس کے علاوہ اردو انگریزی پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کی قلمیت  
کے جوہر خاص طور پر ترجمے میں نکلتے تھے۔ ریاست کے متعدد تاجرانہ مقدمات کے فیصلہ دہ

اردو اور انگریزی ترجمان کی عمارت زبان اور اصطلاحات قانون میں انصاف کے مروجہ منت ہیں۔

کے دوستی و قربانی کی بعض اہم فارسی استادینوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ شاہجہانی عہد کی مشہور

سازش بادشاہ ناصر (عبدالحمید لاہوری) کے اس قصے کا ترجمہ جو راجستھان سے متعلق ہے، انھیں کاغذ پر لکھا

ابھی انشراک تو ان میں نہیں دیا تھا کہ ۱۹۱۰ء میں شہر کوئی کاغذ پیدا ہوا۔ بیدل تخلص اختیار

کیا اور عارضہ کے شاگرد رشید منشی وحید الدین احمد بنجو، دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) سے اصلاح لینے

لگے۔ راجستھان کے رہنے والے تھے، لیکن زبان اسی صاف اور بہشت و رفعت لکھتے تھے کہ استاد

کو ان پر فخر تھا۔ جن اصحاب نے بنجو کو دکھایا ہے یا ان سے بات چیت کی ہے، وہ جانتے ہیں کہ

وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور کسی کو اپنی ہلار کا شاعر نہیں سمجھتے تھے ان کا بیٹھہ مشہور ہوگا۔

ایک دن اپنے استاد بھائی ذاب ملوچ الدین احمد خان سائل دہلوی (ف ۱۹۴۵ء) سے جو دماغ

کے داماد بھی تھے، باتیں کر رہے تھے، کہنے لگے بھائی سائل! اب دہلی میں شاعری کا خاتمہ ہی سمجھو۔

اے دے کے ایک تم اور ایک میں، دو ہی شخص اس کے نام ہو اہ گئے ہیں، ہمارے بعد بس اشد

کا نام ہے۔ اور بھی، سچ پوچھو، تو تم بھی کیا ہو!

آخر، بنجو نے جو سنا، اسے اس شاگرد کی زبان اور بیان اور تخیل سے متعلق دی ہے وہ بیدل

کے دیوان باغ فردوس کے شروع میں موجود ہے۔ بنجو دیکھتے ہیں کہ بیدل نے میری زبان پر

ڈاکڑ ڈالا ہے۔ میرے پاس ال دینا سے اور کچھ تو تھا نہیں، ایک زبان لکھا تھا، وہ حضرت

بیدل کی نذر دہلی، ان کے صحبت سے شعر میرے ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ بھی اپنے استاد کے مداح اور عاشق تھے۔ لکھتے ہیں:

شاعر نہیں ہے حضرت بنو، ساہنہ میں شہر ہے آج جن کا جہاں میں بجائے داغ  
حضرت بنو کا ہر شاگرد ہے ساغر بکفت بنو دی طاری ہوئی بیدل کا دیوان کچھ کر  
دیوان کا نام تابخ فردوس تاریخی ہے جس سے ۱۲۵۳ء تک جوتے ہیں۔ لیکن یہ اس سے ایک  
سال بڑھائے ہوا تھا (لاہور ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۶ء) اس سے مختلف اصناف سخن پر قدرت کا ثبوت  
ملتا ہے۔ ایک ایک صفحے سے حب رسول اور اولیائے ہمت سے عقیدت نمایاں ہے۔ عام  
غزل کہتے ہوئے بھی اس میں نعت یا منقبت کے شعر کھنکھتے ہیں۔ سلامت طبع اور بے غنجل کلام  
کا خاص جوہر ہیں۔ بابخ فردوس کے علاوہ اور کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ بہت سا کلام  
غیر مطبوعہ رہ گیا۔

وفات سے پہلے پانچ چھ دن تک طبرستان سے بیمار رہے۔ اس سے شفا یاب تو ہو گئے، لیکن نقاہت  
بہت بڑھ گئی تھی جو کبر سن کا تقاضا تھا۔ اسی حالت میں ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو فجر کے وقت عالم  
جاہدانی کا سفر اختیار کیا! ۸۲ برس کی عمر پائی جو سرگٹھ (بیکانیر) کے قریب کے پرانے  
قبرستان میں دفن ہوئے۔ اولاد میں سات بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ راجیہ سبھا کے رکن جناب  
محمد عثمان حارف ان کے صاحبزادے ہیں۔ وفات کے وقت مشر پوتے پر تیاں، نواسے لڑیاں  
اور ان کے بچے ان کے سوگواروں میں تھے۔

مختصر انتخاب کلام ملاحظہ ہو،

موقع ملا ہے خود مجھے دیوان پر ناز کا	ب پرے جو نام ہے اس کا دسا ز کا
کس منہ سے شکر ہو سکے بندہ لوار کا	کیا عشق نے بڑھایا ہے رتبہ یاد کا
پردہ اٹھا دیا کہیں راز و نیاز کا	جلوہ مگی پردہ بن گیا موسیٰ کے واسطے
ختم ہے نضول عبر قلیل و دراز کا	دم تو دیا ہے دم جو تری یاد میں کئے
بھک پڑے ہم توجہ ہر اربے جانان دیکھا	کعبہ دیکھا نہ کبھی قبیلہ ایمان دیکھا
درد پر تیرے کوئی بسن کوئی بیجاں دیکھا	تیر دیکھا نہ ترے تیر کا پیکان دیکھا

جان مضطرب، جگر بوخت، آنکھیں پُر غم  
منظرِ شانِ جمالی و حسالی ہم ہیں  
فہم الفت کا مزہ اسے دلِ نادان دکھا  
ایثارِ تہ بھی کبھی حضرتِ انساں دکھا  
دل بھر گیا، وہ جوشِ قہر نہیں رہا  
اٹھ کر ہمدرد سے در سے جو کوئی چلا گیا  
اک بار ادا کیجئے، تجھے اختیار ہے  
دل ہے شقائق، کہیں وصل کا سماں ہوتا  
مدہوش ہی نہیں واقفِ اسرارِ معرفت  
آبروِ اشکِ بندہ ملتے بڑھادی میری  
کچھ بے اختیار ہوئے دل سے آوازِ محبت  
خاکِ لطفِ زندگی ہے جب تمام گئی  
دلِ بقیابِ افشا کر نہ لے راہِ محبت کو  
تھے وصل کے مزے تو دلِ نا صبور تک  
مڑ مڑ کے دیکھتے رہے مجھ کو وہ دور تک  
دلِ مضطرب تو الزام ہے رسوائی کا  
دلِ دبیدر کو دنا تھا عقیں اسے بیدار  
وہ دیکھا ہے، جو کچھ دکھایا خدا نے  
دل سے چکا جب اس بنِ بیدار کو میں  
وفا ہی بزمِ حسن کی عاشق کے دم سے ہے  
جب تک دسوز دل میں ہوا اٹھتا نہیں ملتا  
وہ آنکھ کیلے جس میں تری جستجو ہو  
جس میں تری آرزو ہو

یہ درجہ حسن و الفت کچھ سمجھ جاسی نہیں آتی

جو ہے بیگانہ مجھ سے ہے اکاکی آرزو مجھ کو

بیدل: بتوں سے دل کے بچانے کا حوصلہ ہم بھی سلام کر لیں گے اچھا، جناب کو  
دیر و حرم میں شیخ ذہر بہن لڑا یہی ہے نقد نگری ہے ساری یہ ترے حجاب کی  
جب دید تماشا ہے کہ نظروں میں بیاں سب ہو

دم نظارہ حیرت سے ہمیں آنکھیں، تباہ میری

دل لگی مجھے تھے، بیدل: ہم کسی کی چاہ کو . پھیر یہ تو جان کا آزار ہو کر رہ گئی

## مصطفیٰ زیدی (تیغ الہ آبادی)

الہ آباد میں ایک خاصے معروف شیعہ خاندان کے فرویدہ نعت حسین سی آئی ڈی انسپکٹر ہوئے ہیں۔ ان کا نام ہماری جنگ آزادی میں یادگار دیوینکا۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں تاریخی مقدمہ بغاوت علی ہادیان مولانا حسین احمد دہنی، جگت گوردیشکر آچاریہ (سوامی کرشن تیرتھ) پر غلام محمد دشتی، ڈاکٹر سیف الدین کچلاو، مولانا ثناء اللہ کاپوری پر کراچی میں چلا تھا۔ اس کی فرد جرم یہ تھی کہ ان حضرات نے آل انڈیا خلافت کانفرنس، کراچی ۱۹۴۰ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس مقدمے میں مولانا محمد علی کی تقریروں کی جو اردو تحفہ رپورٹ عدالت میں پیش ہوئی تھی وہ انہیں سید نعت حسین صاحب نے سرکار میں بھیجی تھی۔ وہ خود بھی پہلے ہی دن عدالت میں بطور رگواہ استغاثہ پیش ہوئے تھے اس مقدمے کے علاوہ ان کی رفع پر مولانا محمد علی کے خلاف کچھ اور مقدمے بھی دائر ہوئے تھے، ان سب میں بھی سرکاری رپورٹ سید نعت حسین ہی تھے مولانا محمد علی کی بدلتی شہور ہے۔ ان کا نام سننے پر ان کی رنگِ ظرافت پھر دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے نعت حسین صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے

یہ شرفی امیدیہ اس دن کہا تھا۔

محمدؐ کا دشمن، علیؑ کا عدد

نہ کہ اپنے کو تختِ حسین تو

سید تختِ حسین شاعر نہیں تھے، لیکن اس کے جواب میں انھوں نے کہا:

علیؑ اور محمدؐ سے کیا تجھ کو کام

تو کراہنے گا ندھی کی حجت تمام

اس کے سولے ان کا اور ایک مصرع بھی نہیں ملتا۔ ان کا ۱۵۰ اس میں انتقال ہوا۔

سید تختِ حسین نے وہ نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے پانچ بیٹے ہوئے: احمد رضا، حمید رضا،

امیر رضا، عابد رضا اور ناصر رضا؛ اور دوسری بیوی سے تین: عفتی حسین، مصطفیٰ حسین

اور ارتضیٰ یلین۔ یہی مصطفیٰ حسین ہمارے شاعر مصطفیٰ زیدی (سابق چیف الرکابادی)

ہیں، جن کا انتقال افسوس ناک حالات میں ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو پیر کی شب کراچی میں ہوا۔

سید مصطفیٰ حسین ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو الرکابادی پیدا ہوئے تعلیم معقول طریقے پر ہوئی تھی۔

۱۹۵۷ء میں مقامی ماڈرن اسکول سے دسویں درجے کی سند لی۔ شعر گوئی کا شوق اسکول کے

زمانے ہی میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ تیغِ تخلص اختیار کیا اور تیغ الرکابادی کے نام سے مشہور

ہوئے۔ بہت ذہین اور اپنی عمر کی بہ نسبت کہیں زیادہ غور و فکر کے عادی تھے۔ میں نے

ان کے بعض احباب کے پاس ان کی ۱۸-۱۹ برس کی عمر کے کچھ خطوط دیکھے ہیں؛ ان سے

ان کی مختلف مسائلِ حیات سے متعلق آراء کے نیچے پن اور جدت اور بڑی حد تک نچلی پر

واقعی حیرت ہوتی ہے۔ وہ جوش ملیح آبادی سے بہت متاثر تھے اور فراق کے دوستوں اور

ہمنشینوں میں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ”ذخیرِ مینا“ کے عنوان سے ۱۹۷۱ء میں اسکول جھوک

کے ایک سال بعد الرکابادی سے شائع ہوا، جب کہ وہ محض ۱۷-۱۸ برس کے تھے۔ یہ قطعاً

پرشتعل ہے اور روبرو کے شروع میں فراق کا طویل مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے اس ذخیر

ادیب کی جید تعریف کی ہے۔ اس میں زوجان شاعر کی تصویر بھی ہے؛ اس کے نیچے یہ شعر ہے:

قد فراتین کی اے دختر گلگ و جمن

تینے جو اس وقت ہے پھیرے شعر و سخن

۱۹۴۸ء میں وہ ایک ادبی ماہارہ رسالے کرن کے ایڈیٹر بن گئیں۔ حال اُن کا بھی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے ایوانگ کو پھین کالج سے انسٹراور ۱۹۵۰ء میں لکراؤ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔

۱۹۵۱ء میں وہ پاکستان چلے گئے جہاں اُن کے دونوں حقیقی بھائی پہلے سے مقیم تھے۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں ہندستان میں ایم اے ڈاگنری کے پہلے سال کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اب دوسرے سال لاکھنؤ کے گورنمنٹ کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں آیا، اور کامیابی کے بعد چند سے اسلامیہ کالج لکھنؤ اور پشاور یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان کول روس کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوئے اور منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مختلف اضلاع میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہے۔ ۱۹۶۵ء کی ہندستان دہلی کی کونجی جینٹلش کے بعد وہ لاہور میں ٹیچر مقرر ہوئے تھے۔

دورِ براتی میں وہ خامے کامیاب رہے۔ اور اُن کا زمانے میں اپنی نمایاں خدمات کے لیے متعدد اعزازات عظم کے اعزاز سے نوازے ہوئے۔ لیکن صد ایوب کے زوال اور دستور سازی کے بعد ان کے متعدد دوسرے دوستوں کی طرح یہ بھی مستحب ہوئے اور ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ یہ اُن کا سال ۱۹۷۰ء کے شروع کی بات ہے۔

مصطفیٰ بڑے صحتمند اور دجیبہ تشکیل آدمی تھے۔ ان کی طبیعت اعلیٰ کے زمانے کے بھی بعض جوانی افسانے سننے میں آئے ہیں۔ بالآخر انھوں نے ہم اکٹو لکچر جن خاتون (دو برائیاں ہل) سے سبائیکوٹ میں شادی کر لی۔ ان سے دو بچے (بیٹا: مجتبیٰ، دلاوت ۴ اگست ۱۹۵۸ء اور

۵ ان کی وفات کے سال بھر بعد ۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو حکومت پاکستان نے ان کی اعزازی تدفین دہلی۔

یعنی بصیرت مولودت جنوری ۱۹۶۰ء میں جب ملازمت سے الگ ہو گئے، تو اپریل ۱۹۶۰ء میں انھوں نے بیوی بچوں کو برلن بھیج دیا۔ وہ خود بھی وہاں جانے کے لیے پرتوی رہے تھے کہ جب تک فضا صاف نہیں ہو جاتی، ہمیں ملک کے باہر سکون سے دن گزار لیں۔ اسی سلسلے میں تھوڑے دن سے ایک دوست کے ہاں کراچی میں مقیم تھے، جہاں پُر اثر حالات میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۰ء صبح ان کی لاش ملی۔ جو زید فیصلہ نہیں ہو سکا کہ انھوں نے خود کشی کی یا قتل کیے گئے۔ مقتدر عدالت میں برسرِ حیات بنھوں نے ۱۹۵۵ء میں پہلا غلط فیصلہ ترک کر دیا اور اس کی جگہ مصطفیٰ لکھنے لگے تھے، اب تیغِ اربابو کی بجائے ان کی مصطفیٰ زیدی کے نام سے شہرت تھی۔ زنجیریں (۱۹۶۴ء) کے بعد انھوں نے اپنی زندگی میں چار اور مجبورے شائع کیے، روشنی (نظمیں) (۱۹۶۹ء)؛ شہزادہ (کراچی جنوری ۱۹۵۹ء)؛ موجِ میری صدف صدف (دہریا پریس، ۱۹۶۰ء)؛ قبا سبز (لاہور ۱۹۶۷ء)؛ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا دورِ جدید کے مقبول شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ ابھی عمر ۵۵ کی تھی؛ مشکل سے ۴۰ سال پورے کیے تھے۔ کوئی دن اور جیسا ملے، تو ترقی کے بہت امکانات تھے؛ لیکن وقتِ مقررہ کو کون ٹال سکتا ہے، نوئے کلام ملاحظہ ہو!۔

کر بلا

کر بلا! میں تو گنہگار ہوں؛ لیکن وہ لوگ  
جن کو حاصل ہے سعادت تری فرزند کی  
بجھ سے، روح سے، احساس سے، عمار کیوں نہیں؟  
ان کی مسادہ جیوں، ان کے شکستہ تیمور  
گردشِ حسنِ شبِ درود پر بھاری کیوں ہیں؟  
تیری قبروں کے مجاور، ترے مہر کے خطیب  
فلس و دینار و توجہ کے بھکاری کیوں ہیں؟

۱۔ جید مکتوبہ کے عنوان سے پہلی برسی پر اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔



دوہڑ شاہ شہیداں پر اک انبوہِ غلطیم  
 بل ایر اور کرسٹر کے نئے ماڈل کو  
 اسی خاموش عقیدت سے سکا کرتا ہے  
 جس کو کہ دوں، تو کئی لوگ برا مانگے  
 غیر تو ہر عزم کون و مکان تک پہنچے  
 کر بلا تیرے یہ غمنوار کہاں تک پہنچے  
 دل کو تہذیبِ رقتا میں خدا ملتا ہے  
 سوڑنا تو سونپنا وہ میں خدا ملتا ہے  
 بترے دلوانوں کو اسے شاہِ بدر یاے فرت  
 اپنی بیگانگی ذہن میں کیا ملتا ہے؟

لوگوں کی ملامت بھی ہے، خود دوسری بھی	کس کام کی یہ اپنی دسلی انٹری بھی
کس طرح خود اپنے کو نہیں آئے کہ اس سے	ہم خاک نشینوں کی ملاقات رہی ہے
کسی تو کام زمانے کے سو گوار آئے	تجھے جو پانے سکے از سیت کو سنوار گئے
یہ اور بات کہ ساقی سے قرض مل نہ سکی	حضورِ حضرتِ جرداں تو باوقار گئے
آخر تمام عمر کی دستِ سماجی	اک لہو اگڑشتہ کی چھوٹی سی بات میں
انہی پتھروں پر چل کر، اگر آسکا، تو آؤ	مے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں
پتھروں کے استابِ بیا، آنکھوں کے بام میں	سر چھوٹنے کو ایک نہیں، سو مقام ہیں
تہے تو ایک دلی کی کلی بھی نہ کھل سکی	یہ بھی بلاکشانِ محبت کے کام ہیں
وہ کیا کرے جوتیری بدولت نہ منہں سکا	اور جس پر اتفاق سے آسہ حرام ہیں
منعم کا تو خدا بھی امین بت بھی پامیاں	مفلح کے صرف تیغِ علیہ السلام ہیں

ماتھ رو ا دیدہ درو با کفر کا الزام د دو	میرے اکا د میں اک پر تو الہام بھی ہے
عشق بخود دار اپنے پند جنوں چھوڑ بھی دے	اب تو ان آنکھوں کی خوشی ہی انجام بھی ہے
برف کے خم ادا اس سینے پر	دش کرتی ہے شعلگی میری
سو کا راگ چھیر کر لے تیغ!	سکراتی ہے زندگی میری
تھکیاں دیتی ہوئی، سنبھتی ہوئی، کھاتی ہوئی	ہر خم و دریاں کو میں نیند میں لاتی ہوئی
دھن گزریں کس کی انگلیاں، اے ہمیش!	میرے ان اچھے ہوئے بالوں کو سلجھاتی ہوئی
حسن خود میں کی عشوہ کاری دیکھ	آپنے دیدار کے عوض اس نے
ساند و بربط، صراحی و ساغر	دے کے بہلا دیا کھلو لوں سے
سرود و نغمہ دئے ساز و جام، اپنے دے	کہ ہر نشاط پر خم کی نگاہ ہے ساقی!
یہ بزم وہ ہے، جہاں بے صدا ہے ساز و حیا	یہاں تو آہ بھی کرنا، گناہ ہے ساقی!
میں عشق مکمل کا ہوں پرورد، اے دوست!	صیدِ مونس اندک و بسیار نہیں
بس جامِ شراب، اوداں کا دیدار	میں اور کسی شے کا طلبگار نہیں

پسر احمد آزاد

اسرار احمدؒ کا ازد صاحب داپہر منہا لان (ضلع سہارنپور) کے رہنے والے تھے، جہاں وہ اگست یا ستمبر ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نور احمد صاحب چوڑے کا کاروبار کرتے تھے، ان کا سن ۱۹۷۰ء دیرہ دون میں انتقال ہوا۔ ازد صاحب نے دسویں درجے تک تعلیم اسلامیہ سکول سہارنپور میں پائی تھی۔ چونکہ گھر کے مالی حالات زیادہ سازگار نہیں تھے، اس لیے وہ تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ لیکن تھے بلا کے محنتی اور قویں۔ اس لیے ذاتی جدوجہد سے انہی نے بھی استعداد پیدا کر لی کہ مشکل سے مشکل انگریزی عبارت کا ترجمہ آسانی سے کر لیتے تھے۔

آزاد صاحب کی ان اہمیاں کہ ال میں تھی۔ یہ تلاش معاش میں وہاں تھی، تو ان کی دستا  
سے پاکستان کے سابق وزیر اعظم صاحبزادہ یاقوت علی خان (ف) اکو برٹش ایمر کے بچوں کے  
اتالیق مقرر ہو گئے۔ جہاں یہ تین برس رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ یاقوت علی خان مرحوم انھیں  
کے صلاح و مشورے کے نتیجے میں سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ آزاد خود مولانا ابوالکلام  
آزاد سے بہت متاثر تھے، اور نظریاتی لحاظ سے کانگریس کے بائیں بازو سے متعلق تھے، بعد  
کچھ عرصہ کمیونسٹ پارٹی میں بھی شامل رہے۔

کرنال کے زمانہ قیام ہی میں انھوں نے ایک پرچہ "العزم" شروع کیا تھا، لیکن تین سال بعد مالی مشکلات کے باعث اسے بند کرنا پڑا۔

کرنال سے واپس آئے، نو سہارنپور میں ایک بینک میں ملازمت کر لی۔ لیکن اس میں ان کا دل نہیں لگا۔ چنانچہ وہاں سے دلی چلے آئے۔ یہاں انھیں مختلف اخباروں میں ترجمے کا کام مل گیا۔ وہ بیڑے بھی کچھ سرپرستی کی۔ اس کے بعد مولوی حفظ الرحمن مرحوم کی سفارش پر روزنامہ الجہد کے شذے ایڈیٹر کی ترتیب ان کے سپرد ہوئی۔ کوئی تین برس تک وہ اس جنگ کام کرتے رہے (۱۹۴۷ - ۱۹۵۰)۔ اس کے بعد "الذہاب" اور "دین و دنیا" میں کام کرنے لگے۔ ان کے لیے وہ اجرت پر ترجمے اور طبع آزمائی میں لگتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک نیا ذاتی پرچہ "جدوجہد" کے نام سے بھی نکالا تھا، لیکن یہ بھی تین چار سال بعد مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کمیونٹ پارٹی کے پرچے "عوامی دور" (پیپلز وچ) کا (دو حصہ) کے ادارہ "تحریریں" بھی شاید دو برس تک (۱۹۵۸ - ۱۹۵۹) کام کیا۔

بین الاقوامی سیاسیات اور تعلقات پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ چنانچہ انھوں نے کئی برہن کے لیے جدید سیاسی معلومات کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ اردو میں اس نوعیت کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی، لہذا انھوں نے اسے نکل گئی۔ حالات بھی تیزی سے بدل رہے تھے، اس لیے انھیں اس کا نیا ایڈیشن تیار کرنا پڑا۔ انھوں نے اسے "از سر نو" جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات کے نام سے مرتب کیا اور یہ تین حصوں میں شائع ہوا (۱۹۵۶ - ۱۹۵۸)۔ کئی برہن نے ان کی ایک اور کتاب "مارشل ٹیٹو اور جہور یہ یوگو سلاویہ" بھی شائع کی تھی (۱۹۴۶)۔ ان کی ایک کتاب "کشمیر اور اس سے متعلق منہ و ستانی موقف کی وضاحت میں مسئلہ کشمیر" کے عنوان سے بھی چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ "دنیا کی مسلم حکومتیں" اسرغ جس کے تحت "دریہ شاد" اور "چاناکا ترجمہ" بھی ان کی تصانیف ہیں۔ انھوں نے بے بسی کچھ کتابیں بھی

تھیں مثلاً گاندھی جی اور غیاثی سمجھائش برس کی سوا پندرہ ماہ مسات تارے، پچھوٹا دو موٹی، سرخ پکے وغیرہ۔

سیاسیات کے بعد ان کی دلچسپی کا دوسرا موضوع اسلامیات تھا۔ وہ دل کے قدیم اسبابے ادین دنیا میں نہایت باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ ان کی ایک کتاب سیرۃ صحابہ چھپ چکی ہے؛ یہ ان کی وصیت مطالعہ اور نکتہ آفرینی پر وال ہے۔

۱۹۶۵ء میں وہ کثیر حکومت کے پرچے چار کے بہرہ پر سر جگر چلے گئے۔ وہاں تقریباً تین برس کے قیام کے بعد ۱۹۶۸ء میں ڈیرہ دون آئے جہاں انھوں نے اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔

۲۰ نومبر، ۱۹۷۱ء (۱۹ رمضان، ۱۳۹۰ھ) بروز جمعہ بھری کے بعد داغ کی رگ بھٹ جانے سے انتقال ہوا۔ پانچو روڈ ڈیرہ دون کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔ اپنے بھتیجے اعجاز احمد (خلف پر و فیسر امتحان احمد) کو گودے لیا تھا؛ دیا ان کے وارث ہوئے۔



## ناشاد کا بنوری، سری دھڑ پر شاد نگم

غالب نے ایک مرتبہ کہا تھا:

سو پشت سے ہے پیشہ اکا با پہ سگری  
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

کم و بیش ہی صورت ناشاد کا بنوری کے ساتھ پیش آتی جن کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا۔ ان کا خاندان (نگم کا نسب) دراصل قنوج کا رہنے والا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں ان کے جدِ اعلیٰ نقل مکان کر کے کانپور آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہاں انھوں نے خاصی جااد پیدا کر لی تھی۔ خاندان میں سب سے پہلے ۱۸۲۶ء میں منشی درگا پر شاد فوج کی ملازمت میں داخل ہوئے؛ یہ ناشاد کے پردادا منشی کا لکا پر شاد کے والد تھے (دادا کا نام تلجا پر شاد تھا) اس کے بعد فوجی ملازمت گو یا خاندانی پیشہ بن گئی۔ خود ان کے والد درگا صاحب گو کرن پر شاد و سالار (کمیشن افسر) تھے (۶ دسمبر ۱۹۳۲ء) دونوں چچا بھی فوج میں تھے۔ ناشاد کے بڑے بھائی منشی گجا دھڑ پر شاد بھی فوج میں ملازم تھے۔ ناشاد ۱۹۰۸ء کو اپنے لڑے پیدا ہوئے جہاں ان دنوں ان کے والد تعینات تھے۔ ابتدائی

تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اس کے بعد محبوب کالج، سکس، آباد (دکن) میں داخلہ لیا جہاں  
 اہلے سے ان کے والد کا تبادلہ ہو گیا تھا؛ دسویں درجے تک یہاں پڑھتے رہے۔ انٹر کا  
 امتحان نظام کالج، حیدرآباد سے دیا۔ اب یہ کانپور چلے آئے، بی اے کی تعلیم یہیں حاصل  
 کی۔ اخیر ۱۹۳۱ء میں ایم اے (انگریزی) کی سند آگرہ یونیورسٹی سے لی اور اسی سال  
 نو مہر میں سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے گھانم پور تحصیل (ضلع کانپور)  
 میں نائب تحصیلدار کے عہدے پر تعینات ہوئے۔ بتدریج ڈپٹی کلکٹر تک ترقی پائی۔  
 ۱۹۴۲ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

خانوان کی روایت فوج کی تھی، لیکن فارسی (اور اردو) سے کاشفہ خانانوں کا شغف  
 بھی روایت ہے۔ ناشاد کے دادا افادہ کے شاعر بھی تھے۔ ناشاد نے گویا شاعری ورثے میں  
 پائی۔ شرواع میں جناب گنگا دھرتی ناتھ فرحت کا پوری سے شوق رہا۔ اپنے وطن کے مشہور  
 ناماد رسالے 'ازاد' (کانپور) میں نثری مضامین لکھتے رہے؛ اسی دور میں چند نکاحیہ مضامین  
 بھی قلمبند کیے تھے۔ کلام بھی ازاد، کے علاوہ ساقی، اکمل وغیرہ میں چھپتا رہا۔ اسی زمانے  
 کا ایک مضمون ہے جس میں جناب فرحت کی استاد کی اعتراف کیا ہے:

فکر نشاط آج ہے بحر آفرین

فیض فرحت کا بھی اعجاز ہے

مدتوں بعد ملازمت کے دوران میں جناب شام موہن لال جگر بریلوی سے ملاقات ہوئی تو  
 ان سے اصلاح لینے لگے۔ اب بہت دن سے فارغ الاصلاح ہو چکے تھے، لیکن آخر تک  
 استاد کے عاشق زاد اور جاں نثار رہے۔

غزل اور رباعی پر زیادہ توجہ دی۔ پہلا مجموعہ (کیفِ سرمدی) ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں چھپا  
 تھا۔ ایک زمانے بعد مزید اضافوں سے اسے 'سرورِ سرمدی' کے عنوان سے شائع کیا۔  
 (لکھنؤ ۱۹۶۸ء) اس میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ سب کچھ موجود ہے۔ بیدِ نغمہ اور بلند نغمہ

مرتبہ کلام ہے! کہیں ابتذال یا عروانی لا شاہجہ تک نہیں۔ چھوٹی تھوڑی سہل متن شعر کہنا ان کا فرق امتیاز ہے۔

۴ نومبر کو دل کا دورہ پڑا، کاپٹروں نے مکمل آرام کی ہدایت کی۔ ۳ دسمبر کو معدے میں درد کی شکایت کی، تو اسپتال بھیج دیے گئے۔ یہیں پہنچنے کے دن ۵ دسمبر، ۱۹۷۷ء رات کے ساڑھے گیارہ بجے دل کی حرکت بند ہو جانے سے رصحت کی۔ آخر تک بقائے ہوش و حواس طاعن ان کے افراد سے پتہ کرتے رہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں!

دل میں اک موج رنگ و بو آٹھی	اور شہرج عالم ایجاد کیا
ہر نفس پیام محبت ہے، ہمنشیں!	آج یہ کس کی یاد آئی ہے
تلاش کرتے ہیں وہ کچھ بہاں سے	یہ زندگی نہیں ہے عبادت ہے ہمنشیں!
دیکھتے ہیں تری نگاہوں کو	گلا کس کو ہے اب عمر رواں سے
بدگمانی کو بھی خدا سمجھے	علم کے ماروں کی زندگی کیا ہے!
بدگمانی سی بدگمانی ہے	کیا کہا میں نے، آپ کیا سمجھے
ہوں، تریسوں پُر اڑانے میں	تم محبت کو تم سمجھے
زندگی کٹ گئی خوش و ناخوش	آپ اچھے ہیں! خیر، کیا کہیے
حالِ ناشاد پوچھتے کیا ہو	اس کے آگے اب اور کیا کہیے
عشق کی عظمتوں سے نادان	دل بھر آتا ہے! آہ، کیا کہیے!
میں تو کہتا ہوں، اردگ ہے دل کا	کر رہے ہیں ابھی جبین سانی

اب تمہیں کچھ دوا ہے محبت کیا؟  
 دل و حشر مٹا ہے کیوں خدا جانے  
 جس پہ لاکھوں سترتیں صدف تے  
 ایک ایسی جی عنم کی رات ہوئی



کاٹتا ہوں جو عمرِ ردِ رو کے اس کو کیا دن ہوا کہ رات ہوئی  
 چاند تارے بھی اب تو سونے لگے لے غم بھر بکنتی رات ہوئی  
 ترے در سے اٹھ تو جاؤں، تو ہی مصلحتی سے کہ دے  
 ہے مری جبین کے قابل، کوئی اور آستانہ  
 ایک دل کی کلی نہ کھل پانی پھول لاکھوں کھلے، ہمارا آئی  
 ناشاد کے سوا بھی بہت جانِ ثار ہیں کیوں یاد آئی آپ کو، اس خاکسار کی  
 جب بات بات پر وہ وہ کہے یاد آئیں صاحب! تو ہی بتا دے کیونکر تھیں بھلائی  
 ہاں چھوڑ دیں وہ آفت، لیکن یہ ہو سیکے گا وہ ہم کو بھول جائیں ہم یاد بھی نہ آئیں  
 ناخدا کیا کہا ہے، کس نے کہا یہ تم سے وہ یاد کر رہے ہیں، کیا خوب دان جائیں  
 اپنی خبر جو چاہے کوئی کچھ بھی کرے، دل نہ ٹکائے  
 لطف و کرم کی تاب کسے ہے رہنے بھی دو! اب دجھوئی  
 سجدے کرتے ہیں رات دن، لیکن بندگی عمر بھر نہیں ہوئی  
 تم کس کے نہیں زمانے میں اک دامنِ نگر تھا را ہے  
 سب ہے دل آنے کی بات عشق نہ جانے جات گات  
 تم سچے لو، ہی جھوٹا کون بڑھائے تم سے بات  
 عشق کا بھی کیا کھیل ہے، پیامے! پیچھے بازی، پہلے مات  
 حال نہیں ناشاد کا اچھا اب ہے اس پر بھاری رات  
 یہ مانا، ناشاد بڑا ہے تم نے کوئی اب دیکھا  
 تذکرہ تھا گزشتہ اتیام کا آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے  
 جان کر کون آگ سے کھیلے! جان دے کون عاشقی کر کے!  
 دل سے کب تک بات بنائیں ان کا کیا! وہ آئیں، نہ آئیں

اس پر بھی جب وہ یاد آئیں	ترکِ محبت کر دیں، لیکن
یوں ہی کب تک دھوکا کھائیں	ہے بھی کچھ، یا کچھ بھی نہیں ہے
یاد کیا آیا، آنکھ سہرا آئی	سن کئے ناشاد! پیار کی باتیں
سچ تو یہ ہے جس سے بھی دسم دفن بھی نہیں	کہنے کی بات اور ہے، کہنے کو کوئی کچھ ہے
بات کچھ ایسی تھی نہیں، تم نے مگر سنی نہیں	گٹھی دل کی دل میں بات اور نہی گور گئی جیسا
دیکھ لو اس سے مانگ کر اس کے جہاں کی نہیں	دین پر اس کی شک ذکر ہاتھ زرا دراز کر
عجب وہ دن تھے، جب تم ہیراں تھے	دفا پر بھی مری کیا کیا گماں تھے
پیارا براہ یہاں آئی گئے، یہاں، محبت تک؟	یہ تجھے کس نے کہا کچھ بتا تو کس نے کہا
منہ سے نکلی، جوئی پرانی بات	حالِ ناشادان سے کیا کہیے
یوں بھی ہوتا ہے، کوئی بات نہیں	حالِ ناشاد سن کے نہ مایا
پیشیاں آپ جوں، ایسا نہیں ہے	یہ مانا حالِ دل اچھا نہیں ہے
کہ جیسے آج تک دیکھا نہیں ہے	انہیں ہر بار ہم یوں دیکھتے ہیں
بہت دن سے تمہیں دیکھا نہیں ہے	جہت جی چاہتا ہے، دیکھنے کو
اور کہنے کو کچھ کہا بھی نہیں	نگہ ناز سہم گئی سب کچھ
کہ نہ پائے ہم ان سے بات دی	بے تک آکر جو رہ گئی ہر بار
اسے خانہاں خراب اکھاں کی ہوا لگی؟	ناشاد! تیرے چہرے کا کیوں رنگ اڑ گیا

## آغا خلس کا شمیری، طفیل احمد

آغا خلس امرتسر کے رہنے والے تھے۔ وہ مدرسہ پیشہ تھے۔ سعادت حسن منٹو (فجوری) نے اپنی طالعلمی کے زمانے میں ان سے کچھ پڑھا تھا۔ جب افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کی شہرت ہوئی، تو بیسی کے مشہور فلمی رسالے "بھوہر" کے مالک محمد نذیر صاحب نے انھیں اس کی ادارت کی پیشکش کی۔ منٹو نے اس شرط پر اسے قبول کرنے کی ہامی بھری کہ میسٹر استاد آغا خلس کو بھی ادارہ تحریر میں شامل کیا جائے۔ اس میں منٹو کی اتادری اور سعادت منندی کا جذبہ ضرور تھا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ بڑی وجہ یہ تھی کہ منٹو کو اپنی زبان اور بیان پر پورا بھروسہ نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ آغا خلس اگر ادارہ تحریر میں آگئے، تو اس پہلو سے اطمینان رہیگا۔ یہ آزادی سے پہلے کا قصہ ہے۔

تو یہ تھے آغا خلس، زبان و بیان کے ماہر، شاعر اور شعر فہم، صحافی اور ادیب۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا جو مزاج تھا کہ نہ ستائش کی تمنا نہ ہلے کی پردا، "وہ شاید عمر بھر بھی امرتسر سے باہر قدم نہ رکھتے، لیکن مکھے کو کون مٹا سکتا ہے، یوں وہ امرتسر سے بھی پہنچ گئے۔ کرنا خدا کا کیا ہو اگر اس کے بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ منٹو پاکستان سدھارے اور ملک محمدیہ

وہاں جو نبی آدم کی آخری منزل مقصود ہے۔

اب مقصود خلش کی زندگی کی گویا واحد ایسی بن گئی، ادا کے پرچوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ تندرست صاحب کے انتقال کے بعد مقصود بھی ادا کا غلط ہو گیا۔ اختیار لانا بند ہو گئے، چونکہ خلش صاحب دنیا پر فلم کے خداؤں کے سامنے سرسجود نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے پرچوں کی سرپرستی سے محروم ہو گیا۔ اس کے باوجود حوصلہ نہیں ہارے۔ کیا کیا مصیبت نہیں اٹھائی انھوں نے اس کے لیے۔ بیوی کے تن پر ڈھنگ کا کپڑا نہیں؛ گھر میں پیٹ بھر کھانے کو آنا نہیں، ایک مکان کے دیے کو کرایے کے دام نہیں؛ لیکن یہ مرد کلندہ مقصود کے لیے مانگے مانگے سے انتظام کر لیتا اور اسے چھاپ کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا۔

آخر سب کے پریشان رہنے لگے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پریشانی اب ناقابل برداشت ہو گئی، درد پریشان تو وہ سدا کے تھے۔ اس پر انھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ سحری کے بغیر رمضان کے پورے روزے رکھے، کڑوری ہو ناہی چاہیے تھی۔ عید کے دن ہمارا ہو گئے۔ صبح اٹھے اور بھاری حالت میں ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیا۔ یہ گویا سرسجود کو تھی۔ دوستوں نے یہ ہوشی کی حالت میں جے جے اسپتال کے خیراتی دارۃ میں چھپوا دیا۔ وہیں ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء کے ساتھ آٹھ بجے جان بحق ہو گئے۔

جس دن مرے ہیں، ان کی بیوی کے پاس سادہ جمع جتھالے دے کے ۳۶ روپے تھے۔ دوستوں نے تجزیہ و تکفین کا انتظام کیا اور اگلے دن ۱۶ دسمبر سہ پہر کو انھیں تاریں باڑی (بہی) کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

لاؤ لہر فوت ہوئے۔ ۷ برس کے قریب چلائی۔ جناب ذرا لٹ لوری دلیلیہ جلیں ہاں کھولا  
نے تا رنجہ ذفات کہی:

دکسی میں آئیگی یہ ادا، دکسی کی ہوگی پریش  
تری یا دیم کو تہیگی و تہیگی دل سے خلش خلش  
کوئی پچھے تہہ سے جو سال غم تو یہ کہتا آج غم  
یہ جو سال بڑا دل جو ہی اس عیسوی سن غم  
۱۹۷۰ء

اور وہاں ان کا اڑھنا بچھونا تھی۔ لغات اور روایات کے مصادر و مآخذ میں معتبرانہ ہمارے تھی۔ زبان میں وہ کوئی بدعت بلکہ حدیث تک بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے اور اس معاملے میں ہر کسی سے الجھنے کو تیار رہتے تھے۔ معلومات اتنی وسیع اور معتبر تھیں کہ وہ کسی پر اعتراض کرنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ اسی لیے شاید ان کے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع نہیں تھا۔ خزانے کے ساتھ منشی بھیرا دی تھے، ۲۵۔ یہ سے زیادہ کسی صورت میں نہیں ہونگے۔

نمونہ کلام میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

ان کو کیا زود عددہ فردا نے شرمسار	دکھا کہیں کا بھی نہ ہیں اعتبار نے
ہم کو سنا نا پڑ گئی اب میکدے کی خیر	چمکے سے شیخ عی جو لگے ہیں پد جانے
کا فردا ہے سلطان، بڑی مشکل ہے	تنگری میں بھی ہے ایمان، بڑی مشکل ہے
زود تقاضا ہے کہ مر جائے نہ اپنا پانی	راہ میں پڑتی ہے دھولوان، بڑی مشکل ہے
سو گئی سایہ و لوا ریس قسمت میری	اور یہ بیدار ہے دربان، بڑی مشکل ہے
جان نثار لکھا دیل گروہ ہے، تو جان نثار	جان سے جانا مری جان، بڑی مشکل ہے
شوق برباد ہے، فریاد و تسنا مرہ	بزم دل ہو گئی دوران، بڑی مشکل ہے
موت ہے لذت ایذا طلبی پر طاری	مشکلیں ہو گئیں آسان، بڑی مشکل ہے
سخت جانی کی بندھی وعدہ فردا سے ہوا	پر خطا ہو گئے اوسان، بڑی مشکل ہے
ہم نے مانا ہے پریشانی خاطر کا سبب	دلف خود بھی ہے پریشان، بڑی مشکل ہے

آدمیت کی علامت ہے خلتش و ایشہ

آدی کوں ہے، پچان، بڑی مشکل ہے

پسند آیا ہے دل میرا تو اپنے پاس پہنچے دو مجھے ساری خدائی کڑیا کہتی ہے کہنے دو  
جگر کا سوز اول کا داغ ہوئے ہیں لغت محبت کی سجاوٹ کو مجھے کافی ہیں گھنے دو

خدا رکھے، اکیلے ہو، اکیلے تم ہزاروں میں      ہزاروں دکھ اکیلی جان پر مجھ کو بھی ہے۔  
 مجھے اجڑے ہوئے دل کی زمیں یلرپ کر رہا ہے      گھڑی بھر کے لیے آنکھوں کے دیباؤں کی ہے۔  
 ہاں شرم ہے بیشک مضافِ جامِ ہستی  
 غلش کی آدمیت نے بھی کپڑے ہیں یہ پہنے۔



## دیبا بریلوی، نارائن داس ٹنڈن

۱۹۰۱ء میں بریلی (مملکہ بہاری پور) پیدا ہوئے۔ اپنے والدین کے اگوتے بیٹے تھے۔ ان کا خاندان تجارت چیشہ تھا، پکڑے کی آزمت کا کاروبار تھا؛ مگر میں کسی چیز کی نمی نہیں تھی۔ جب ۱۹۲۲ء میں ان کے والد اللہ بہاری سرٹنڈن (کھتری) کا انتقال ہوا، تو نہ صرف کاروبار کا بلکہ پورے خاندان کی دیکھ بھال کا بار بھی ان کے کندھوں پر آ پڑا۔ انھوں نے اسے موازنہ وار اٹھایا، کام کو ترقی دی اور اس میں بہت کامیاب رہے۔ خوب دوست پیدا کی، جس سے ان کا شہر کے معزز اور باثر لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔

انھوں نے پرانے طرز کی اردو فارسی کی تعلیم پائی تھی۔ ہنر ٹنڈل کے درجن میں پڑھتے تھے کہ اپنے استاد منشی رجبیر دہال کے اردو فارسی کے دلکاویز طریقہ تعلیم اور شعر خوانی سے متاثر ہو کر ۱۹۱۵ء میں شعر کہنے لگے۔ بہت ہی کم کسی کو اس کا علم نہیں ہوا۔ دو سال بعد جب منشی رجبیر دہال کو اس کا پتہ چل گیا، تو انھوں نے خود وہ دیا کہ اپنے کلام پر پامٹر ملے اور پڑا تو وزن سے اصلاح دیا کہ وہ سوزن مرحوم قوم کے کاسٹھ، بڑے پختہ شاعر اور زود گو شاعر تھے جس میں مصلح شاعرہ میں بیٹھے بیٹھے پوری غزل کہہ لیتے تھے۔ استاد میں مولانا حسن رضا خان

حسن بریلوی تلمیذ دانش (ف اکتوبر ۱۹۰۸ء) سے کچھ استفادہ کیا تھا، لیکن باقاعدہ اصلاح منشی رام بہادر لال جو یا آنولی (ف ۱۹۲۸ء) سے ملی۔ بریلی کے مشہور سندھو شاعر سوزن کے شاگرد ہیں۔ عمر کے آخری ایام میں دماغ کا تو اذن بگڑ جانے سے یونہی بازاروں میں گھومنا پھرا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ دینے سوزن سے استفادے کا اعتراف ایک قطعے میں بھی کیا ہے:

کچھ تو عنوانِ نغزل، کچھ شعورِ فن کا فیض  
 طبع کی کچھ حقیقتیں، کچھ دانشِ روشن کا فیض  
 اب جدا احساس میں ہے منزلِ شعر و سخن  
 دہرِ فکر آیا ہے حضرت سوزن کا فیض

استاد نے ۱۹۲۵ء میں فارغ الاصلاح کر دیا تھا، بلکہ اس کے بعد اپنے مبتدی تلامذہ کو بھی ان سے شعور کرنے کی ہدایت فرماتے۔ وہ عام طور پر شاعروں میں نہیں جلتے تھے ایک تو گردہ بندی سے نفرت تھی، اسی پر ہر کہ دمہ کو جوہر اودی جاتی ہے، اس سے بہت شخص ہوتے تھے۔ ان کا معاملہ حباب کی عقل میں خوب چپکتے تھے۔ طوعاً و کرہاً کبھی شاعرے میں جلتے، تو بڑے وقار سے کچلے ترنم میں پڑھتے، یوں معلوم ہوتا تھا، گو یا خود اپنے کلام کی عظمت میں محو ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی کہتے تھے۔ دیا تخلص ایسا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں جگہ آسانی سے استعمال ہو سکتا ہے۔

پانی وضع کی تعلیم اور سائیدہ کی تربیت کے زیر اثر غزل سے مزاحمت ہونا ہی چاہیے تھی اس کے علاوہ انھوں نے آزاد نظمیں بھی کہیں اور شاعروں میں سنائیں۔ انتخاب کلام شام بہاراں کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (دیکھو ۱۹۶۷ء) اس میں غزلیات، نظمیں، قطعات سبھی کچھ ہے۔ ہندی کلام غالباً شائع نہیں ہوا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۶۷ء کو بریلی میں انتقال ہوا۔ فشارِ دم، ریلوے پریشر کے پرانے مرض تھے، لیکن



خوری سبب قانع ہوا ۔

ان کے دم قدم سے بریلی میں اردو اور شعر گوئی کا چرچا تھا۔ ایوہ شاگرد بننے کے قائل نہیں تھے، اس میں اہلیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ جناب گو پیشور رائے مہرا دیکھیں بریلی، ہر تخلص ان کے خاص شاگردوں میں سے ہیں ۔

اب نمونے کے چند شعرا خط ہوں، جو ان کے مجموعہ کلام شام بہاؤں سے اخویں؛  
 اک تماشا بن گیا میرا سکونی مجھ پہ جب رازِ دل مضطر کھلا  
 زندہ بخدا ہو، یا شیخِ حرم ہے درِ رحمت، دیا سب پر کھلا  
 وعظ کہے میں، گھر میں مینوشی جس کو دیکھو، وہ پارِ سنا نکلا  
 اپنے شکوؤں پہ ہے دیا، نا دم در دھبی دل کا آسرا نکلا  
 دینِ زندگیِ حمت، دیا! ہے نہیں دنیا میں کوئی ناتواں کا  
 جن کی پرداز میں پنہاں ہے فریجیل ایسے گستاخِ غباروں سے مجھے کیا بنا  
 کیف بہا رکھا ہے، مذاق بہا رکھا ہر اک ادا پسند ہسی، اعتبار کیا  
 یہ ہے آئینہ کل اہل دنیا کا ایساں، زباں بیچ ڈالی، دہن بیچ ڈالے  
 بہادوں نے بیجا ہے ناز بہاؤں، گلوں نے حبیبیں پر بہن بیچ ڈالے  
 ترا شکر یہ، افتخارِ بد زمانہ! نئی بندگی ہے، نیا آستانہ  
 پہل سی باتیں، نہ پہلا زمانہ سناٹیں، تو کس کو ستائیں خزانہ  
 ترکِ نئے کی بات بجا ترکِ بے آسان نہیں  
 اس کو غم، اس کو تسکین جلوؤں کا ایساں نہیں  
 دل میں ہیں ان کے جلوے ہوتا اطمینان نہیں  
 اب نہ وعدہ ہے، نہ کچھ بہاؤ ہے شامِ غم بھی بے سرو سامان ہے  
 عشق نے کیا کیا عطا کی نعمتیں درد ہے غم ہے، ترا ارمان ہے

سوچ کر کہے کہ مشکل ہے عمل      بات کہہ دینا بہت آسان ہے  
 کعبہ ہے، تنگدہ ہے، نقشِ قدم کسی کا      مولاؑ زندگی ہے سجدوں کی انجمن میں  
 میں تو دیوانہ ہوں، ویرانہ ہے میری حیات      جن میں رہتی ہیں بہاریں وہ جہاں کیسے  
 دنیا کی آرزو، کبھی حق بننے کی جستجو      بزمِ عجم حیات بھی تنہا نہ رہیگی  
 وعدہ کی بات چھوڑیے، وعدہ سکون نہیں      وہ دن نہ ہے نصیب، تنہا نہ رہیگی  
 غم نے عطا کیا، دیا! احساںِ رحمدلی      اک دروِ دادِ دادی دوا آج ہوئی ہے  
 تمہارے درد سے کیفِ دوام ملتا ہے      ہر ایک درد نہیں دروِ جاوِداں کی طرح  
 کبھی گلوں کا قہار، کبھی بہار کی بات      نفس میں زندگی گزری ہے آج کی طرح  
 وہ حیات میں تیرا کرم، غمِ منزل!      ہمیشہ ساتھ رہا میرے پاساں کی طرح  
 بہت اکٹا گیا دیر و دم سے      کسی کا تنگ رہے، اور میں ہوں  
 عزیزوں نے دیا کچھ اور کا ندھا      بہت لمبا سفر ہے، اور میں ہوں  
 مسکرا کر یہ کہا: آپ کو دیکھا ہے کبھی      نامِ حبیب میں نے بتایا، تو بُرا مان گئے  
 فخرِ عدنا نہ تھی خاموش، تنہا میری      حالِ دل ان کو بتایا، تو بُرا مان گئے  
 کتنے دیوانے ہیں ہم، سودا کہاں کا سریں ہے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں اس کو، جو ہمارے گھر کا ہے

دوسرا ہے اوہ شمعِ سوزاں، بدنام اُدھر پر دل نہیں  
 یہ محفل ہے دیوانوں کی، اس لڑکوں کوئی کیا جانے  
 چشمِ نازک! کہاں ہیں وہ لہو کے آئینو؟      رنگ بھرتے تھے جو برسات کے آئینے میں  
 کچھ بچا چلے مدسکا، جذبِ نظر تک جس کا      اس کو دیکھا ہے خیالات کے آئینے میں  
 بہارِ گل میں نہ رنگ و بو سے بہا رہیں ہے      شعورِ زندگی جتنا خلوصِ خدا رہیں ہے  
 یہی ہے دادِ بخشش! زرا اسی تجھواری      دہاں کی بات ابھی دل کے اٹھتیاں ہیں ہے

یہ بہاریں بھی تجھی سے ہیں، خواں بھی تجھ سے

ہم بہرِ حیش، بہرِ غم تیرے دامن میں رہے

فکر بہارِ خوش نشین، دکن کا عزم دنیا کی ہر بہار ہمارے جبین میں ہے

وہ رنگیں تبسم، وہ حسنِ کفِ گل مرے غم کو تو نے کہاں سے صدوی

وہ چوڑے جنغیں جستوں سے سکوں ہے مری زندگی ہے، مری نامرادی

ہے اتنی سی تعبیرِ خوابِ دریا کی کسی نے کسی کو کہاں فی شادی



## باسط اوجہنی، نیا محمد خان

اوجہنی کے ایک جاگیردار خاندان کے چشمہ دچاغ تھے؛ ۲۲ فروری ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ گھر میں خلا کا دیاسب کچھ تھا، لیکن ان کے والد غلام محمد خان (دف ۱۹۲۸ء) نے، معلوم کس جنگ میں اپنی ساری جادو عزتوں اور دولتوں میں تقسیم کر دی، حد یہ کہ اپنے پاس بس اوقات تک کے لیے کچھ بھی نہیں رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ باسط صاحب کی ابتدائی عمر بڑی تنگی ترشی میں گزری، اور اسی باعث تعلیم بھی ناممکن رہ گئی؛ بشکل آٹھویں درجے تک پڑھ سکے۔ یہی کسی حد تک انہوں نے بعد کو ذاتی مطالعے سے پورا کرنے کی کوشش کی اور یوں اردو اور ہندی دونوں پر پوری طرح حاوی ہو گئے تھے۔

چونکہ ان کے والد غلام محمد خان صاحب نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تحریک میں ہمیشہ قوم پرور رویہ اختیار کیا تھا، باسط بھی نوجوانی سے سیاست میں حصہ لینے لگے۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے اجموؤں کو برابر کے حقوق دلانے کی ہم چلائی تو باسط نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس میں انہیں خود اپنے خاندان کے اکثر افراد اور خاص کر مسلم لیگ کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے کسی کی پروا نہ کی اور جواب میں کہہ دیا:

وہ جو کعبہ یا کمندر، تو غرض نہ دیکھ کسی سے

تجھے آدمی بنادے، وہ حرم قبول کر لے

کامنویسی خیالات کا نو تیار ہونے کی وجہ سے نہ صرف مخالفت کسی طرح کم نہ ہوئی، بلکہ اس میں تباہی کی اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر انھیں ترک وطن کرنا پڑا۔ اب انھوں نے بمبئی کی راہ لی۔ یہاں انھوں نے ۱۹۴۵ء میں ناٹھر نام کا ایک ہفتہ وار پرچہ جاری کیا۔ تین برس بعد ۱۹۴۸ء میں بعض احباب کی دعوت پر بھوپال پہنچے۔ وہ مختلف اوقات میں بھوپال کے کئی رسائل و جرائد مثلاً ہفتہ وار بکاوار، روزنامہ نیوم، ہفتہ وار اُجالا (ہندی) نیا قدم (ہندی) سے بھٹیست نائب مدیر اور مترجم وابستہ رہے۔ اپنے دورانِ قیام میں وہ بھوپال کے سماجی اور تعلیمی حلقوں میں بہت مہرگرم تھے۔ خاصاً مدت تک مدھیہ پریش کا نگریس کمیٹی کے مرکزی دفتر میں بھی ملازم رہے۔ اس سے یہیں سمجھنا چاہیے کہ انھیں سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حالات بہت روزنامہ موافق تھے، ہر زیادہ اپنے ساتھ نئی شکایات لاتا، لیکن اس سے ان کی چیشانی پر کسمبلی نہیں آیا۔ انھوں نے اول روز جو راہ اختیار کر لی تھی، استقلال اور انجام سے بے پروا ہو کر اس پر گامزن رہے۔ ان کا آخری زمانے کا ایک شعر ہے:

یہ بات دوسری ہے کہ کچھ تھک گئے ہیں ہم

لیکن ہمارے حوصلے منزل کے پاس ہیں

ان کی متعدی اور جذبہ خدمت خلق کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ایک سخت مدھیہ پریش کی حکومتی و فارتی زبان ہندی کر دی، اور اردو دان ملازم اس سے بہت کراہت ہوئے کہ اب کیا ہوگا، تو باسط صاحب ان کے آڑے آئے۔ انھوں نے ہندی بڑھانے کو ایک شبینہ اسکول جاری کر دیا، انصاف کے لیے خود ایک کتاب آسان ہندی ”کٹھ کر چھاپا۔ اور یوں دن رات کی محنت سے مختصر مدت میں سکھائی ملازموں کو (اور غیر ملازموں کو بھی)

آجی خدی سکھا دی جس سے وہ اپنا شخصی کام منہدی میں سر انجام دینے کے قابل ہو گئے۔  
اردو کے فروغ کے لیے انہوں نے بھوپال میں "مجلس احباب کے تعاون سے ایک "مزم سخن"  
بھی قائم کی تھی۔ چین اور پاکستان کے ساتھ لائے کے زلمے میں اس مزم نے کل منہد مشاعر  
منقد کیے اور ان سے جو آمدنی ہوئی، وہ ملک کے دفاعی چنڈے کی نذر کر دی۔

بے عرصے تک مسلسل کثرت کا رادو کافی آمدنی کے فقدان اور پریشان حالی نے رفتہ رفتہ ان  
کی منہد رستی کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں اور پٹ قے آدھ چاہا ب پیرض لا علاج نہیں رہا۔  
لیکن ڈھنگ کے علاج کے لیے بھی قور و پیر درکار ہے؛ اور یہی ان کے پاس تھا نہیں۔ سب  
سے پہلے اس کا ہلکا سا حملان کے قیام مہی کے زلمے میں ہوا تھا۔ اس پر دوستوں نے انہیں  
"ناما میوہیل اسپتال میں داخل کر دیا۔ یہاں سے وہ لفظ ہر اچھے ہو کر گھر آ گئے؛ لیکن واقع  
میں روگ جڑ سے نہیں گیا تھا۔ بھوپال میں دن رات کی جفا کشی زندگی سے وہ دبے ہو  
اثاث پھر ابھر آئے۔ پہلے بھوپال کے اسپتال میں علاج ہوتا رہا۔ جب کچھ افادہ ہوا، تو  
یہاں سے اپنے دکن اور چین کے اسپتال میں منتقل ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی حالت روز بروز  
بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اسی میں، ۱۴ دسمبر، ۱۹۷۷ء صبح نو بجے اپنے مکان پر انتقال ہو گیا  
اسی دن عصر کے بعد عید گاہ قبرستان میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے قریب دفن  
ہوئے۔ اولاد جسمانی میں ایک لڑکا (اعجاز شمس) اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔

سیاست کی طرح شعر گوئی کا شوق بھی کم عمری میں پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ملیر (رحیم  
عسرت قریشی (ف) ۱۹۶۰ء کے حلقہ تلخ میں داخل ہوئے۔ اور پھر خود بذور باز وہ مقام پہلے  
کر لیا کہ آج بھوپال اور مالوے میں ان کے بیسیوں صاحب دیوان شاگرد موجود ہیں (فوس)  
ان کا اپنا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ مدت ہوئی، ان کے شاگرد دھبہ قریشی صاحب نے  
ان کے سوشل ایک کن بجے میں شائع کیے تھے (بھوپال ۱۹۴۷ء) دیوان "نقش آرزو" کے  
عنوان سے مرتب موجود ہے۔ منہدی میں بھی ایک کتاب جیون دیکھا (اپنے حالات میں)

غیر مطلوب ہو گئی۔ اس کے علاوہ بہت کلام مختلف رسائل میں بھی منشر حالات میں پڑا ہے۔  
موت کے طور پر چند شذوہ میں دن کیے جاتے ہیں:

موت کو زمانہ حسین راحت جب سمجھتا ہے	موت میں مری حالت اگلی بوری کی کیوں ہو
کاشاد حیات کی تمار کیوں کا حاصل	تاروں سے پوچھتے ہیں، کبھی چاندنی سے ہم
زندہ دل کسی کی جفاؤں نے چھین لی	اب اجنام عرض تمہارا نہیں رہا
میری بختی کے باعث غرق کشتی ہو گئی	کچھ نہیں طغیانی امواج سے شکوہ مجھے
دارنگی شوق نے رنج و دہشت دیا	ہم اقیانوس منزل جاننا نہ کر سکے
ذوقِ سحر و عشق کا اللہ سے احترام!	سر کو اٹھا سکے نہ ترے آشاں سے ہم
عشق کے سوز و ساز سے طلب کو آشاں تو کر	اب بھی وہی ہیں شوخیاں حسن کے التفات میں
اکتابِ مالِ غنم کے لیے	زندگی ہے، مگر بہت کم ہے
انہماکِ وفا شعار ی بھی	اک دلیلِ فریبِ پیہم ہے
یہ سجدہ و عارفانہ بڑے کام کے ہیں، لیکن	وہی سجدہ بیخفا ہے، جو صنم قبول کر لے
مصلحت سے لاکھ دور بھی دل کے پاس ہیں	طوقاں بدوش ہیں مگر تو سال کے پاس ہیں
یہ بات دوسری ہے کہ کچھ تھک گئے ہیں ہم	لیکن ہمارے جو صلے، منزل کے پاس ہیں
بیابانِ عمر کو جامِ خوشی بھی عطا کیا	ایسے کمال بھی مرے قاتل کے پاس ہیں
شعر و ادب کی شمع جلائی ہے اس لیے	پرہیزِ ادب تر ی مصلحت کے پاس ہیں

غم بھی مجھے ملا ہے، خوشی بھی ملی مجھے  
بسطایہ دو خوائے مرے دل کے پاس ہیں



## شاغل جیپوری احترام الدین احمد عثمانی

ان کا سلسلہ نسب ۲۵ واسطوں سے حضرت عثمان خلیفہ مہموم سے ملتا ہے۔ خاندان کا  
 مسقط الرأس گاردون میں مصافحات شیراز تھا۔ ان کے موصوفہ اعلیٰ مولوی درویش محمد مفتی  
 برائیں تھے، جہاں سے ان کے ایک بیٹے مولوی دین الدین ۱۱۶۴ھ میں قاضی مقرر ہو کر نازول  
 (پنجاب) چلے آئے۔ اس طرح خاندان کی ایک شاخ نازول میں بس گئی۔  
 ۱۸۵۷ء کے جنگا میں دنیا دیگر گوں ہو گئی تھی۔ کسی اور شرفا کی طرح شاغل کے تاجدار مولوی  
 محمد عثمان تسلیم (خلف قاضی حبیب الدین) کو بھی تلاش روزگار میں وطن سے کلن پڑا۔  
 تسلیم اچھے عالم اور اذکار کی بلند پایہ شاعر اور شاعر تھے۔ ان کا کلام مطبوعہ و غیر  
 مطبوعہ بہت ہے۔ منجملہ ان کے مشنوی حدیقۃ المذہب بھی ہے، جو انہوں نے سندھ کی  
 کجواب میں لکھی تھی، یہ جھپ چکی ہے (اور ۱۸۵۸ء) انہوں نے کلام پر اصلاح اپنے  
 ان مولانا رشید الدین فاروقی (متخلص بہ منظر و ناز) (ف ۱۸۸۶ء) سے لی تھی۔ ناز  
 پہلے سے اور قبل کا محجہب جیپوری مدرسہ اول ہو کر چلے گئے تھے۔ تسلیم بھی ۱۸۵۸ء میں یہاں  
 کے مدرسہ تنظیم میں مدرسہ اول ہو کر آئے اور پھر مدت العمر گویا جیپور کے ہو کر رہ گئے۔



کچھ دن اس مدرسے میں کام کیا تھا کہ ریاست کے مفتی ہو گئے۔ ان کا انتقال اپنے وطن نارول میں ۱۲۲ اپریل ۱۸۸۴ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۳۰۱ھ) کو ۴۵ سال کی عمر میں ہوا۔ وہ اپنے خاندانی قبرستان میں آسودۂ خواب ابدی ہیں۔

شیکم کے ایک چھوٹے بھائی محمد احتشام الدین تھے۔ یہ بھی شاعر تھے، شوکت تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ریاست جیسو کے محکمہ پولیس میں ملازمت کی اور ترقی کے مدارج طے کر کے کورٹ انسپکٹر مقرر ہو گئے؛ اس زمانے میں پوری ریاست میں صرف ایک ہی کورٹ انسپکٹر ہوتا تھا۔ ان کا ۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو جیسو میں انتقال ہوا؛ وہیں گھاٹ دروازہ کے باہر کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ان کی ایک کتاب سلسلۃ المذہب طبع ہو چکی ہے۔

شافل صاحب نہیں مولوی محمد احتشام الدین کے صاحبزادے تھے۔ مفتی کے دن ۴ دسمبر ۱۸۶۹ء (۲۸ جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ) کو جیسو میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں منہی تھے اور یہ اپنے خاندان کے مختلف نژادوں سے پرمی تھی؛ کچھ عربی بھی جانتے تھے۔ والد کی حیات میں انھیں کسی کوئی کام کرنے کی فکر نہیں ہوئی۔ جب ان کا سایہ سر سے اٹھ گیا (۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء) تو اب یہ چونکے۔ خوش قسمتی سے والد کی ملازمت آڑے آئی اور یہ کو تو ال مقرر ہو گئے۔

۱۶ جنوری ۱۹۱۷ء ملازمت کا پورا پورا پولیس کے محکمے ہی میں گزرا، او وہیں سے آخری مرتبہ ۱۹۵۱ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد کوئی دو برس تک مسلم ہائی اسکول میں اردو فارسی کے مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ شہداد و رطوبت طالت کے باعث جہاں سے فارغ ہوئے تو پھر کوئی کام نہیں کیا۔ خدا کے فضل سے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ایک زمانے سے قبض کی شکایت تھی۔ جاڑوں میں نزلی بھی دائمی فریق تھا۔ اب کے ان دنوں امراض نے شدت اختیار کر لی اور اسی میں ۸ جنوری ۱۹۷۱ء صبح سات بجے دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ غیرن گھاٹ دروازہ (جیسو) کے قبرستان میں اسخری خواب گاہ نصیب ہوئی۔

آلہ علیہ وآلہ ابیہ راجعون۔

اولادِ جہانی میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار ہیں۔ بڑے ابو الفضل محمود الدین عثمانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (شعبہ سیاسیات) میں ملازم ہیں اور چھوٹے ڈاکٹر ابو نعیم اسحاق عثمانی گورنمنٹ کالج، ٹنک میں اردو کے پروفیسر۔

گھر گھر کا ماحول علمِ فضل اور شعور و شاعری کا تھا، چنانچہ یہ بھی چھوٹی سی عمر میں شعر کہنے لگے۔ اس میں اولادِ چند دن اپنے رشتے کے بڑے بھائی اسامہ الدین احمد نسیم (دف ۱۳۴۳ھ) سے اصلاح لی اور پھر انھیں کے کہنے پر میرزا محمد تقی بیگ مائے دہلوی (دف ۱۹۳۲ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ مائے خود امراؤ میرزا نور کی وفات (۱۳۵۲ھ) کے بعد شاغلِ حساب کے تیار تسلیم سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ شاغلِ تخلص رکھنے کا باعث یہ ہوا کہ ایک تو یہ استاد کے تخلص مائے کا بمقام فیہ تھا اور دوسرے اس سے ان کے آغازِ شاعری کا سال بڑا ہو تا ہے یعنی ۱۳۳۱ھ لیکن صریح بات یہ ہے کہ شاغل نے شاعری پر کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں کی۔ محض ترضیٰ طبع سے کبھی کبھار لیتے تھے اور اسے کبھی معفو نہ رکھنے کا التزام نہیں تھا۔ وہ شری بھی لکھتے تھے۔ ان کی تعداد کتا میں چھپ چکی ہیں۔ ان میں بعض غزلوں کو اس کے انتظام اور قاعدے قانون سے متعلق ہیں۔ زیادہ اہم علمی کتابیں تذکرہ شاعرانہ جیسپور (دلی ۱۹۵۷ء) اور صحیفہ خوشنویسیاں ہیں (دلی ۱۹۶۳ء)؛ یہ انہیں ترقی و رد کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی بہت اچھے خوش نویس تھے، ابھی پارسا (دلی ۱۹۵۷ء) اپنے دیوان کا پہلا حصہ شائع کیا تھا۔ اس کی کتابت بھی انھوں نے خود کی تھی ان کی تحریر ایسی عمدہ اور روشن اور خوش خط ہوتی تھی، جیسے موتی پر دستے ہوں۔ بہت کچھ غیر مطبوعہ بھی رہ گیا۔ ان کے مرنے سے ایک شریف انسان اور اردو کا ایک شیدائی ہم سے جدا ہو گیا۔

نودہ کلام میں کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

دل اختیار کا نہ جگر اختیار کا	اب دیکھیں حشر کیا ہو غضب انتظار کا
دونوں ہی وقت سخت میں میٹھو ار کے لیے	آنا بہار کا ہو کہ جانا بہار کا
شغل ہے، اور شغل میں خوشگوار ہے	اللہ دے فیض ساقی فضل بہار کا
بکوں ڈریں اس کے بعد کیا ہو گا	اب ہی کیا کم ہے، جو سوا ہو گا
پوچھتے کیا ہو، حال شاغل کا	میکھے میں کہیں پڑا ہو گا
دو گئے نہ موت آئی نہ صبر آیا نہ دل ٹھہرا	شب فرقت نہ کام آیا مرے اک دکا کرنا
میں آسان تھا ناہ، اگر سب سے وقت بن بیٹھے	مگر انسان بننا پیر و مرشد بہت مشکل ہے
ہم پر بھی کبھی ساقی کو ترک کا کرم تھا	اپنا بھی کبھی شیشہء دل سا غر جہم تھا
اب کون ہے، دیکھن ہے دنیا کے محبت	پرولنے کی اک ذات تھی، یا شمع کا دم تھا
اس کی بجائے ناز کا، اللہ رے تصرف!	پڑتے ہی سراخانہء دل رشک جہم تھا
ہاتھ میں جام مہو دوش پام نکلیں غمور	کوئی شاغل سا دلنے میں مسلمان نہ بچھا
کھد ہو گیا ہو کہ تیخانہ ہوا، شاغل!	میرٹے سے بڑھ کر نہیں سامان محبت
دنیا دوس سے دور، صواب خطا سے دور	اس کے قریب ہو کے، ہوئے اسوئے دور
کعبہ میں اٹھایا میں اسے دھونڈ کے آخر	جدیر ہے کہ آپہنچے ہیں اب کے تباہی
الفت بھی ہے کیا چیز، شکایت کی کوئی بات	انہی بھی اگر دل سے قرآنی زبان تک
وہ اٹھلا سا، ہدم! دانا کہاں	چن ہی نہیں آشیانہ کہاں
ہاتھوں قفس سے، ٹھکا نہ کہاں	یہاں کے سوا آب و دانہ کہاں
آہیں اثر کریں نہ دھانس اثر کریں	یارب! جہان عشق میں کیونکر اثر کریں!
کیا کہا آپ نے، پھر تو کہو اک بار نہیں	ہم وفادار نہیں، تم تو جفا کار نہیں!
سہوش بریں حسن بشر دیکھ رہے ہیں	ہم وسعت و دان نظر دیکھ رہے ہیں
پر میخان کے ساتھ، نہ سچ زماں کے ساتھ	اپنا تو کار و داں ہے، انجم کار و داں کے ساتھ

قدر ہوتی نہیں ہے ناموں کی بلکہ ہوتی ہے نیک کاموں کی  
 عاشقی ہو کہ شر گوئی ہو نس کو فرصت ہے ایسے کاموں کی  
 قوم کا کام کر نہیں سکتے فکر جن کو ہے اپنے ناموں کی  
 سر جھکاٹے رہے، جو ساری عمر ان کو خواہش ہے اب سلاطین کی  
 اب تو ساقی بھی کہ اٹھا، شاغل!  
 نیکر کیجئے، حضور! داموں کی!

یہ بھی کم بات نہیں ہے ہرگز ظلم پر اس کو ندامت ہی تھی  
 آئیے افشاج حرم سے مل لیں نہ سہی فیض، زیارت ہی سہی  
 دل کس کو دے دیا ہے، بتاؤ تو کیا ہوا؟ شاغل! نظر جو آتے ہو تم بیکرا دے  
 اسی کا نام محبت ہے شاید، لے شاغل! کہ کینچنی ہے کوئی چیز دل کے اندر ہے  
 عشق صادق ہو تو خود راہنا ہوتا ہے حضور بھی درد چوں جائیں تو کیا ہوتا ہے!  
 دیکھ کر رنگ حریفانِ دانا شاغل! شکوہ ہوتا ہے، مگر شکوہ سے کیا ہوتا ہے  
 جو ہو تیز، تو سب کچھ ہے نرم عالم میں یہی بہشتِ بریں ہے، یہی جہنم ہے  
 حرم میں دیریں، دل میں، کہاں نہیں بھر گی تری تلاش میں مصروف ایک عالم ہے  
 حریمِ لطیف و عنایت کی فکر کیوں کیجئے تمھاری ایک نگاہِ کرم ہی کیا کم ہے  
 جو ہو قبول، تو کافی ہے ایک سی سجدہ نہ ہو قبول، تو بیکرا رشکِ پیہم ہے  
 فصل بہار آتے ہی کیا رنگ ہو گھیا دامن کا ہوش ہے، نہ خبرِ ستیں کی ہے  
 دنیا سے واسطہ بھی نہیں شیخِ وقت کو اور فکر بھی جناب کو روئے زمیں کی ہے

## عابد لاہوری، سید عابد علی

پچھل صدی میں شیعی فرقے کے ایک مشہور فرد ارسلو جاہ سید رجب علی شاہ ہونے میں ۲۵  
ہماری زبان کے ہمیشہ انشا پرہ از محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے شاگرد تھے  
بھی وجہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے کے بعد آزاد مسیرو سامانہ کے عالم میں دلی  
سے نکلے، تو انھوں نے اساتذہ سے کی دلہی کی اور انھیں اپنے پاس رکھا۔

ارسلو جاہ، غالب کے مکتوب الہم میں بھی ہیں۔ وہ ۱۸۰۶ء میں تلونڈی (ضلع جگناؤں)،  
پنجاب میں پیدا ہوئے۔ تلونڈی کا علاقہ ان کے بزرگوں کو حکومت مغلیہ کی طرف سے  
بطور جاگیر ملا تھا۔ لیکن سکھ حکومت نے انھیں یہاں سے بریخل کر دیا۔ اس کے بعد  
لوگ جگناؤں میں آکر بس گئے۔ سید رجب علی شاہ نے وطن کے علاوہ دلی کا بیچ میں بھی  
تعلیم پائی، اور چند سے یہاں ریاضی کے مدرس بھی رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران  
میں وہ دلی ہی میں تھے، اور اس زمانے میں شہر سے پہاڑی دھیرج پر مقیم انگریز اسیر  
کو حالات پہنچاتے رہے تھے۔ ان شاندار خدمات کے صلے میں انھیں بعد کو دس ہزار نقد  
انعام اور خان بہادر اور ارسلو جاہ کے خطاب ملے۔ اور جگناؤں میں تین ہزار سالانہ کی

جاگیر بھی۔ نیز انھیں لغت گرد در پنجاب کا میرٹھی مقرر کیا گیا۔ ان کا ۹ ستمبر ۱۸۶۹ء (۱۲ جمادی الثانی ۱۲۸۷ھ) کو انتقال ہوا۔

اسطو جامہ کے بیٹے سید حسن شاہ تھے۔ یہ مدتوں پنجاب کے محکمہ پولیس میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ ان کے بیٹے سید غلام عباس نے فوج کی ملازمت کو ترجیح دی۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ ملک کے مختلف مقامات میں مقیم رہے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، صغیر تخلص تھا۔ خدا نے وہ لاجسمانی میں انھیں کے بعد دیگے پانچ بیٹے عطا فرمائے، لیکن سب صغیر ہی میں داغ جھٹی دے گئے، جس زمانے میں وہ دیرہ اسماعیل خان میں تعینات تھے، ان کے ہاں ۱۲ ستمبر ۱۹۰۶ء کو اللہ اکبر سے بھر (دھپا) بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے عابد علی رکھا۔ خدا نے اسے زہرہ رکھا اور وہ فخر خاندان ثابت ہوا۔ یہی اردو زبان کے مشہور شاعر اور ادیب، مصنف اور مترجم سید عابد علی ہیں، جن کا پچھلے دنوں لاہور میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد خدا نے سید غلام عباس کو اور تین بیٹے اور چار بیٹیاں دیں، اور مجدد پر سب آج تک حیات ہیں۔

عابد صاحب کی ابتدائی تعلیم دیرہ اسماعیل خان ہی میں ہوئی اور وہ بچپن درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد رنگ محل (لاہور) کے مشن ہائی اسکول میں آگئے، وہاں درجے کی سند یہاں سے پائی، ۱۹۲۳ء میں بی اے پاس کیا اور ۱۹۲۵ء میں دکانہ کا امتحان۔ اب انھوں نے گجرات پنجاب میں دکانہ شروع کی۔ میں نے ۱۹۲۴ء میں دکنور پڑھنا شروع کر لیا، جو بی ائی اسکول، دیرہ آباد سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ انٹر کالج، گجرات میں داخلہ لیا تھا، چونکہ میں یہاں دیر سے پہنچا تھا، اس لیے مجھے کالج کے ہوش میں جگہ نہیں ملی تھی، اور میں شہر ہی میں ایک کرایے کے کمرے میں مقیم تھا۔ رفتہ رفتہ مافیت کا ماحول وسیع ہوا، بعض دوستوں کے ساتھ میں یہاں کی بزم سخن کے مہذبہ داری شاعروں میں بھی چلنے لگا۔ عابد صاحب ان شاعروں میں بحیثیت شاعر شریک ہوتے تھے۔ آخر شہرانی

(ف ۱۹۴۸) سے ان کی دانست کافی روٹی تھی اور وہ انوں ہم مشرب ہمارا تھے۔ ان دنوں وہ بھی اکثر لاہور سے گجرات آیا کرتے تھے اور انھیں کے ہمارا ہوتے تھے۔ عابد صاحب کا یہ شعر اسی عہد کا ہے:

گلیاں دوزخ کا رہے گجرات کی زمیں

ہے اس جگہ قیام میری مست ناز کا

غرض میں نے عابد صاحب کو لاہور خیرانی کو بھی پہلی مرتبہ یہیں گجرات میں دیکھا۔ ان کے گجرات میں شعر و نغمہ تھا۔ یہاں کے دور اور از حجت نگاہ و فردوسی گوش کا مصداق تھے اور ہر کوچہ اور قیامی کاغذ۔ دکالت بڑی بنو، ہیکم ہے، یہ کسی موت کو پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ بزم تن میں کے ہو کے نہ جانیں تو آپ اور خواہ کچھ بھی ہو جائیں، کامیاب وکیل نہیں بن سکتے۔ عابد صاحب کے تو دکالت کے ساتھ ایک چھوڑ دوڑ و غلیظت اور لگی تھیں شاعر اور خیرانی۔ ایسے میں بھلا دکالت کیا چلتی، قصہ کو تاہ ایک سال بعد وہ لاہور واپس سدھا۔ شاعر اور دبیر تو وہ تھے ہی لاہور کے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ پے گئے، انہماں اور ہندوستان وادوں کی ایڈیٹری انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کی تھی۔ گجرات سے واپس آکر انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (فارسی) کی سند لی۔ مولانا ساجو رحیم آبادی (ف جنوری ۱۹۵۱) دیال سنگھ کالج، لاہور میں صدر شعبہ فارسی وارد ہوئے۔ انھوں نے دشگیری کی اور یہ ان کے معاون کی حیثیت سے دیال سنگھ کالج میں یکچہ مقرر ہو گئے۔ اس طرح اب علم کی دنیا میں بھی نام آنے لگا۔ دیال سنگھ کالج میں چار سال کام کیا تھا کہ یہاں سے فوراً کریمین (ایف سی) کالج، لاہور میں صدر شعبہ السنہ شرقیہ ہو کر چلے گئے۔ وہ اس کالج میں ۱۹۴۲ء تک رہے۔

۱۹۴۲ء میں تاج و جرم دیال سنگھ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو اب عابد صاحب دوبارہ وہاں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ تقسیم ملک تک وہ اس عہدے پر

حکومت رہے اور پاکستان بننے پر کلچر کے پرنسپل رنا دیے گئے۔ لیکن اس عہدے پر وہ زیادہ دن نہیں بٹھے، رفتہ رفتہ منٹیلیں سے احتلاط پیدا ہو گیا اور بالآخر ۱۹۵۳ء میں انھیں منتقلی ہونا پڑا۔ تقسیم ملک کے بعد حکومت پاکستان نے مجلس ترقی ادب نام کا ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد اردو کے کلاسیکی سرے کی اشاعت اور بازیافت تھی۔ سید امتیاز علی تاج مرحوم (دف اپریل ۱۹۷۰ء) اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ عابد صاحب ان کے دست راست تھے۔ مجلس کی طرف سے ایک مقررہ ماہی رسالہ بھیج دیا جہاں شائع ہونے لگا، عابد صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ غرض کہ یہاں کا ماحول اور شغل سراسر علمی اور ان کے مزاج کے موافق تھا۔ اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان سے کئی تعلقات پیدا ہو گئے۔ یوں بھی لاہور آئیشن کے کرتا دھرتا ان کے شاگرد اور دوست بن گئے، اس لیے ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ عابد صاحب کو موسیقی میں بھی ماہرانہ درک تھا اس سے متعلق ان کی متعدد تقریریں لاہور ریڈیو آئیشن سے نشر ہوئی تھیں۔ فروری ۱۹۶۷ء میں وہ مجلس ترقی ادب کی ملازمت سے الگ ہو گئے، لیکن اس کے بعد بھی اس سے حیرت کی طور پر وابستہ رہے۔ ان دنوں اس کی فراموشی ہر ایک کتاب و عرض سے متعلق مرتب کر رہے تھے جس کے لیے غالباً سات سو روپیہ مہینہ وظیفہ انھیں ملتا تھا۔ صحت بہت دن سے خراب تھی۔ ایک زمانے سے محض مورفیا کے ٹیکوں کے سہارے جی رہے تھے گھر بڑے پریشانیاں بھی ساتھ تھیں، آمدنی کم اور خرچ بے پناہ۔ انسوس ان کا ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء صبح کے وقت لاہور میں دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ الہ تشیع کے مہر و قبرستان مومن پرہ (ریکوڈ روڈ) لاہور میں مدفن نصیب ہوا۔

انھیں نظم و نثر پر کیاں قدرت حاصل تھی۔ ترجمے میں بھی اچھی مہارت تھی جو کہ زبان کا مزاج پہچانتے تھے اور شعر کا مذاق بہت اچھا تھا، اس لیے تنقید کے میدان میں بھی جہد نہیں تھے۔ انھوں نے ڈرامے اور انشائیے بھی لکھے۔ پیر الائی کی مشہور کتاب "ایفروڈنٹ" کا ترجمہ اردو میں داستان کے عنوان سے کیا تھا۔ اسی طرح دل دیوراں کی کتاب "مشرقی آئی فلاسفی" کا



ترجمہ بھی ان کے قلم سے ہے بعض نادوں کا ترجمہ بھی کیا تھا مثلاً قیامت کی بات، بشر ہے کیا کہنے وغیرہ۔ ان کے ترجمے پر کہیں اور دکا گمان نہیں ہوتا۔ ان کی تصنیفات کی بہت خاصی طویل ہے، پچاس سے کم نہیں ہونگی۔

انہوں نے تمام اصنافِ نظمیں لکھا ہے۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں حیفظ جانہ صہری کے گیتوں اور نظموں کی دھوم مچی، اور یہی ہی کسرا ختر شیرانی نے پوری کر دی تھی۔ پنجاب کے نوجوان شعرا ان دونوں سے بہت متاثر ہوئے۔ عابد صاحب بھی انہیں لوگوں میں تھے۔ چنانچہ اس دہائی میں انہوں نے بھی ابتدا میں محبت اور لطیف لکھیں۔ لیکن اب ایک زمانے سے صرف غزل کہتے تھے اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ خوش گلو بھی تھے، بڑھنے کا انداز نکش اور سامعہ لواز تھا۔ ان کی ابتدائی منظومات میں اقبال کے ادبی نمونے کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ اردو میں ساقی نامے کی تردید ہے ان کا بہت ہاتھ ہے، اگرچہ اس میں انہیں تقدیم کا فخر حاصل نہیں ہے؛ یہ فیض لکھنوی کا حصہ ہے۔ عابد صاحب نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی تو وہی گجرات کی بیگم دہلیس تھیں عابد صاحب کی سادی اولاد اسی بیوی سے ہوئی (سات بیٹیاں اور ایک بیٹا جنوچر)۔ سب بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے، اور وہ اپنے گھر بار کی ہیں۔ اکلوتا لڑکا آج کل لاہور میں اسٹنٹ کمشنر ہے۔ ان کی دوسری بیوی محمودہ تھیں۔ اس شادی کے جلد بعد ہی دہلیس نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ لیکن محمودہ کی بھی ان سے نہیں تھی؛ اس نے طلاق لے لی۔ تیسری بیوی محبوب تھیں۔ یہ بیگم امروہہ کے ایک بھائی جاجو خانہ کی بیوی چوانہ ہیں۔ بنیادی انہوں نے پچاس سال کی عمر میں کی تھی۔ وہ آخری دم تک اسی بیوی کے ساتھ رہے، اور ان کے ان کا انتقال ہوا۔

اب ان کے چند شعر سنئے :

سب کے جلوے نظر سے گزرے ہیں وہ نہ جانے، کدھر سے گزرا ہے ہیں  
 موجِ آواز اپنے یار کے ساتھ نفعی دیوار و در سے گزرا ہے ہیں  
 آج آیا ہے اپنا دھیان ہیں آج دل کے نگہ سے گزرا ہے ہیں  
 گھر کے گوشے میں تھے کہیں پنہاں جتنے سیلاب گھر سے گزرا ہے ہیں  
 جہاں کشود لڑا، خونِ ان کے چہرے ہیں وہیں بہارِ غزنواں ہے دیکھیے کیا ہوا  
 سیوا تھا کہ یہ نازک مقام ہے ساقی خدا ہر من پہاڑِ بڑاں ہے دیکھیے کیا ہوا  
 ہوا کا رنگ یہ ہے، آشیاں تو ایک طرف قفس بھی شاخ پہ لرزاں ہے دیکھیے کیا ہوا  
 ہمیں ہیں پیرِ مغاں کا فرد کے لئے عطا ہیں کوہِ عونی دیاں ہے دیکھیے کیا ہوا

چاند ستاروں سے کیا پوچھوں، کب دن میرے پھرتے ہیں؟

وہ تو بچا رہے خود ہیں بھکا رہی، ڈیسے غیر سے پھرتے ہیں  
 جی لگیوں میں ہم نے، سکھ کی سبج پہ راہیں کاٹی شخص

ان لگیوں میں بیا کل ہو کر سا بچہ سویرے پھرتے ہیں  
 روپ سروپ کی حوت جگنا، اس نگوی میں جو کلم ہے

چاروں کھونٹ بگولے بن کر، گھوڑا اندھیرے پھرتے ہیں  
 جن کے شام برن سالیے ہیں میرا من سستا یا تھا

اب تک آنکھوں کے آگے، وہ بال گھینرے پھرتے ہیں  
 کوئی ہمیں سہی یہ سمجھا دو، ان پر دل کیوں دیکھ گیا!

تھکی چتون، بانگی چھب دالے، ہتیرے پھرتے ہیں  
 اک دن اس نے نین ہلا کے، شرما کے مکھ موڑا تھا

تب سے تند تند سپنے من کو گھیرے پھرتے ہیں

اس نگر کی کباخ اور من کی، یارو! بیلا نیاری ہے

پنچھی اپنے سر پہ اٹھا کر اپنے سیرے پھرتے ہیں

لوگ تو دامن سی لیتے ہیں؛ جیسے ہو جی لیتے ہیں

عابد ایم دیوانے ہیں، جو بال بکھر پھرتے ہیں

نہم دو ماں، نہم جاتاں کا نشان ہے کہ جو تھا

وصفِ خواں بہ حدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا

شرعِ آدین کی تعزیر کے باوصفِ شباب

لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا

عشق کی طرزِ تکلم، دی چپ ہے کہ، جو تھی

لب خوشگونی ہوسا عو بیاں ہے کہ جو تھا

نگہِ طفلان سے زرا بچ کے رہے قصر بلند

یہ دی کار گم شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

گردشِ جام نہیں رگ سکتی جو بھی اے گردِ شبنم دوراں گزرتے

مجھ عشر ہے بلاے ظاہر کسی صورتِ شبِ ہجران گزرتے

کوئی برسانہ سہرگشتِ وفا ق کتنے بادل گھبراٹاں گزرتے

ابنِ آدم کو نہ آیا کوئی راس کئی آذر، کئی بزدان گزرتے

وہ جو پردائے جلے، رات کی رات منزلِ عشقی میں آساں گزرتے

آیا ہمارے جینے کا اتنا ذر سب کو یاد جب ذکرِ جاں نثاری پروانہ ہو چکا

انھیں کو مرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت انھیں کو مرضِ وفا ناگو ار گزری ہے

حرمِ شوق ہلکتا ہے آج تک، عابد! یہاں سے نکلت گیسوے یار گزری ہے

عام جو فیض بہارِ دان کو مزا آ جائے چاک ہوں سب کے گریباں تو مزا آ جائے

دغطل میں مگی تھاری ہی طرح مسجد میں  
ساقیا ہے تری نعل میں خداؤں کا ہجوم  
دنیا میں اپنی جبین، نہ شاہیں  
لے مصفیرو! گلشنِ قفس ہے  
مینوار ساقی! قطرے کو ترسیں  
فصلِ بہاراں، گویا دھن ہے  
اہرمن یار، نہ یزدان محرم  
گیسو یار ہیں گوشاںِ کار  
زندگی آچ ہے ابھاروں کی  
یوں بڑھا ان سے راہ و رسم و خفا  
میرا مرنا تو ان پہ کب کھلتا  
بھٹ کے راندے ہوئے، اندک کے ٹھکانے پہ  
وہ گئے باوقیل غم دوراں ہو کر  
دامنِ یاد کی راموں سے گزر کر آخر  
چاند ترا مرے کاشانے میں عابدِ اہلِ رات  
لے دوست! موجِ رنگ سے بنے نہیں تین  
ٹوک زبانِ خار کی دیکھی نہیں ادا  
جیسی بری کٹے ہے اول کو مضطرب کروں  
قدت کے بعد کئے ہیں اسے راہِ ہیرا جہاں  
یوں تو مٹی زبان سے ظالم کی  
لب سے ہوتی ہوئی آنکھوں سے سننی جاتی ہے  
کوئی پرداؤں کو سمجھانے کہ مرنے کے سوا

بیچ دول دولت ایمان تو مزا آ جائے  
مخلص افرو ز جوانی تو مزا آ جائے  
دل کے اندھیرے دل کے آجائے  
آنکھوں پہ جہر، ہونٹوں پہ تالے  
برسیں چھا چھم سادہ کے بھالے  
پھولوں کا آغل، چہرے پر ڈالے  
یہی تقدیر بر بصر ہے، ساقی!  
ہر شب غم کی محرم ہے، ساقی!  
عاشقی، رقصِ شر ہے ساقی!  
کہ مجھے بھی کوئی خبر نہ ہوئی  
میرے جیسے کی بھی خبر نہ ہوئی  
آنکھ کا دور پیر مغاں تک پہنچے  
ہم سے کچھ سوختہ جاں کے جہاں تک پہنچے  
دستِ گستاخ سرتاجِ رواں تک پہنچے  
دیکھیے رات کی یہ بات کہاں تک پہنچے  
لے دوست! موجِ غم کی طلیکار ہے بہار  
غافل کو وہم ہے، نگلِ دگر دار ہے بہار  
یاد تو عشرت سے، یا غمِ تنہا سے  
میرا قیاس ہے کر، چلے تھے وہیں سے ہم  
آنکھ میں رنگِ انقسات نہیں  
لے تو اپیار کے اسلوب جدا ہوتے ہیں  
اور بھی چند مقامات وفا ہوتے ہیں

## روش صدیقی، شاہد عزیز

اگرچہ بعض تذکروں میں ان کی تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپی ملتی ہے، لیکن یہ غلط ہے؛ ان کا صحیح سال ولادت ۱۹۰۹ء ہے۔ مرحوم نے خود ایک مرتبہ میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ جنوری/فروری ۱۹۰۹ء میں لگاڑ (کھنڈو) نے تذکرۃ اشعار شائع کیا، تو نیا ذ نے ان سے بھی حالات طلب کیے تھے۔ خدا معلوم، کیسے! ان تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کی جگہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپ گئی۔ اس کے بعد چونکہ سب لکھنے والوں نے حالات وہیں سے نقل کیے، اس لیے سب تاریخ عام طور پر تسلیم کر لی گئی، حال آنکہ یہ غلط ہے۔

بہر حال روش مرحوم ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کو جوالا پور (ضلع بہار پور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد بھی شاعر تھے اور شاہد تخلص کرتے تھے۔ وہ علامہ اکرم غنیمت کنجاہی کی شاہد بنیڑنگ عشق کے عاشق تھے۔ اس شہسوار کا مطلب ہے!

بنام شاہد نازک خیالوں

عزیز خاطر آشفستہ حلالوں

اسی سے انھوں نے شاہد تخلص اختیار کیا تھا؛ اور اب جو خدو نے بیادیا، تو اس کا نام انھوں نے

شاہد عزیز دلکھ دیا۔ مشنوی نیز سنگ عشق کے ہیں دو کردار ہیں شاہد اور عزیز۔

گھر کا ماحول مذہبی تھا، اسی تعلیم بھی اسی بیچ پر مبنی۔ اور داد و نفاذ اس کے علاوہ مندی بھی اچھی جلتے تھے اور یہاں کے وطن جو الہ پور سے گوروں کے قرب کا فیضان تھا۔ بعد کو سنسکرت اور انگریزی سے بھی کچھ واقفیت پیدا کر لی تھی۔

روش تقسیم ملک تک جو الہ پور میں رہے۔ یہاں وہ بانس کا کاروبار کرتے تھے اور اس سے ان کی گذر بسر کے لیے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ آزادی کے ساتھ فساد آنے، جو الہ پور میں بھی بہت سخت ہنگامہ ہوا، اسی میں روش کا مکان بھی مذیباقتس ہو گیا۔ یہ جان بچا کر مراد آباد پہنچے اور یہاں مولوی منظر جلیل صاحب کے مکان میں پناہ لی۔ مولوی صاحب روش صاحب سے رتنے خوش تھے کہ جب روش کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا، اور ایک زمانہ بعد انہوں نے دوسری شادی کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا، تو موصوف نے اپنی بیٹی (سعیدہ) ان کے عقد کاج میں شادی کر دی۔ روش صاحب ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک مراد آباد میں رہے۔

ان کی بیوی کی ایک خالہ میرٹھ میں تھیں۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں یہ خاندان میرٹھ منتقل ہو گیا اور محلہ مشانچان میں انھیں کے مکان میں رہنے لگا۔

جو الہ پور سے نکلنے کے بعد روش نے ساری عمر شعر کہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ ویرساں بہ کوئی چار سال کے لیے ۱۹۵۹ء۔ ۱۹۶۳ء) آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ اردو میں پڑوسی کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے۔ لیکن کچا شاعر، کچا دھڑکی کچا اس۔ وہ اس گون کے آدمی نہیں تھے۔ یہاں کا نظماں اوقات اور دنیا کی زندگی کی پابندیاں یہ بھڑکھاں ان کے بس کی بات تھی، بالآخر پرچہ گزرا کہ یہ کام پر توجہ نہیں دیتے، وقت سے دن بھر غائب ہوتے ہیں، انجام کار انھیں لگ کر دیا گیا۔ اسی ملازمت کے دوران میں وہ ہر سلازہ تعلیم کے سلسلہ جشن شعر میں ہندستان سے اردو کے نامزدے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے، یوں یورپ کے بعض مقامات دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک شاعرے میں شرکت کے لیے شاہجہانپور گئے۔

مات کو شاعرے میں کلام خاص ہے تھے کہ دل کا شدید دورہ پڑا اور تھوڑی دیر بعد ساڑھے چار بجے علی اصحاب (۳ جنوری) اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ فائنل گلی دن میں ہو گئی اور انھیں درگاہ شاہ ولایت میں (عبدالمصباح بدیل تلخیص غالب کی خبر کے پاس) سپرد خاک کیا گیا۔ حکیم کلب علی صاحب امر دہوی نے جو مرحوم کے مخلص دوستوں میں سے ہیں، نظریاتی کہا: اس کے آخری تین شعر ہیں:

جب بھی ہو جائیگی شایستگی ذہن و ضمیر ہو گا اس عہد سعادت میں نمودار و روش  
یاد کرتی ہے تجھے وادی کشمیر بہت تجھ کو روتے ہیں وہاں کے درویش و زوروش  
چل دیا سونے نشا طراہی آج کی رات 'ہائے' وہ صید محبت وہ وفادار و خوش  
قر سبغی کا تھوڑا سا رنج بھی قابل ذکر ہے۔ (۱۳۹۰)

اتھ گئی ان باروش سا اہل سخن بزم اور دسیا ہوش ہوش ہوئی  
لے تم! مکہ یہ مصرع تار رنج 'آہ' شمع ادب خوش ہوئی  
ایجاز صدیقی نے عبسوی تھوڑا سا رنج کہا ہے اس کا آخری شعر ہے:

کہو ایجاز! تب کہ سے تار رنج دفعت شعل باب سخن، نام روش صدیقی  
روش بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے اور ماں میں آغازِ سخن سے پہلے لگے آگیا تھے۔ کبھی کسی  
اصلاح نہیں لی، بہت تڑا بہت شورہ کیا تا اپنے والد مرحوم سے کلام میں تصوف اور ویدانت  
اثرات بہت گہرے اور نمایاں ہیں؛ اور یہ ان کے ماحول کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے  
یہ بھی کہا تھا کہ میرا مخلص روش فارسی کا لفظ نہیں ہے، یہ سنسکرت کا اردی ایش اریمن

سورج دیتا ہے جو ان کے کسی فاضل سنسکرت مندو دوست کا عطیہ تھا۔ بہت ابتدا ہی  
میں ان کے کلام کی پختگی سے بعض اصحاب کو دھوکا ہوا اور وہ انھیں کوئی سن ویدہ شخص سمجھنے  
لگے تھے۔ یہ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ان نام اراشد نے جو اس وقت صرف چودھری نذیر محمد راشد  
تھے، روش سے اصلاح بھی لی۔ روش نے ۱۹۳۲ء میں ۱۹۳۳ء میں بہادر پور کے ایک صاحب

سید مبارک شاہ جیلانی (دف ۲۱ نومبر ۱۹۶۶ء) کے ساتھ مل کر ایک نیا ہی پرچہ تلازمہ صحرہ بھی لکھا گیا تھا، لیکن اس کا صرف ایک شمارہ نکل کر رہ گیا۔ وہ نظم بہت اچھی لکھتے تھے شریعہ میں چند غزلیں کہیں، لیکن اس کے بعد انھوں نے مدتوں اپنے آپ کو نظم ہی کے لیے وقف رکھا، اور اس میں امتیاز پیدا کیا۔ ان کی بعض نظمیں (مثلاً کاروان، مرغِ گاندھی وغیرہ) اردو کی آبرو بھی جانے کی مستحق ہیں۔ انھوں نے کاروان، نظم دے کر اپنے دوستی ۱۹۵۷ء اور ایک مجموعہ غزلیات مرغاب دل (دلی ۱۹۵۹ء) کے علاوہ ان کا اردو کلام شائع نہیں ہوا۔ ان کا سرائے سخن یقیناً دو تین مجموعوں سے زیادہ کا ہو گا۔

ان کے کلام میں لکڑی کی رچاؤ ہے۔ فارسی کی شگفتہ اور لادیز ترکیبیں ایسی جستجی اور چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ مزہ آجاتا ہے۔ لیکن شاعر سے بھی زیادہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ مرغاب دل، نیک نفس، پابندِ جہنم و صلوة، ویندار، میں انھیں ۲۰، ۲۵ برس سے جانتا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کے اکثر شاعروں کی عام روش کے خلاف میں نے کہیں ان کی زبان سے کسی کے خلاف ایک کلمہ نہیں سنا، یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہاں مرحوم کی ایک سخن گسترانہ بات یاد آگئی:

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جیٹا خاں لندھری حکومت ہند کے اس گلے کے کرتاد مرتا تھے جن نے لائے بیلنے اور کھیل تماشے کے ذریعے سے حکومت کو فوجی پراسپیکٹس کا کاروبار تھا۔ بعد ازاں کی خدمات جیل کے اعتراف میں سرکار کی طرف سے انھیں خان بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ اس پر روش نے ایک قطعہ کہا تھا، جس میں اقبال کے اس شہر شعری کی تبلیغ ہے:

آج تھ کو بتاؤں میں تقدیر اُٹھ گیا ہے      خمیر و سنالِ اُڈل، طاؤس و بابِ آخر  
روش کا قطعہ ہے:

اقبال کے عرفان میں تقدیر اُٹھ یہ ہے      خمیر و سنالِ اُڈل، طاؤس و بابِ آخر  
رتقا ص حکومت کی معراج یہ کہتی ہے      طاؤس و بابِ اُڈل، اعزاز و خطابِ آخر  
شعری حلقوں میں بھی ان کے فن اور انسانیت کے باعث ان کا وقار تھا۔ خدا اپنے فضل و کرم



سے انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ ہے۔ آمین

ہاں کچھ شہر سنے، جہان کے مظلوم مجروح کلام محراب غزل سے اخذ ہیں:

مرا ذوق سفر ہے بے نیاز جاوہ و منزل	نہ کوئی را بہر میر نہ کوئی را ہزن میرا
بھری مینا سے کچھ، پھر کچھ طائی چشم ساقی نے	بڑی دھنائیوں کے ساتھ مجھ تک دو جام آیا
چراغ صبح سے کچھ گفتگو تھی بے شبانی پر	تصور میں یکایک چہرہ خود شید شام آیا
تغافل کو کرم سمجھا ہے ہم نے	ہنس آساں ہمارا بھول حبان
خود آرائی ہے، اظہار محبت	خود آگاہی، محبت کا چھپانا
خلوص زندگی ہے، گنگلا ہی	غریب مصلحت ہے، سر جھکانا
میری تنہائی تھی اک دنیائے دیوانہ کا حجاب	جان محفل اتارے کیوں یہ راز انشاکر دیا
حسن کے رخ پر تو اے منصور! پردہ ہی رٹ	عشق کی مجبوریوں کو تو نے رسوا کر دیا
وہاں ہزار تغافل، شریک ناز سکوت	ہزار عشق یہاں، اشوق گفتگو کے سوا
گمان بادۂ عشرت مرے سپوئے نہ کو	ہے اس میں زہر سبھی شام، مرے ہو کے سوا
خطا معاف! مری غرضوں کا محسوس راز	کوئی نہیں ترے لطف یہاں نہ جوا کے سوا

کوئی نسبت نہ ہوساقی سے، تو میخانہ بھی خاک

لطف ساقی ہو، تو خاک و دیخانہ بہت

محبت سے پہلے یہ عالم نہ تھا	کہاں آگئے ہم محبت کے بعد
اب اس سے کیا غرض، یہ جو ہے کدو رسا	بیٹھے ہیں ہم تو سایہ دیوار و دیکھ کو
شایانِ حُجیم، عشق نہ تھی قید زندگی	جی شاد ہو گیا رس و دار و دیکھ کر
رنج و راحت میں ہے اک ربط لطیف	سرخوشی ہے شاہرِ غم کا لباس
نقاب رنج سر کتا حباب رہا ہے	مگر وہ خود ہوئے جاتے ہیں مد پوش
یہ نازک سخن و بے لکھ آئینہ	کوئی ہوا تو ہیں آج زینتِ محفل

ہوں تو ہر خواب تھکتا ہے محبت افروز  
بلکہ تعبیرِ نسا ہے محبت کا دوا  
بات آئی سی ہے اے مہرِ حجاباتِ نظر  
حسنِ انکارِ مستر ہو، تو دنیا ہے حسیں  
مجھ سے پوشیدہ نہیں، پردہ تقدیر کا راز  
جو ترے دل میں نہیں، وہ تری قسمت میں نہیں  
سکوتِ عشق جو یا اضطرابِ شوقِ روش!  
حبابِ راز میں پنہاں نہیں، تو کچھ بھی نہیں  
روش! کون نے اب محبت کا نام  
بڑی ڈلسیتیں ہیں، بڑی خواریاں  
رگوں میں شعلہٴ حسرت، اندر برقِ آرزوئی  
کہاں سے روشنی ہو، ان خرد مندوں کی عقل  
حرم نے کر دیا ہے محرم کو اب نظاؤ  
چلے اب دیریں نظارہٴ حسنِ شاں کر لیں  
مرا تو حال ہی کیا ہے، مرا تو ذکر ہی کیا  
ترے سکون میں بھی رنگِ نفاں ملا کھ کر  
نہراؤ دیکھو حرم ہیں سجودِ آمادہ  
جہیں ملی کہ ترا آستانِ طاب کھ کر  
لے فقیرِ شہر! کیا اس کا علاج  
چشمِ ساقی بھی ہے پیمانے کے ساتھ  
تیر فراد نے یہ راز پنہاں فاش کیا  
کہ شکستِ دل بکسار نہیں کوہِ گمنی  
لے روش! پاسِ وضع میں شامل  
احترامِ تغیرات بھی ہے  
دیا بلالہ دھل بھی نہیں مقامِ سکون  
ہنوز گرم سفر کا ردائِ شبنم ہے  
آلِ تلخیِ مشرت سے بے خبر ہے حیات  
ابھی تو شکوہٴ آغازِ تلخیِ غم ہے  
یہاں ہے وقتِ روش! اندر در متاعِ سکون  
اداسے دلفِ پریشاں کچھ اور ہم ہے  
ذیل کی تین غزلیں ان کے مطبوعہ مجموعے 'غرابِ غزل' کے بعد کا کلام ہے:

زندگی کی بچہ دھم ہر گام پر ہمت شکن  
کام آتا ہے جہاں اہلِ جنوں کا بانگین  
حسنِ بے پروائی توڑا ہے تنہا کا ظلم  
جیلہٴ پرویز ہو یا سادگی کو کہیں  
کھل ہی جائیگا کبھی یہ راز تجھ پر ہم نہیں!  
ہیں تو خود ہی پیر ہیں ہوں تجھ میں لیے پیر  
کس قدر دلتیں ہے افسانہٴ مرے انکار کا  
رفتہ رفتہ ارتقلے حسنِ تنہائی ہوا  
ساغر گلِ رنگ و دستِ ساقی گلِ پیرین  
اک تخیّر ہے نہ خلوت ہے نہ کوئی انجمن

میں نے کیا کیا رنگ دیکھے دلنوازی کے قری  
 دل شکن، مینا شکن، ایماں شکن، پیمان شکن  
 میری خاموشی سے خوابیدہ تھی روح کا اُٹنا  
 میں نے اک نالہ کیا اور جاگ اُسے دست  
 شک نہیں تیرے خلوص دوستی میں یا ہم نشین  
 آہ مجھ سے ہی گریزاں ہے مراد یوں نہ ہوں  
 ہے مرے ہر لفظ کی تیرے صدیق کی سکوت  
 حسن خاموشی سے سیکھے میں نے آداب سخن  
 کیا یہ کہ دوں ہے مرے دل کی تباہ گرم شد  
 اے نگاہِ ناپسناں تیرے ماتھے کی شکن

شامِ غربت میں کھلے اسرارِ بھانہ، روشنا

مردوں جھلکا کیا پچا، صبحِ وطن

حاصلِ عمر، خراباتِ بغاں کیا کہے  
 ہوش آیا ہے تو آیا ہے کہاں کیا کہے  
 ہے صنمِ خاں کو نہیں تقاضائے سکوت  
 شوخی، جھنش، بہانے تباں کیا کہے  
 علمِ حاضر کی کہانی سے خوشی ہی بھلی  
 کچھ جو کہنے تو بجز وہم و گماں کیا کہے  
 سخن تھا، محتسبِ شہر سے میخانے کا  
 کیوں پریشاں ہے صفِ بادہ کُٹا کیا کہے  
 بوجھ، حلقہ گل، صبحِ صبا، فکرِ غزل  
 اور مفہومِ حیات گذراں کیا کہے  
 ہم تو نادان تھے کہ خلوتِ گردن سے نکلے  
 کوئی غارت گر محفل ہے کہاں کیا کہے

حق ادا ہونے کا راہ کے کانٹوں کی روشنی

ساتھ تھا قافلہ گل بدناں کیا کہے

ناز فرما ہے فروغِ شعلہء رخسارِ دوست  
 سر جھکا دے اسے، ہجومِ حسرت، یادِ دوست  
 عشق کہتا ہے کہ ہے دشمن کی غمنازی بھی شرط  
 یہ تو آساں ہے کہ کوئی دوست جو غمنازِ دوست  
 حادثہ کچھ سخت گذرا ہے صبحِ دھنسر پر  
 نرنگوں بیٹھے ہیں زیرِ سایہ دیوارِ دوست  
 عشق نے سلجھا دیے سب زندگی کے بیج و غم  
 یہ سلیقہ ہے عطائے گیسوتِ غم دارِ دوست  
 حرفِ اکابرِ محبت کی دل آویزی نہ پوچھ  
 جیسے سچ سچ مل گئی ہو دولتِ اقرباءِ دوست  
 جان تیتے ہیں جو نادیدہ جمالِ یار پر  
 دیکھ ان کو نہیں دور اسے طالبِ یارِ دوست

وکر دنیا، فکر معنی گم ہونے اس شغل میں      زندگی کو ہم نے سمجھا اہم کام کار دوست  
 اور جو ہے نیازی میں بہت یوسف ہیں      اک نودا پاس اب اسے دل سیر بازار دوست  
 حسن تہذیب غول کچھ اور ہے لے نکھڑا      جاکہ ہیں سے لاجتوں شوخی گفتار دوست  
 زندگی کی رات نکھوں میں کئے گئے رتوں      سہل مست جانو پیام وعدہ دیدار دوست

مجھ سا آشفہ نرا اور مصرعہ غالب و شمس

کچھ نہ کچھ کہنا پڑا آخر کہ تھا اصرار دوست

## عقیل جعفری خیر آبادی، سید عقیل احمد

مشہور مصنف اور صحافی رئیس احمد جعفری (ف ۱۹۶۷ء) کے بڑے بھائی تھے۔ ان کا سال ولادت غالباً ۱۹۰۶ء تھا۔ اگرچہ مستطرا اس سیتا پور تھا، لیکن ان کی پرورش اپنی مائیں خیر آباد کے مردم خیز بستی میں ہوئی۔ والد سیدنا طر حسین کا ان کی کمسنی میں انتقال ہو گیا تھا، اس لیے یہ دونوں بھائی خیر آباد چلے گئے، مشہور شاعر خمریات ریاض خیر آبادی (ف ۱۹۳۴ء) ان کے نانا سید نیاز احمد کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، انھیں دونوں کی نگرانی میں عقیل احمد اور رئیس احمد کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ لیکن چونکہ والد کے انتقال کے بعد گھر کی مالی حالت سقیم ہو گئی تھی، اس لیے تعلیم پر کافی توجہ نہ دی جاسکی۔

شروعات میں ریاست سے دلچسپی رکھی اور خیر آباد میں بورڈ کے جمیر میں بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اپنی خانہ دانی روایت اور احوال کے زیر اثر جلد ہی شعروادب کی طرف آ گئے۔ اس کے بعد کھنڈ میں منتقل قیام اختیار کر لیا۔ ایک مدت بعد ۱۹۴۵ء میں بسنی چلے گئے، جہاں رئیس احمد جعفری پہلے سے مقیم تھے جب ملک تقسیم ہوا تو یہ بھی ان کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ یہاں انھوں نے کراچی میں محمد علی اکیڈمی قائم کی تھی۔ خیال تھا کہ اسے نشری ادارہ بنائیں گے۔

لیکن بعد کو اسے ہمیں احمد کے سپر کر دیا، اور اپنے لیے ایک اور بکٹ پونایا وہیں کراچی میں ۲۶/۲۶ جنوری کی دو صیانی شب میں منتقل کیا۔

ان کی سب سے پہلی تصنیف غالباً شریاض خیر کا دی تھی جو حیدر آباد کے کسی ناشر نے شائع کی تھی کراچی کے زمانہ قیام میں تین چیزیں شائع ہوئیں۔ مکالمات، ابوالکلام، جوش و ہوش اور مجموعہ کلام جوش و ہوش، قطعوں، لاو دبا، عیوں کا مجموعہ ہے جوش ملیح آبادی کا اتحاد اور زندگی الم نشرح ہے وہ ان موضوعات پر بحث و تفتیش و مباحث سے لکھتے رہتے ہیں عقل نے انہیں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مضامین کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ منتشر اور غیر مرتب شکل میں موجود ہے۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے

ذیل میں جوئے کے طور پر ان کی چار رباعیاں دی جا رہی ہیں جو انہوں نے جوش کے جواب میں کہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جوش ہی کے الفاظ میں رد و بدل کر کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا جذبہ حمیت دین اپنی جگہ لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی:

مرتے ہیں ترقی پہ فنا کے بندے      انسان ہیں یا حرص و ہوائے بندے  
چل اور دکھا راہ مستقیم اُن کو      اے حسن تقویم، خدا کے بندے

اے ملحد، بی علم و عمل، محسب دیں!      اے جنس الارضی میں جہنم کے کیس  
سوئے ہوئے اقدوس کو جگانے والے      تجھ کو بھی نہیں قرب قیامت کا یقین

جب حشر کی تردید ہی کرتے گوری      تو کس لیے عمر آپ کی ڈرتے گوری  
کہ فیجی، اس کا بھی جہنم میں شمار      جو عمر کہ ہائے ہائے کرتے گوری

دوقن ہوئی بالنگ جس اے ساقی!      وہ آگیا اب عرش، بس اے ساقی!  
صد شکر ہوا خاتمہ بالآخر، عقل!      باقی نہیں اب کوئی ہوس اے ساقی!

## دکیل اختر، دکیل احمد اختر خان

اس جواں سال ادیب کا ۹ فروری ۱۹۷۱ء کی دوپہر کلکتہ میں انتقال ہوا۔ اور افسوس اس طرح ایک اور بے گھلا غنچہ بادِ مخالف ک نذر ہو گیا۔

ان کا اصلی نام عقیل احمد اختر خان تھا، لیکن بعد کو کسی وجہ سے بدل کر عقیل کی جگہ دکیل لکھنے لگے۔ ان کے والد کا نام سحان خان تھا۔ دکیل اختر ایک قریہ تھوڑی (ضلع گجرات، بہار) میں ۲۰ مئی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی۔ یہاں سے کلکتہ پہنچے اور مدرسہ عالیہ سے ۱۹۵۲ء میں اسکول فائنل کرنے کے بعد سنٹرل کالج کلکتہ سے بی اے اور پھر اسی یونیورسٹی سے تاریخ و تمدن اسلامی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ کینسر کا حملہ ہوا۔ علاج معالجے سے بظاہر ٹھیک ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرض جڑ سے نہیں گیا تھا۔ ایم اے کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول، کلکتہ میں پڑھانے لگے، چندے بعد ۱۹۶۷ء میں کلکتہ مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اسی دوران میں مرض عود کر آیا اور ادب کے جان لیوا ثابت ہوا۔

شاعری کا کالج کے زمانے میں شروع کی، اور آغاز میں اپنے کالج کے استاد پر و نصیر عباس علی خان

نیز دوت ۱۹۶۹ء) ہی سے اصلاح بھی لی۔ بعد کو انہوں نے اپنے آپ پر اعتقاد کو کے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں جدت اور نیا آہنگ ہے۔ آگے بڑھنے کے بہت امکانات تھے۔ اگر زندگی وفا کرتی، تو یقیناً ترقی کرتے، لیکن موت کسی کو تفر نہیں۔ مجبوراً کلام ان کی زندگی میں رتبہ نہیں ہوا، اور غالباً کلام مقدّم میں کچھ زیادہ بھی نہیں۔ ان کے احباب اسے سمیٹ کر 'دائروں کی شکست' کے عنوان سے چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں:

مندر دں مسجدوں اور گرجوں شوالوں کو تم

جس طرح چاہو سمار کر دو

اس لیے کہ

تم تو روزا دل سے

کتنے معبود کتنے معاہد بناتے —

— مثلتے، مثلتے بناتے چلتے آرہے ہو

اس لیے کہ تمہیں اب

خلاؤں میں بھی تھر سازی کا فن آچکا ہے

مگر اپنے ذہن رسا

زعم تحقیق و تخلیق سے پوچھ کر یہ بتاؤ

روزا دل سے اب تک

خون کا کوئی قطرہ بنایا ہے تم نے؟

گو کوئی راہبر نہیں ہوتا کارداں در بدر نہیں ہوتا

ہم نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں جن کے چہرے پہ سر نہیں ہوتا

صرف دہی کتاب پڑھنے سے آدمی دیدہ ور نہیں ہوتا



سنگ وہ پھینکتا ہے اور دلوں پر	جس کا شیشے کا گھر نہیں ہوتا
سچ کا پودا اٹھا کے دیکھ لیا	اس میں کوئی ثمر نہیں ہوتا
دوسروں پر کیا کوہ تنقید	تم سے کچھ اور گھر نہیں ہوتا
ہائے وہ لوگ جن کی نظروں میں	فرق عیب و سہر نہیں ہوتا
حسن والوں پہ کچھ نہیں موقوف	کون اب خود نگہ نہیں ہوتا
خزوں کی آنکھیاں ان کا غافل اپنی جھوٹی	تمناؤں کی کوہِ حرم نہ کہتے ہم تو کیا کرتے
منکر عیش و طرب ہے، یارو!	دل کا اب حال کعبہ ہے، یارو!
نہ غیر بھائے نہ اپنا لگے سبھلا مجھ کو	سے شعور نے کیا بنا دیا مجھ کو
کوئی سبب ہو، سرورِ گہر جو بیٹھا ہوں	بکھو دے ہو، تو بکھو شکستہ یا مجھ کو
اب غینہ کہاں آنکھوں میں شعلہ سا بھرا	یہ چستے ہوئے ہونٹوں کو ٹکے کی سزا ہے
یوں تو تمنائوں میں گھبراتے بہت	دل کے لوگوں سے بھی پھپھکاتے بہت
عجب خامشی اس کے ہونٹوں پہ تھی	عجب شور اس کی نگاہوں میں تھا
دند کی دستِ تہرِ تنگ رہی ہو برسوں	یہ زمیں ہم پہ بہت تنگ ہی ہو برسوں
یہ نہیں معلوم کہ کیا بات تھی	رور ہے تھے میرے مہیاے بہت
کسی صورت کوئی صورت نکالو	مجھے بے موت مرنے سے بچالو
اس شخص کے عزم کا کوئی اندازہ لگائے	جس کو گھبراہٹ دتے ہوئے دکھائے کسی نے
ہر قدم راہِ طلب میں دل پہ کہتا جائے ہو	جو خود سے مشورہ لے ہو وہ دھوکہ کھائے ہو
جو کبھی کرنا ہو وہ کو گزرتی دل کی رہے ہو	سوچنے والا ہمیشہ سوچتا رہ جائے ہو
یا دشمن یار میں اس دل کی کیفیت نہ پوچھ	آگینہ تندہی صہبا سے پچھلا جائے ہو
اس کی بزمِ ناز سے آخر اٹھو کہ جس جب بھی	یوں لگے ہو جیسے دل سینے میں بیٹھا جائے ہو
وہ ابھی جائے تو اس کو کہاں بٹھاؤنگا	میں اپنے گھر میں تو رہتا ہوں گھروں کی طرح

## میاں بشیر احمد

لاہور کے مصافات میں ایک قصبہ بانغا پورہ ہے۔ یہاں کی میاں فیملی اپنی وجاہت، ترقی پسندی اور ملکی خدمات کے لیے معروف ہے۔ اسی خاندان کے ایک گلی سرسید میاں شاہدین ہمایوں ہوئے ہیں۔ کیسی ڈانے میں پنجاب چیف کورٹ کے جج رہے تھے، اس لیے عام طور پر آئینہ زیب جسٹس میاں شاہدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ جسٹس شاہدین کے والد مولوی نظام الدین ٹہسے فیصلہ بردار تھے اور دادا مولوی قادیان بخش حید عالم اور ہمارا چچا رنجیت سنگھ کے عہد میں شاہی خاندان کے نوہاؤں کے استاد اور تالیف رہے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے، نادر تخلص تھا۔

جسٹس شاہدین بھی شعر کہتے تھے، ہمایوں ان کا تخلص تھا۔ ان کا مجموعہ کلام 'جذبات' ہے،<sup>۱</sup> کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میاں بشیر احمد نے شائع کیا تھا۔ ہمایوں کا ۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو انتقال ہوا۔ اقبال نے تاریخ وفات لکھی:

دو گھنٹان ہر ہمایوںِ نکستہ سچ آمد مثالِ شبنم و چوں بوسے گل و سید  
می حُبت عند لب خوش آنک سالکِ "غلامِ فصیح" ز ہر چارہ سُو شنید

انہیں میاں شاہدین کے اکلوتے بیٹے میاں بشیر احمد تھے، جن کا ابھی پچھلے دنوں ۲ مارچ ۱۹۷۱ء شام کے وقت لاہور میں انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت ۸ سال کی عمر تھی۔ میاں بشیر احمد مرحوم کے ساتھ گویا ہماری پھلی نسل کی شرافت اور قناعت، وضععداری اور خود کو نوازی کا جنازہ اٹھ گیا۔ انا لکھ ڈا رہا اید راجون۔

میاں بشیر احمد ۱۲ مارچ ۱۸۹۳ء کو اپنے خاندانی مکان، بابا خیا پنورہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تعلیم کے ابتدائی مراحل لاہور میں مکمل کیے۔ ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ کالج (لاہور) سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد ولایت چلے گئے۔ وہاں داؤد حم کالج، آکسفورڈ سے ۱۹۱۳ء میں بی اے (آنرز) کا درجہ کی سند لی، بعد ازاں سال کے تاریخ کے تمام طلبہ میں اول آئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں لندن سے پیرسٹری کا امتحان دیا۔ اس میں کامیابی کے بعد واپس وطن چلے آئے۔ اولاً چندے جہاں اعزازی طور پر اسلامیہ کالج میں تاریخ پڑھاتے رہے تھے۔

شعر بھی کہتے تھے۔ ذرا تخلص تھا۔ پہلے تہذیب خوان کے پردے میں سر عبدالقادر (د. ۱۹۵۰ء) کے اسٹائے غزن میں نثری مضامین بھی لکھتے رہے۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں اپنے دادا مرحوم کے تخلص کی مناسبت سے ابا نواہیوں جاری کیا۔ اس کے سرورج یہ شعر بھپتا تھا: جو ہمایوں مرحوم ہی کا تھا:

انھو، وگر د حشر نہیں ہوگا بھر کبھی  
دوڑو، زماں چال قیامت کی چل گیا

ہمایوں ہماری زبان کا صنفِ ادبی کا رسالہ تھا۔ کیا یہ کچھ کم افتادگی کی بات ہے کہ اس میں کوئی ایسی نظم یا غزل بھی نہیں تھی، جس میں لفظ 'بوسہ' استعمال ہوا ہو یہی احتیاط اور رکھ رکھاؤ میاں بشیر احمد کی پوری زندگی کی علامت ہے۔ ہمایوں ۳۵ سال تک اردو کی شاندار خدمات سر انجام دینے کے بعد ۱۹۵۷ء میں جہنم ہو گیا۔

میاں بشیر احمد نے اردو کی ترویج کے لیے ۱۹۳۶ء میں انجمن اردو پنجاب کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا اصل مقصد نوجوانوں میں علم و ادب کا ذوق اور تحقیق کا شغف پیدا کرنا تھا۔ وہ مختلف اوقات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رکن، پنجاب یونیورسٹی اور دہلی کے فیلو (۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۰ء) انجمن ترقی اردو کی منتظرہ کے رکن بھی رہے۔

یہ زائد سیاسی ہنگامہ دوکان تھا اور پھر ان کے خاندان میں تو سیاست اور مسلم لیگ کے دن رات چرچے رہتے تھے۔ سر میاں محمد شفیع ان کے چچا اور خیر بزرگوار تھے۔ (ان کی جگہ گیتی آباد سر محمد شفیع کی چھوٹی صاحبزادی اور جہان آباد جگہ شاہ نواز کی چھوٹی بہن ہیں)۔ مسلم لیگ کے مارچ ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس لاہور کی جلسہ میں پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی تھی۔ مجلس انتظامیہ کے سیکرٹریاں بشیر احمد ہی تھے۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کی مرکزی عاملہ کے رکن بھی رہے، ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۹ء پنجاب مجلس و اضلاع قوانین کے رکن بھی رہے۔ خصوصیات خاں نواز کی وزارت کے خلاف تحریک میں بھی شریک تھے، اور اس سلسلے میں نوبت قید و بند تک پہنچی تھی۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد وہ ۱۹۴۹ء میں ترکیا میں اپنے ملک کے سفیر مقرر ہوئے۔ ترکیا اور پاکستان کے درمیان دوستانہ معاہدے پر انھیں کے عہدِ صفحات میں دستخط ہوئے تھے۔

انھوں نے ابتدائی ایام میں (آج سے کوئی چالیس سال پہلے) اپنے فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ طلسمِ زندگی کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں روزمرہ کے واقعات کو بصیرت افزا نتائج اخذ کئے ہیں، وہ انھیں کا حصہ تھا۔ کتاب کی فنی ہر شکل و صورت بھی بہت دلیرانہ تھی، جوان دنوں اردو کتابوں کے لیے غیر معمولی بات تھی۔ اپنے والد کی سوانحوی انگریزی میں مرتب کی تھی ہاں میں ان کی تقریریں بھی شامل ہیں۔ ایک کتاب کا نام اسلام بھی ہے۔ اسلامی سیاست سے متعلق بھی، مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل، ایک کتاب موجود ہے۔ مضامین کا بہت بڑا ذخیرہ، بابوں کے صفحات میں محفوظ ہے۔

اولادِ جہانزیں ایک بیٹا (منظرِ بشیر) اور دو بیٹیاں (رفعتِ جہان اور ثروتِ جہان) ان سے یادگار ہیں۔ انتقال ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو لاہور کے مکھن (انتظر) میں ہوا تھا لیکن لاش اگلے دن (۴ مارچ) باغیاں پورہ گئی۔ جہاں ان کے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

## عبدالقادر سرودی (پروفیسر)

پروفیسر عبدالقادر سرودی صاحب کے والد حاجی محمد سرخشاہ، امہ عامرہ، حمیدہ آباد میں بحیثیت متاقلین شاہرے (غالباً ۱۰۵ روپے) پر ملازم رہے۔ یہاں ان کے دو بھائی و خواروں کے ۱۲ بچاؤ نے کام سپرد تھا۔ اس قلیل آمدنی پر بھی قناعت اور خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سرودی صاحب ان کی دوسری جوی کے لطف سے ۱۹۰۶ء کو حمید آباد میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی واردہ کی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے علاقائی بھائی سرودی محمد حبیب سے پائی۔ اسکول جانے کے قابل ہوئے، تو مختلف مدارس سے ہوتے ہوئے بالآخر شیانی اسکول سے دیوبند کے درجے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے ۱۹۲۷ء میں ایم اے (اردو) اور ۱۹۲۹ء میں ایل ایل بی (یعنی وکالت) کے امتحان پاس کیے۔ ایم اے میں مرحوم ڈاکٹر محمد الدین قادری زور۔ ان کے ہم جماعت تھے۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں اس وقت صدر شعبہ اردو مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی (ف ۱۹۶۸ء) تھے، ڈاکٹر سید سجاد (ف کرچی ۲۰۰۲ء) فروری ۱۹۵۵ء بھی یہیں تھے۔ اسی سال سلیم نے بیماری کے باعث طبی رخصت لی تھی اور ان کی جگہ مولوی عبدالحق صدر شعبہ مقرر ہوئے تھے سلیم جانتے وقت۔ فارغ التحصیل ہو گئے۔

سروری صاحب کو شعبے میں مددگار پر دفعہ مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ سروری صاحب اسی سال  
جانبہ عثمانیہ میں مددگار پر دفعہ اردو کے عہدے پر فائز ہو گئے اور اس طرح اب انھیں سروری  
عبدالحی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ یہاں ۱۹۴۲ء تک رہے۔ ۱۹۴۲ء میں سروری صاحب  
کا میسرور یونیورسٹی میں شعبہ اذکی صدارت اور پر دفعہ سروری پر تقرر ہو گیا۔ انھوں نے اپنے چھ برس  
دوران قیام میسرور میں یونیورسٹی میں اردو کی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے بہت کام کیا۔ ایم اے  
کے درجے کھلوائے، جس سے شعبے کا کام وسیع تر ہو گیا۔ اردو کے نصاب کے لیے کتب تیار  
کروائیں، تاکہ تعلیم کا معیار بلند ہو۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی مادر علمی میں صدر شعبہ کی جگہ خالی  
ہوئی، تو اس کی پیکش انھیں کی گئی، جس پر وہ حیدرآباد واپس آ گئے۔ وہ تیرہ برس بعد ۱۹۶۲ء  
میں یہیں سے پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا سرنگر میں انتقال ہو گیا۔ جہاں وہ جون ۱۹۶۱ء  
سے اردو اور فارسی کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اب  
اصحاب مجاز کی نظر انتخاب سروری صاحب پر پڑی، اور یوں ۱۹۶۲ء میں وہ سرنگر پہنچ گئے۔  
یہاں سے وہ مجازوں کی تعیلات کے ذرائع میں اپنے وطن چلے آتے تھے چنانچہ اب کے بھی نئی  
ور حیدرآباد میں قیام رہا۔ وہ ۵ مارچ کو حیدرآباد سے سرنگر کے نیچو دانہ ہوئے۔ راستے میں  
دلہ اور محبوب قیام کیا اور ۹ مارچ کو سرنگر پہنچے۔ اگلے دن (۱۰ مارچ) یونیورسٹی گئے۔ اسی رات  
دل کا دورہ پڑا، جو ہمک شدت ہوا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء رات ساڑھے دس بجے اللہ کو پیار سے  
ہوئے۔ ۱۲ مارچ قبل از نماز جمعہ جنازہ اٹھا اور ان کے سکون (دعا ہرگز) کے قریب ہی ایک  
دیوان سے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جناب نور اللہ حیدر آبادی (ملک جلیل) نے  
نے لکے شجرہ سے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی ہے:

وہ اویس باورا، وہ سپیکر خلقی و کرم ہے بجا اگر اس کے غم میں خون آنکھوں سے ہے  
نہیں وہ اور جی جاتے، تو ہوتا سال یہ عبد قادر سروری کثیر سے جنت گئے

انہوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی ان کی طالب علمی کے زمانے (۱۹۲۶ء) ہی میں ہو چکی تھی لیکن یہ بیگم ڈیڑھ سال بعد اپنے پیچھے ایک دودھیتی بچی چھوڑ کر اسٹا مفادقت وے گئیں۔ زبیدہ کلثوم ایم۔ اے (عربی) جو دنیا ہمارا دیا، حیدر آباد میں عربی پڑھاتی ہیں، وہی بچی ہیں۔ دوسرا نکاح انہوں نے بہت دن بعد ۱۹۴۳ء میں کیا تھا۔ ان سے بھی ماشا اللہ زمین لڑکے اور دو لڑکیاں یاوگار ہیں۔

سرور کی صاحب کو اردو تصنیف و تالیف کا شوق زمانہ طالب علمی سے تھا۔ سلیم مرحوم اپنے طلبہ سے بہت محبت کرتے تھے اور ہونہار نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے۔ یہ امر واقع ہے کہ زہد اور سرور کی تصنیفی شوق سلیم کی کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھا۔ بلکہ سرور کی صاحب نے اپنے والد کے نام کی رعایت سے سرور کی کی نسبت بھی سلیم کے ایما پر اختیار کی تھی۔

سرور کی صاحب کی سب سے پہلی تصنیف ”دنیاے افسانہ“ ہے، یہ انہوں نے ایم اے پاس کرنے کے بعد شائع کی تھی (حیدر آباد ۱۹۴۲ء)۔ اس کا دوسرا حصہ بعد کو شائع ہوا (۱۹۴۹ء) جس میں ”کوہ اور افسانہ“ سے متعلق بحث ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے بعض احباب سے دوسری زبانوں سے منتقل کردہ افسانوں کے چار مجموعے بھی شائع کیے تھے: قدیم افسانے، چینی اور جاپانی افسانے، از افتخار الدین و فیض محمد (۱۹۳۰ء)؛ انگریزی افسانے، فرانسیسی افسانے اور عربی (۱۹۳۲ء)۔ وہ ایک زمانے تک حیدر آباد کے ماہنامے مکتبہ کے مدیر رہے تھے۔ یہ افسانے پہلے وقتاً وقتاً میں شائع ہوئے؛ بعد کو انہیں کتابی شکل دے دی گئی، جب وہ شمارہ نویسوں کے شعراء اردو سے منسلک ہوئے، تو انہوں نے ”جدید اردو شاعری“ تصنیف کی (۱۹۳۲ء)۔ ایک لحاظ سے یہ کتاب حالی کے ”مقدمہ شعراء شاعری“ کا متمم ہے۔ یہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ دلی اور لاہور سے شائع ہوئی ہے۔



اسی زمانے میں جامنہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے اپنی انجمن طلبہ سائنس قائم کی تھی ؛ اس کا اپنا مجلہ بھی تھا۔ شروع میں غالباً پانچ برس تک (۱۹۳۷ء - ۱۹۴۱ء) زور مرحوم اس کے مدیر رہے۔ اس کے بعد ایک سال (۱۹۴۲ء) یہ سرودی صاحب کی ادارت میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر زور ادمل (۱۹۲۱ء میں یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے اور جامنہ عثمانیہ کے شعبہ اردو ہی میں ان کا بھی تقرر ہوا۔ جیسا کہ بیان ہوا، مولوی عبدالحمید اس زمانے میں صدر شعبہ تھے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے سکتر اور انجمن کے شہرہ آفاق ماسٹر اساتذہ اردو کے مدیر بھی تھے۔ خدا معلوم کیونکہ ان کے ادیبوں کو یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ مولوی صاحب موصوفت مقامی مصنفوں کی مناسب حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ زور ادمل سرودی کے زمانہ طالب علمی سے باہمی دوستانہ تعلقات تھے۔ انھوں نے اس خیال کو ہوا دی اور اپنے احباب کے ساتھ شورہ کرنے کے بعد طے کیا کہ دکن اور دکنیات اور دکنی ادیبوں کے فروغ کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت جنوری ۱۹۳۱ء میں ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے اولین بانی پانچ شخص تھے: ڈاکٹر محمد الدین قادری زور دت (ستمبر ۱۹۶۲ء)؛ پروفیسر عبدالقادر سرودی؛ پروفیسر عبدالمجید صدیقی، نصیر الدین اشقی (ستمبر ۱۹۶۳ء)؛ اور مولوی عبدالقدیر صدیقی۔ ان میں شعبہ دینیات، جامنہ عثمانیہ (دست ادمل ۱۹۳۲ء)۔ کہا نہیں جاسکتا کہ ان صاحب کاشک و شبہہ کس حد تک جائز اور صحیح تھا۔ لیکن پچھلے ۴۰ سال میں اس ادارے نے اردو کی ترقی و ترویج، تصنیف و تالیف اور مخطوطات کے تحفظ و ترمیم کے سلسلے میں جو شاندار خدمات سر انجام دی ہیں وہ تاریخ ادب اردو کا روشن باب ہیں اور اردو ادب کو اس پر فخر کو ناچاہیے۔

ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے سرودی صاحب کی یہ کتابیں شائع ہوئیں: سراج

کے کلام کا انتخاب 'سراج سخن' (۱۳۵۵ھ) 'سراج اور اس کی شاعری' اور 'شعری کا ارتقاء' (۱۹۶۲ء)؛ افسانوں کا مجموعہ 'رات کا بھولا اور دیگر افسانے' (۱۹۶۲ء)؛ اردو کی ادبی تاریخ (۱۹۵۷ء)۔ ایک کتاب 'زمان اور طر زمان' 'مجلس تحقیقات' حیدر آباد نے شائع کی تھی (۱۹۵۶ء)۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ابھی پارسل شائع ہوا ہے۔

نواب یوسف علی خان سالار جنگ سوم (د ۱۹۴۶ء) حیدر آباد کے شہسپائی امیر تھے۔ سالار جنگ میوزیم انھیں نے جمع کیا تھا۔ وہ علم و ادب اور فنون لطیفہ کے شہسپا اور پارکھ تھے؛ کئی زبان کے کئی انول تھیں اپنے کھانے میں جمع کیے تھے بعض احباب کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۳۵ء میں 'مجلس اشاعت' دہلی خطوط قائم کی جس کا مقصد اس کے نام سے عیاں ہے۔ سروری مرحوم بھی اس کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ انھوں نے اس مجلس کے لیے یہ کتابیں مرتب کیں: پھولن از ابن فاضل (۱۳۵۵ھ) 'قصہ بنظیر' (۱۳۵۷ھ) 'کلیات سراج' (۱۳۵۷ھ)۔

انھوں نے اپنے قیام میور کے زمانے میں نواب حیدر علی خان (د ۱۹۸۲ء) کے منشی 'مستاب' رائے سبقت کی بیاض 'مستاب سخن' کے عنوان سے مرتب کی تھی۔ میور میں ایک صوفی بزرگ شاہ صدر الدین گذرے ہیں۔ ان کا تصنیف کردہ ایک رسالہ 'مرآۃ الاسرار' دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے۔ سروری صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

سرنگر کشمیر کے قیام کا ثمرہ تین کتابیں تھیں: کشمیر کے دو ادیب 'دو بھائی' (پنڈت برگپال خستہ اور سالک رام سالک) (حیدر آباد ۱۹۶۷ء) اور کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ (حیدر آباد ۱۹۶۷ء)۔ انھوں نے ریاست کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ آخری ملاقات کے دوران میں انھوں نے بتایا تھا کہ تقریباً ۹۰ صفحات لکھے جا چکے ہیں، اس کا سودہ کچھ لکھ کر اکٹری، سرنگر کی قویل میں ہے۔ اسے جلد شائع کر دینا چاہیے۔

## قیس بناری، نمشی شیو مورت لال

ان کے بزرگوں کا وطن ضلع جو پنود کا قصبہ منڈیا ہوں (ضلع جو پنور) تھا۔ یہاں ان کی کچھ زمین تھی اور کھیتی باڑی ذریعہ معاش تھا۔ قیس کے والد نمشی گنپت سہاسے تقریباً ایک صدی پیشتر اس گاؤں سے نقل مکان کو کے بنارس چلے آئے تھے۔ وہ قوم کے سربراہ (ستود کا کستھ) اور پیشے کے لحاظ سے غرائض نویس تھے اور اس فن کے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس سے انھوں نے خاصی بڑی جادو پیدا کی تھی۔

قیس ۱۹۰۲ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کونٹھ کالج پینچ، میکن یہ وہ زمانہ ہے جب انگریزی حکومت کے خلاف ہماری جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ قیس نے بھی ترک مولات کی تحریک پر لبیک کہا اور تعلیم چھوڑ، کانگریس میں شامل ہو گئے۔ اس سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، اس کے بعد تعلیم کا رشتہ کچھ بھی استوار نہ ہو سکا۔

شعرو شاعری سے دلچسپی بھی اسی زمانہ میں پیدا ہوئی، لیکن مرثیہ پڑھنے اور سننے کی حد تک۔۔۔ ایک مشاعرے میں اتفاق سے ملاقات بنارس کے مشہور اہل دل شاعر شاہ

لال صوفی (د ت جون ۱۹۳۶ء) سے ہو گئی۔ صوفی ہمارے مرحوم وزیر اعظم شری لال بہادر شاستری (د ت جنوری ۱۹۶۶ء) کے حقیقی ماسوں تھے؛ شاستری جی کی تعلیم تربیت بھی صوفی کے سایہ عاطفت میں ہوئی تھی۔ وہ ایک زمانے تک ڈسٹرکٹ جج بریلی کے جج بھی رہے تھے۔ صوفی خود رحمت بنارس (د ت ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء - ۱۹۳۶ء) تلمیذ داغ کے شاگرد تھے۔ غرض نوجوان قیس کی صوفی سے ملاقات کا نتیجہ نکلا کہ ان کے اندر کی خوابیدہ شعری قوتیں بیدار ہو گئیں۔ انھوں نے قیس تخلص اختیار کیا، اور صوفی سے اصلاح لینے لگے۔

چونکہ والد کے ترکے سے ابھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، اس لیے فکر معاش ان کے شوق کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔ شاعری اور شراب ان کے دو شوق زعدگی کے ساتھ بنے۔ انھوں میں کچھ پریشان سے رہنے لگے تھے۔ اس پر اتر پردیش کی حکومت نے ان کا ۷ روپیہ ماہانہ وظیفہ (ادبی) مقرر کر دیا تھا۔

انھوں نے کلام شائع نہیں ہوا، حالانکہ ضخیم کلیات موجود ہے۔ اگرچہ سب اصناف سخن — غزل، نظم، رباعی، قطعہ — میں کلمج آزمائی کی، لیکن ان کا اصلی میدان غزل تھی۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۱ء کو بنارس میں انتقال کیا۔ احباب اور شاگردوں کی بہت بڑا حلقہ ان کے سوگواروں میں ہے۔

ان کے کلام میں جذبے کی شدت اور دالہاد پن ہے، جو اثر سے خالی نہیں۔ پڑھنے میں بھی ایک دانشمندی کا عالم تھا۔ چند شعر سنئے:

میری میناے تغزل سرفراز آرزو  
اب تو میں آہی گیا ہوں آستلنے پر تے  
لے بت ایساں شکن! کیا ہے یہ راز آرزو؟  
کچھ بھی دے کیونکر ادا ہوگی نثار آرزو!  
کتنے جذبے موجزن ہیں دیدہ دل میں تے  
کتنے نغموں سے بھرا ہے میرا ساز آرزو!  
تیرے جلوے میرے مجھ سے تیرا عالم نیرول  
اس پہ بھی ہوتا نہیں ہے امتیاز آرزو

## مذکورہ محاورے

میں وہی ہوں قیس جو تیری بدولت آج بھی ہر حقیقت کو سمجھتا ہے مجازاً آرزو

اے قیس! پوشے کا ہر اک جام پیے جا  
کچھ بھی تو نہیں گود میں آیا م، پیے جا  
کو ترک خودی، صبح سے تا شام پیے جا  
اک غورۂ ستانہ ہے انجام، پیے جا  
جس زیت میں کچھ غم نہیں وہ دیکھ سکتی  
ہر سانس تجھے دیتا ہے پیغام، پیے جا  
تیرے ہی لیے ساری انصاف جھوم رہا ہے  
تیرے لیے ہے دھوکا ہنگام، پیے جا  
تجھ کو تو بالحق کی صدا ڈھونڈ رہا ہے  
منصور کے سایے میں سرگم، پیے جا  
ان ہوش کے بندوں میں ترا نام نہیں ہے  
گنام ہی اچھا ہے، تو گنام، پیے جا

نگاہ تو نے ڈال دی تو زندگی نئی ملی  
نگاہ تو نے بھرنی، فنا خستہ ہو گیا  
بغبارِ ست و دست کو دفا پرست کیا کرنا  
مزاجِ سخن ہی تو ہے بدل گیا بدل گیا

اگر شعورِ عشق ہے، تو زندگی حسین ہے  
غوشی لی، تو کیا ہوا، جو غم ملا تو کیا ہوا

اے مری جان تغزل! اک ادائے لبریں  
اب تو ایمانِ محبت ہے، نگاہِ کاوی  
اے مری جان تنہا! اے مری جان نظر!  
قبلِ تسلیم تیری خود غنائی، غورِ دوسری  
پھر تری سوچِ شبنم کی طوطِ رقصال بول  
پھر فریبِ آرا ہوئی تیری نگاہِ سامری  
پھر مجھے لے جا کے اہل منزل پہنچائے جہاں  
ہر نظر ہے فتنہ پرور، ہر اداجادِ مگر

ہم اہلِ غمِ مہات کو حیات کہتے آئے ہیں  
ستم کی ہر اداکو التفات کہتے آئے ہیں  
غوشی لی غوشی ہی، جو غم ملا تو غمِ سہمی  
تھادی دین کو تبرکات کہتے آئے ہیں

- ذمہ سنا

جہاں کے آواز سے میں کھارہن ہوتا  
اسی جہاں کو آگ بے ثبات کھٹے تھیں  
جہاں کو ساتھ میں لے بیجوئی کے ساد پر  
ہمیشہ تھیں اپنے دل کی بات کھٹے آئے ہیں  
متفرق اشعار

نہا پر مجھ سے ابھی کچھ زندگی کہا ہے  
کچھ جواز تھا اسے دوست اپنی خام کہ

پنزدہ گل آئے اسے جنت نہ مل  
دوست بھی ایسے ملے جن سے طبیعت ملی

اصح و نیا قائم ہے اس کے کہ کوئی امید نہیں  
جو کہ کوئی حاکم ہے قسمت میری وہید نہیں

ایک لکھوں کے دامن میں یہ رات بسر ہو چکی  
جب صبح کی کہیں چوٹ لگے تو شبنم ایک ہو چکا

تھے نہیں مزاج دلہ بقرار کے  
وہ اندھ جگے کہو دیا تم نے پکار کے

ایلیں کو پیار کیا میں نے تیرے دھوکے کیا  
جہاں جہاں تری پچھائیاں ملیں مجھ کو

مریم دوست کی پکار آج بھی ہو اس طرح  
عین اثر سے صلیب کی مات بہت ڈاس

## اختر تلہری، سید اختر علی

فتح شاہ بہاچند میں ایک قصہ تلہری ہے! یہیں مشہور سادات کے ایک متاثرہ سنی گھرانے میں ۱۲۱ پر مئی ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے خاندان کے ماحول اور مقامات کے پیش نظر رہی رہا اور اس میں تخیل کے درجے تک پہنچے۔ وہ مدرسہ عالیہ ماسکو کے فارغ التحصیل تھے۔ جہاں 'فارسی کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی اتنی اچھی مہارت پیدا کر لی کہ انگریزی کی اعلیٰ اور دقیق کتابوں سے بلا تکلف استفادہ کر سکتے تھے۔ ان تینوں زبانوں میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ذریعہٴ مسامحہ تدریسی تھا۔ وہ ۱۸ برس تک جوہلی کالج، انگلستان میں پڑھاتے رہے اور یہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ فلموں کی انیمیشن سازگار ماحول میں رہا اور ان کی قابلیت اور توانائی طبع کو اپنے جوہر دکھانے کے لیے پورا میدان ملا، وہ نہ جس پاپے کے وہ محقق اور ادیب، نقاد اور ماہر لغات تھے، ہماری زبان کا دامن ان کی نگارشات سے امانت ہو سکتا تھا۔

جوہلی کالج میں ان کے ہنگاموں میں حامد اشرفی (اردو) اور علی عباس حسینی (تالیف)

اور خواجہ اچھر حسین د انگریزی ہتھے۔ خواجہ اچھر حسین نے ایک زمانے میں مالہ ادب (کھنٹو) میں کچھ مزاحیہ مضامین بھی لکھے تھے، جن میں سالی اسرود مہارہ وغیرہ نے خاص شہرت پائی۔ ادب کے ایڈیٹر اعظم حسین تھے۔

اسی زمانے میں میسجیوں میں دو فرقی ہو گئے: علما، اور جدیدی۔ اختر بھدا آزاد خیال تھے اور قدامت کے مخالف؛ چنانچہ انھوں نے جدیدی گروہ کی تائید کی۔ اچھر حسین اور علی عباس حسینی بھی اس میں ان کے ساتھ تھے۔ انھیں آیام میں اچھر حسین نے بھڑے کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں روایتی نظریے سے انحراف تھا۔ اس کا جواب فیسیوں کے کالچ سلطان المدارس کے مدرس مولوی سید عبدالحکیم منطقی نے دیا۔ پھر تو سخت دن پڑا۔ اس مناقشے میں اچھر حسین کو ساما سوادا خیر سامانے ہٹا کیا تھا۔

اگرچہ حکومت کے ملازم تھے، لیکن شدید قوم پرور، مدتوں روزنامہ سرفراز (کھنٹو) میں "سیر دلبر" عنوان کا مزاحیہ کالم "محل افشاں" کے قلم سے لکھتے رہے۔ حسینی بھی کبھی کبھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان مضامین میں یہ فکری گھسیٹکھولی کو حکومت کی خلاف ورسی کرتے تھے۔ سرفراز شیعہ کانفرنس کا اخبار تھا، اور خواجہ اسد اشرف اس کے ایڈیٹر تھے۔ کانفرنس میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا اور وہاں دو پارٹیاں بن گئیں۔ اس کشمکش میں اسد کی نوکری کے ماتھے گئی۔ اسد نے خیال کیا کہ اختر اور حسینی بھی ان کے مخالف ہیں۔ انھوں نے بدلہ لینے کی خاطر ان کے وہ مسودات جن میں ان لوگوں نے حکومت پر نکتہ چینی کی تھی، حکومت کے حوالے کر دیے۔ پھر کیا تھا، تہلکہ مچ گیا، صدوزوں ملازمت سے الگ کر دیے گئے، شیعہ رؤسا کا حکومت میں بہت رسوخ تھا۔ ان کے دوستوں نے بچ بچاؤ کیا۔ بارے حکومت نے برطرفی کا حکم واپس لے لیا اور بات تباد لے پر ٹل گئی۔ حسینی غازی پور بھیجے گئے اور اختر شامہا پور۔

وہ مدتوں سرفراز میں "محاسبے" کے عنوان کے تحت "مبصر" کے نام سے تبصرے اور



علمی، ادبی محاکمات بھی سمجھتے رہے۔ لغت پر ماہرۂ قدوت تھی اور محافظہ بے پناہ تھا۔ راج کے دیکھے بغیر قلم برداشتہ ایسا اقل، دول سمجھتے تھے کہ اعتراض کسی کے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے کئی معرکے یادگار ہیں، جن میں حامد اشرف اور احمد مجنوں گورکھپوری سے چپقلش خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مذہب کے بارے میں ان کی رد و اداری ضرب المثل تھی۔ اختلاف خواہ ملک کے دو طبقوں میں ہو یا مسلمانوں کے دو گروہوں میں، وہ ان دونوں کے مخالف تھے۔ ان کی تحریریں اس نظریے کی ترجمان تھیں۔ ان کی کتابیں ابتلائے عظیم (۱۹۲۵ء)، شہادتِ عظمیٰ (۱۹۳۵ء)، مذہبی تصورات (۱۹۵۳ء)، علمی تصورات (۱۹۵۳ء)، ہولناٹوں کا اسلامی نظریہ سیاست، شعر و ادب، تنقیدی شعور (۱۹۵۷ء)، مقالاتِ تلہری، افسانہ نگری کا کتاب آئیڈل کی گنگ جہاں ان کے علم کی وسعت کی آئینہ دار ہیں، وہیں ان کے فکر کی گہرائی پر بھی برانِ قاطع ہیں۔ ان کے سینکڑوں مضامین مختلف رسائل و جرائد میں منظرِ پڑے ہیں۔ خاص طور پر اقبال کی شاعری اور فلسفے پر انھوں نے بہت اہم سلسلہ مضامین قلمبند کیا تھا۔ وہ کبھی کبھی شعری بھی لکھتے تھے، آخر تخلص تھا۔ انھوں کو مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

وہ بہت دن سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ انھیں مدت سے فشارِ دم کا تکلیف دہ صدمہ لاحق تھا۔ اور جب اس کا دورہ پڑتا تھا، وہ ازکارِ رفتہ ہو جاتے تھے۔ پارسال اپریل میں دل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ جب حملہ ہوا، تو لہراپور اسپتال، کنکھنوی میں علاج کی غرض سے داخل ہوئے اور اچھے ہو کر واپس مکان پر آ گئے۔ لیکن اب سیدھا ہاتھ اور پاؤں مفلوج ہو گئے۔ ساتھ ہی پیٹ میں ایک گلی خوداد ہو گئی جو ڈاکٹر دس کی تشخیص کے مطابق مگنیشیئم ثابت ہوئی۔ جب حالت خراب ہونے لگی تو دوبارہ لہراپور ہسپتال چلے گئے وہیں بدھ کے دن ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء صبح ۱۰ بجے ان کے چھبے اشہ کو پیارے ہوئے۔ اسی

دن جسدِ خاکی خاں بہا پور منتقل کیا گیا، جہاں شام کو خاندانی قبرستان واقع ہے۔ محرمی  
میں تدفین محل میں آئی۔

وہ بیٹے آفتاب اختر، اندر اہل اختر، اندر ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔ بڑے  
بیٹے آفتاب اختر کا مدھی اختر کا کالج، شاہ بہا پور میں مدرس ہیں۔ نونہ کلامِ ملاحظہ ہو:

میر احمد قہدی سنگ در جانا نہ ہے  
تو بہ! ذوقِ بادہ، رہنِ فیشہ و پناہ ہے  
سکرانا ہی رہے جو حادثات و ہول  
ایسا دیوانہ حقیقت میں بڑا فرزند ہے  
پارہے ہیں اس سے اک تازہ چٹا ہل چن  
وہ حرے شور و سر کا فخر ستا نہ ہے  
سے شہیدانِ وفا کی خاک اور کج کرے  
کیش اپنا بندگی مست مردانہ ہے  
ہے کبھی پیش تو کبھی ہت خانہ ہے  
مقل و دائل کے جوں کی بدھ اس کچھ پوچھ  
ورنہ تیرا دل تو اس کا خاص ملوٹ ہے  
قولے! وہی تو خیالِ ناسوا کو دی جگر  
یوں تو کچھ کو یہ مرد با خدا دیو اندہ ہے  
کھول ڈالے باتوں ہی باتوں میں اس راہِ بیت  
سائے آنکھوں کے اختر جلو کجا نہ ہے  
دین سے مطلب نہیں، دنیا سے بیگانہ ہوں  
نہیں ہو ترش تیغِ جفا وہ میرے قاتل کی  
مراختن جنوں شربِ تم سے وہ نہیں سکتا  
نچکا ہوا اب کی طوفانِ نفس موج کڑنا ہو  
ہم قدر اس کا ہے پامالِ کام و ہرواں ہونا  
بہا پور میں سے تیرے فرادیل جاے تو طاعت ک  
کھیں سے تیرے فرادیل جاے تو طاعت ک  
نچکا ہوا جو زماں راہ میں کس شوق سے آئیں  
بہا پور میں سے تیرے فرادیل جاے تو طاعت ک  
مگوں کا رنگِ بو جنتِ بدلاں ہی ہیں، میکن  
شادی مشت سے آخر میری وہ شانِ خودداری

عمر بھی ہو تجھے ہر طلعت اکھٹا نصبت  
ترے جلوں کی ہیں شقائق نظریاں ہر فصل کی  
جے اظہارِ وقت خود ہی رہتا اس معنی میں  
لجے حاجت نہیں فنِ قوافی و فاضل کی  
جنت جو کل مرتب ہے جنت نہیں ہی  
یہی چمن مزاج طبیعت نہیں رہی  
پامال حادثات ہے گلچینِ نظر  
سیرے خیال و فکر میں ندرت نہیں ہی  
بار بار ہے ذخرا ماں چمنِ حسن  
لیکن گلوں میں پہلی سی گھٹ نہیں ہی  
اس انقلاب و ہر کی یز گیاں نہ پوچھ  
دنیا سے رنگ و روک وہ صورت نہیں ہی  
شور و ہنگامی فکر کی 'اشد ری جراتیں!  
حد بندی مجاز و حقیقت نہیں رہی  
جب سے سنی ہے طور و شکل کی داستان  
اب تنگ سے کہہ کی جانب ہو مبالغہ  
اک محلِ شب چراغ ہے غور و نظر گلشن  
یہ پیش بندیاں ہیں کسی انقلاب کی  
ہندوستان کا ہر ہے آخر! عروج پر  
وہ سرورانِ حصر میں نوبت نہیں رہی

### قطعات

#### بلند حوصلگی

گوداب کے نکلے سے ادا کھینچے دلے!  
پھری ہوئی سبوں میں بھی لگوں میں ہنسا ہوں  
ہے سب حادثات جو بلا طیر! تو کیا ڈر  
میں برق سے 'آندھلی سے' سندھو کو لا ہوں

#### عقولِ جنش میں بلند

خوش غل رند! میں اب ہر دور کی رنیت  
زادہ رنگ نظر کے لیے تلوں ہی ہوں  
دانشِ حصر ہے کیا ان کی روشِ جنناں!  
حرمِ راز تو ہیں 'چاکِ گرجاں ہی ہوں  
دلخِ نظرتِ عوداد! شیشیں امت پوچھ  
کسی کا ڈر ہے 'جھکتی نہیں جیس میری  
خود راہی ریاست چہ شکر اتا ہوں  
ہے ان کے عرش سے بالا کہیں میری

## حبیب اشعر دہلوی، حکیم حبیب احمد

حکیم حبیب احمد اور حکیم اجمل خان مرحوم ایک جڑی تھے۔ وہ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، ہر طرح کی فراغت تھی، اس لیے جوانی تک بہت حد تک آرام سے بسر ہوئی۔ اگرچہ قرآن، عربی، فارسی سب علوم کی تعلیم خاص اساتذہ سے حاصل کی تھی، لیکن طبیہ کالج سے تکمیل کے بعد اپنی خاندانی ذمہ داری کے پیش نظر طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ملک تقسیم ہوا، تو یہ بھی لاہور چلے گئے۔ اس کے بعد گردشِ روزگار نے گویا ان کا گھر دیکھ لیا۔ وہ اطمینان اور فارغ اہمالی جو شروع سے ان کے گھر کی لڑائی تھی، دلی چھوٹے ہی ساتھ چھوڑ گئی۔ لاہور میں طب قائم کیا، اور کئی مرتبہ مختلف اخباروں میں طبی کالم لکھتے رہے؛ اپنا ماہِ طبی اور ادبی، رسالہ حاذق، نکالا، متعدد عربی کتابوں کے مستند ترجمے شائع کیے، غلوں کے لیے کہا نیاں نکھیں — لیکن اتنے پاڑ بیلنے کے باوجود معاشی تسکین نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ نہ طبابت کے پیشے میں کوئی کامیابی نصیب ہوئی، نہ ادب و شعر نے کوئی فائدہ پہنچایا۔

۱۵ جون ۱۹۷۱ء رات کو لاہور میں قید جیات و زندہ غم دونوں سے نجات ملی۔ خاندانِ شریفی کے ذیلی قبرستان گلبرگ، لاہور میں سپرد خاک ہوئے۔

مشہور بہ نانی مصنف اور شاعر خلیل جبران کی متعدد کتابوں کے ترجمے کئے تھے جو چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: ٹوٹے ہوئے پر، شیطان، دلہن کی سیج، بنفشہ کا پھول، ریت اور جھاگ، آشک و شبنم، پکار۔ ان کے علاوہ مصری افسانہ نگار مصطفیٰ الطفی منفلوطی کے یہ ترجمے چھپے ہیں: رخسار، ساج، شبناز، مصر کے دوسرے شہر، آفاق صفت محمد حسین ہیکل کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کئے تھے مثلاً عمر فاروق عظیم۔ عربی کہتے تھے، اشعر تخلص تھا۔ ان کا مختصر مجموعہ کلام 'راز دنیا' کے عنوان سے قبل تقسیم ملک شائع ہوا تھا (۱۹۳۹ء)۔ کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

بطور نمونہ ان کا کچھ کلام ملاحظہ ہو:

روح فرسا کوئی ناز دلِ ناشاد کوئی  
آج تھے آج ہم عشق سے آزاد کوئی  
اہلِ دل جلوں میں ان کے آج اشعر اکتو  
بقیہ ان ازل کو بھی قرار آہی گھسیا  
نہ ہو سترت میں علم کا پہلو، تو زندگی میں مزا نہیں ہے

میں اس کو دل ہی نہیں بھتا، جو درد سے آشنا نہیں ہے  
جو! یہ سیداد بے سبب کیوں، محرم کی امید پر غصہ کیوں؟

تم ایسے پیش آرہے ہو ہم سے، ہمارا جیسے خدا نہیں ہے  
زمین بھی دشمن، فلک بھی دشمن، تمام عالم خلافت، لیکن

مجھے تو اس بات کا ہے رونا، تمہیں بھی خوفِ خدا نہیں ہے  
مرے حق میں اکہی! یہ جفا، دوست کیا کم ہے

مری تقدیر سے وابستہ دو دریاں کیوں ہوا  
چونِ شست میں چٹا وہ دیکھی جھبہ بھی گئے  
کام کی باتیں بھی نذرِ بہو دنیاں ہو گئیں

اب یہی دل ہو پریشان و پشیاں کیا کیا      اس کی کجبت نے رہا اس سے کیا خود پیدا  
 انا انا، تم باؤنی، تم نرائی، انا کہ بلبل      کن عنوان سے مشہور ہو اک داستانِ پنی  
 دنیا کو دیکھ دیدہ مینا لیے ہوئے      ہر جگہ ہے جہاں تماشا لیے ہوئے  
 تو اور یہ سارے بھی تجھ کو عمرِ احسن      میں اور دل میں تیری تمنا لیے ہوئے  
 اب ہم ہیں اور کشمکشِ اضطرابِ دل      وہ دن گئے کہ دعویٰ صبر و قرار نکھا  
 شاید ہے انتہا ہے محبت اسی کا نام      تم پاس تھے تو اور بھی دل مقرر نکھا  
 ہر ذرہ ہے سطرِ زریہاں، ہر تپا ہے نعلِ طورِ یہاں

اب جائے بھی تو جا کر شوے دادی این کیا کیجے  
 یہ موجِ چمن، یہ موسمِ گل، صیادِ پہاں بھی زور نہیں

اس وقت ہے ایک اک شاخِ یہاں شایانِ نشین بھی کیجے  
 دل میں خوابِ خدا تو ہے، اشعر!      میں اگر بارسا نہیں، نہ سہی  
 سو بوناؤ ہیں، ترے اک اک جگاڑ میں      بس پھر دھیر دھیر کو تجھے دیکھا کرے کوئی  
 ہو گیا تذکِ محبت کو زمانہ، اشعر!      خواب کی طرح کہیں اس کا خیال آتا ہو

## محمد حبیب (پروفیسر)

لکھنؤ کے متاد خاندان فیض کے نام سے آئے تھے۔ اس خاندان نے دندگی کے ہر شعبے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر حبیب کے والد جناب محمد نسیم دت (۱۹۵۵ء) اپنے زمانے کے مشہور دیوانی وکیل تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے اور تینوں نے اپنے اپنے میدان میں بڑا نام پایا۔ بڑے محمد نسیم تھے۔ یہ اپنے والد سے بھی بڑے نامی وکیل ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہاں کئی دن ایڈووکیٹ جرنل کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ ان کا ۱۹۵۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ دوسرے بیٹے پروفیسر محمد حبیب تھے اور تیسرے سب سے چھوٹے پروفیسر محمد حبیب دتس چائلڈ جاسٹس ملٹی اسلایڈ ہیں۔ خدا انہیں اپنی حفظہ امان میں رکھے۔

پروفیسر محمد حبیب ۶ جون ۱۸۹۵ء کو اپنے آبائی مکان (تیسرا باغ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے؛ یہ مکان اب مہندم ہو چکا ہے، ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۰۷ء میں ایم اے لکھنؤ کے اسکول میں داخل ہوئے اور یہیں سے ۱۹۱۶ء میں بی اے کیا، اس سال یہاں سے درجہ اول میں پاس ہونے والے وہ واحد طالب علم تھے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہو کہ

۱۹۱۵ء میں اپنے اسکول کے قرآن کی پڑھائی، معانی، تشریح وغیرہ کے امتحان مقابلہ میں دہ آؤں آئے تھے اور منتخبین (مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا ابوالخلام آزاد) نے انہیں پہلا انعام دیا۔

یہاں سے بی اے کرنے کے بعد وہ ولایت گئے اور شیو کالج، آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں بی اے (آنرز) کی سند پائی، یہاں مشہور مؤرخ سیرنٹس بارکوان کے استاد تھے۔ اب پنڈت موتی لال ہنرد کے بلاوے پر وہ ہندستان آئے۔ پنڈت جی پہلے تھے کہ وہ ان کے جاری کردہ انگریزی روزنامہ انڈیا پنڈٹ (گھنٹوں) کے ادارہ تحریر میں شامل ہو جائیں۔ لیکن ہوا کہ وہ ایسی پردہ علی گڑھ ہی میں ۱۹۲۲ء میں پہلے ریڈر اور سال بھر بعد ۱۹۲۳ء میں پروفیسر شعبہ تاریخ ہو گئے۔ جب پولیٹیکل سائنس کا شعبہ کھلا تو وہ اس نئے شعبے میں پروفیسر مقرر ہوئے؛ تاریخ کے لیے کسی اور صاحب کا تصور عمل میں آیا جیسا کہ صاحب ایک مرتبہ علی گڑھ پہنچ کر پھر عمر بھر یہاں سے نہیں نکلے۔

ان کی پوری زندگی علم کی خدمت میں بسر ہوئی؛ خاص طور پر تاریخ ان کا موضوع رہا۔ انہیں ہندستان کے عہدِ وسطی (اسلامی دور) کی تاریخ سے خاص شغف تھا۔ اور ان کا اس کے ماہرین میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ ہماری یونیورسٹیوں میں آج جو اس عہد کی تاریخ سے اتنی دلچسپی لی جا رہی ہے اور یہ دور خاص طور پر مطالعے اور تحقیق کا موضوع بن گیا ہے، تو اس میں مروجہ پروفیسر جیب کی ساعی کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ نہیں۔ اور جو ہیں وہ بھی بیشتر اسی عہد کے متعلق ہیں۔ لیکن جو کچھ لکھا ہے، وہ مستند ہے اور ہم آج تک اس پر اضافہ نہیں کر سکے۔ ان کی کتاب سلطان محمود غزنوی پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے جرات بخیزی سے سلطان محمود کے کردار اور عمل کو خلافتِ اسلام قرار دیا۔ اس پر بعض مفسرین نے ان کی بہت مخالفت کی؛ خاص طور پر اردو اخباروں میں بڑے بڑے مضامین چھپے، لیکن



انھوں نے اس کی ذرہ برابر پردہ ان کی اور اپنے نقطہ نظر پرستی سے قائم رہے۔ چنانچہ جب اس کتاب کا ۱۹۵۲ء میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں ایک لفظ کی بیشمار ترمیمیں تھیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں مہات ملار الدین خلیجی (۱۹۲۶ء)؛ مسختر ایمر خسرو دہلوی (۱۹۲۷ء)؛ ہندستان ماقبل مسخ غوری (۱۹۳۰ء)؛ نظم و نسق امرا (۱۹۳۲ء)؛ دلی سلطنت کا سیاسی نظریہ؛ اسلامی تصوف کا آغاز (شائستگی مکتبہ نیویڈ) میں نظام یکچکر (۱۹۳۶ء)؛ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۳۸ء)۔ یہ سب کتابیں اولاً انگریزی میں شائع ہوئیں؛ بعد کو ان میں سے بعض کے اردو ترجمے بھی ہوئے۔ ابھی پچھلے سال انھوں نے تاریخ ہند (عہد سلطنت) پر تفسیر خلیجی احمد نظام الدین کی شرکت میں شائع کی تھی۔ اس میں مغلیہ دور سے پہلے کی سلطنت دلی (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) کے حالات پورے شرح دبط سے بیان ہوئے ہیں، نیز صوبائی حکمران خاندانوں کا تذکرہ بھی ہے۔ پارسل (۱۹-۱۷ مارچ ۱۹۷۰ء) انھوں نے دلی و نیویڈ میں حضرت نظام الدین اولیاء کی سیرت اور تعلیمات سے متعلق اردو میں نظام یکچکر دیے تھے۔ یہ مہنہ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔ ان پر بھی بعض حلقوں سے اعتراض کی آواز اٹھی تھی۔ لیکن جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، اس کے اعلان میں انھوں نے کسی کے ڈر سے کبھی تذبذب کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے میدان میں اس امتیاز کے باعث انھیں اندین ہسٹری کانگریس کی صدارت پیش کی گئی (۱۹۳۶-۱۹۳۷ء)۔

وہ بہت دن سے ضیاء الدین بلی کی مشہور تاریخ فیروز شاہی کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ عرصے سے صحت بھی خراب چلی آ رہی تھی اور کتاب ختم ہے؛ اس لیے ترجمے کا کام بہت آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ قدتنا انھیں تشویش تھی۔ اکثر کہہ کرتے تھے کہ میری دلی تمنا ہے کہ میں مرنے سے پہلے یہ ترجمہ مکمل کر لوں۔ خدا نے ان کی سُن لی۔ یہ ترجمہ ان کے انتقال سے تین چار دن قبل پورا ہوا۔

انہوں نے کسی راتے میں انگریزی میں افسانے بھی لکھے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ :

Desecrated Bones and Other Stories

کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔

غرض وہ اپنے کام کے لیے بھیجے۔ انہوں نے ساری عمر علم اور طاہل علم کی خدمت میں گزار دی۔ اپنے شاگردوں سے بجد محبت تھی اور وہ ان کی دلسے دلسے ہر طرح مدد کرتے ہوتے تھے۔ کئی طلبہ ان سے باقاعدہ و طیفہ پاستے تھے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے امتحان کے لیے جانچنے کی ساری آمدنی وہ ان کا رخصت میں صرف کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ جب کوئی طاہل علم ان سے ملنے کو جاتا، تو وہ اندر سے حبیب میں مد پیر اور ہاتھ میں کاغذ قلم لیے برآمد ہوتے کہ آئے دالایا تو مالی امداد کے لیے آیا ہو گا یا کسی جگہ کے لیے سفارش خط لینے کو۔ اس پر ایک طیفہ یاد آگیا :

چند سال ادھر کی بات ہے، مسلم یونیورسٹی میں کوئی جلسہ ہوا۔ جلسے کی صدارت اس زمانے کے وائس چانسلر جناب طیب جی فرما رہے تھے اور حبیب صاحب کو تقریر کرنا تھی جیسا کہ دستور ہے، صدر جلسہ مقرر کا تعارف کرانے کو کھڑے ہوئے۔ طیب جی علی گڑھ جانے سے پہلے ملک کی فادرں سروں کے متاثر کن تھے، اور ان کا باحث ہمارے وزارتِ خارجہ میں سکتر کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ بینک، حبیب صاحب کو اپنے طلبہ سے بہت محبت ہے، لیکن ہا اوقات وہ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا لحاظ نہیں کرتے۔ چنانچہ میرا تجربہ ہے کہ جب میں وزارتِ خارجہ میں تھا تو ایک ہی اسامی کے لیے متعدد نوجوان میرے پاس پہنچتے اور ہر ایک کے ہاتھ میں حبیب صاحب کا سفارش خط ہوتا۔ اس پر تھک کر بند ہوا۔ ان کے بیٹھ جانے کے بعد حبیب صاحب اٹھے۔ فرمایا : وائس چانسلر صاحب کی تقریر آپ نے سنی، اس پر مجھے ایک پرانی بات یاد آئی۔ جب میں یہاں نیا نیا آیا، تو ایک دن دفتر پہنچنے پر وائس چانسلر صاحب سر شاہ محمد سلیمان

کا ایک بخش مرسلہ موصول ہوا۔ لکھا تھا: دیکھا گیا ہے کہ یونیورسٹی کے طلبہ عام طور پر نثار باجماعت نہیں پڑھتے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ خود بخود مسجد میں آکر نماز پڑھیں تاکہ ان کی مثال سے طلبہ کو بھی باجماعت نماز ادا کرنے کی ترغیب ہو۔ میں اس زمانے میں نماز روزے کا بہت پابند تھا، اور اس میں شاذ و نادر ہی قصا ہوتا تھا۔ میر نے جب یہ بخش مرسلہ دیکھا، تو مجھے اس مداخلت بیجا پر بہت غصہ آیا۔ میں نے اس پر وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں لکھا کہ نماز کا معاملہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ہے، میں اسے جیسے چاہوں، پڑھوں۔ میں کسی شخص کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میرے اور میرے خدا کے درمیان حائل ہو۔ چنانچہ اس دن سے میں نے مسجد کی نماز ترک کر دی۔ کچھ اسی طرح کی بات آج موجودہ وائس چانسلر صاحب نے بھی ہے۔ میں ان سے صرف اتنا کہو مجھ کو میں کسی شخص کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ میرے اور میرے طلبہ کے درمیان حائل ہو۔ اس پر پہلے سے بلند تر فتح پڑا۔

جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے، تو انھیں ایمرٹس پروفیسر مقرر کیا گیا اور ڈی ایچ کی ایئرڈ ٹی وی گئی۔

اسی جذبے کے تحت انھوں نے ۱۹۴۲ء میں ماہنامہ شمع آگرہ سے شائع کو نام شروع کیا تھا۔ اس کا مقصد بھی اپنے ایک معزز و تحصیل دوست کی مدد کو تھا۔ یہ غالباً دہریہ تنک جباری رلم۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے، وہ اس کے مضامین کی بلندی اور طباعت کتابت کے اونچے معیار کی شہادت دینگے۔

وہ سیاست کے آدمی نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے بعض اوقات عملی سیاست میں حصہ لیا! ۱۹۶۶ء میں وہ یو پی کی مجلسِ واضح قوانین کے لیے سوجا پارٹی کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے ہوئے اور ملتان پور ضلع سے منتخب ہو گئے۔ وہ ۱۹۶۱ء تک اس پہلی کے رکن رہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں وہ اقوام متحدہ دیو این میں

ہندوستانی وفد کے ساتھ پیرس گئے تھے؛ وہ اس وفد کے دوسرے میڈر تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ہمارے پرنسکو وفد (پیرس) کے بھی رکن تھے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک غیر ملکی وفد چسپن گیا تھا۔ پنڈت سندھ لال اس کے میڈر تھے۔ پروفیسر حبیب اس وفد میں شامل تھے۔ پروفیسر حبیب بھی اس وفد کے رکن تھے۔ حبیب صاحب نے دہلی پر اس سفر سے متعلق ایک کتاب بھی انگریزی میں لکھی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں حبیب صاحب، روانہ کی حکومت کی دعوت پر بوڈاپسٹ بھی گئے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جب ہندوستان کے صدر راجنابھدر کا انتخاب ہوا، تو بعض دوستوں کے اصرار پر حبیب صاحب نے نائب صدر کے عہدے کے لیے اپنا نام دے دیا تھا، لیکن یہ اسی وقت بحب انھیں اطمینان دلا یا گیا کہ ان کے منتخب ہو جانے کا کوئی احتمال نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں علی گڑھ کا قیام کس صورت میں ترک کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ جب وہ واپس آ گئے، تو بہت خوش تھے اور اطمینان کا سانس لے کر فرمایا کہ شکر ہے، 'رہیدہ بود بلک'، 'ولے بھر گشت'۔

طبیعت سچد مرہاں مریخ پائی تھی۔ ان کی سادگی اور مینیس کے عیشوارہ واقعات زبانزد ہیں۔ خدا کے اس نیک بندے کا ۲۲ جون ۱۹۷۱ء شام کے آٹھ بجے علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ اگلے دن جنازہ اٹھا اور یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ انشاء اللہ اللہ اللہ اپنے پیچھے جہانی یادگار دو بیٹے چھوڑے؛ بڑے کمال حبیب، یہ پاکستان میں ہیں، چھوٹے عرفان حبیب صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں پروفیسر ہیں۔

## تسکین قریشی، محمد بن

ان کا خاندان دراصل سہوان کا رہنے والا تھا۔ سوردن (ضلع ایٹک) کے مغلوں اور سہوان کے قریشیوں میں آپس میں رشتے داریاں ہوتی تھیں۔ چنانچہ تسکین صاحب کی سگڑواہی سوردن کی تھیں۔ ان کے دو لڑکے تھے، بڑے رفعت اشتر اور ایک ان سے چھوٹے۔ والدہ ان دونوں کو ساتھ لے کر اپنے میکے سوردن آ گئیں۔ یہی رفعت اشتر جناب تسکین کے پردادا تھے۔ یہاں منجھلا اور راہنی کے گوجر پوران کی جاگیر میں تھا۔ ادویہ زمیندارہی کے خاتمے تک خاندان کے قبضے میں رہا۔ رفعت اشتر سہوان جاتے آتے رہتے تھے۔ سوردن کی مستقل سکونت تسکین کے دادا گل حسین صاحب کے زمانے سے شروع ہوئی۔ زمیندارہی، کاشتکاری ان کا ذریعہ معاش تھی۔

تسکین کے والد سخاوت حسین صاحب نے پولیس میں ملازمت اختیار کر لی تھا۔ سید سے منشن پائی۔ ان کا ۵۰ سال کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا۔ سوردن ہی میں دفن ہے۔

تسکین صاحب جنوری ۱۹۰۹ء میں سوردن میں پیدا ہوئے۔ اگر گورنمنٹ

اسکول سے ۱۹۱۰ء میں دسویں درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے سینٹ انڈیو کالج، گودکچور میں داخلہ لیا۔ ان کے بڑے بھائی عبدالواسع اس زمانے میں گودکچور میں اہلہ ٹکسٹری تھے، انھیں کے ساتھ قیام رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ گودکچور میں تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ ہو اسی اس لیے تھا کہ بڑے بھائی وہاں مقیم تھے۔

۱۹۲۱ء میں پولیس کے محکمے سے ملازمت مل گئی اور ترقی کرتے کرتے اوٹا پولیس ٹریننگ کالج میں پروفیسر ہوئے، اور آخر کار لکھنؤ میں سی آئی ڈی پولک پراسیکیوٹر۔ یہیں سے ۱۹۵۲ء میں پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے جس دیا سنداری اور احساس فرض اور خدمتداری سے ملازمت کا زمانہ بسر کیا، اس پر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ نیل کے مشکے سے بے داغ نکل آنا آسان، لیکن پولیس کی ملازمت سے نمونہ نکالنا غیر ممکن، لیکن انھوں نے یہ کر دکھایا۔ خدا جیسے رفیق دے! ملازمت کا زیادہ زمانہ سہارنپور میں بسر ہوا، یہاں چودہ برس (۱۹۳۰ء-۱۹۴۳ء) قیام رہا۔ پنشن کے بعد مستقل قیام میرٹھ میں اختیار کیا۔

یہیں میرٹھ میں ۱۹۵۵ء میں میری ان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ میں اس زمانے میں تلامذہ غالب کی کیمبل کی فکر میں سرگرداں تھا۔ اس سلسلے میں میرٹھ بھی پہنچا۔ یہاں غالب کے دو شاگرد تھے: اسٹیل میرٹھی اور رنج میرٹھی۔ اسٹیل میرٹھی کے صاحبزادے جناب اسلم سیفی مدظلہ سے ملاقات ہوئی۔ ان سے دیر تک گفتگو رہی۔ جب میں نے ہر شام اجازت چاہی تو پوچھا: اب کہاں جا بیٹے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے حکیم فیض الدین رنج کے حالات کی تلاش ہے، اب انھیں کے ہاں جانے کا ارادہ ہے۔

فرمایا: میں ان کے پر پوتے حکیم سیف الدین احمد کو یہیں بلواتا ہوں، قریب ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ٹیلیفون کیا اور حکیم سیف سدا پہنچ گئے۔ اسلم سیفی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا، اور چند منٹ بعد ہم اٹھ کر سیف صاحب کے مکان (داور طلب) پر آگئے۔

تسکین صاحبہ ہیں پڑوس کے مکان میں رہتے تھے، بلکہ ان کا مکان اسی محلے میں تھا، جس میں سیف صاحب کا مطب ہے۔ سیف نے انھیں بلوایا۔ ادھر دھڑک باتیں ہوتی رہیں۔ تسکین صاحبہ بہت مہین اور بخیرہ مزاج آدمی تھے، بہت آہستہ آہستہ اور ایک ایک لفظ صاف صاف کہ کلمات کو نہ دالے۔ یہ غالباً ان کی مدد العمر کی پولیس کے محکمے کی ملازمت کا نتیجہ تھا۔ آخر میں انھوں نے میری درخواست پر بہت کچھ محنت کے بعد اپنی دو غریب لیس منائیں۔ میں کلام کی بلندی پر دنگ رہ گیا۔ تسکین صاحبہ کو شعر و سخن سے دلچسپی بچپن کی بیت بازی سے شروع ہوئی۔ یوں سینکڑوں ہزاروں شعراء ہو گئے۔ کبھی کبھی بیت بازی کے دوران میں نا طعہ بند ہونے لگتا، تو یہ اپنی طرف سے تنگ ملا کے کچھ سنا دیتے۔ رفتہ رفتہ خود بھی شعر کہنے لگے۔ آغاز میں کلام اپنے بھوکھی زاد بھائی مولوی محمد محفوظ کو دکھایا۔ محفوظ زیادہ تر نعت کہتے تھے۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ دیوان محفوظ کے عنوان سے موجود ہے۔ پھر ۱۹۱۶ء

۱۹۱۷ء کے دو سال انھوں نے مولوی سید حسن مرتضیٰ شفیق عماد پوری (مت ۱۹۳۳ء) سے اصلاح لی۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں مرزا محمد اوی عزیزی لکھنؤ کے شاگرد ہو گئے اور یہ سلسلہ عریض کی وفات ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔

تسکین کا کلام بہت بلند اور پایدار ہے۔ سارا کلام انتخاب معلوم ہوتا ہے، اس میں بھرتی کا شعر شاذ و نادر ہی ٹھیکہ لگا۔ ۱۹۲۶ء میں حج کیا تھا۔ اس کے بعد کلام میں اور زیادہ بروہگ اور بخیرہ آگئی؛ نعت سے بھی شغف ہو گیا تھا۔ غزل ایسی بھی کہتے ہیں کہ کسی میاں پر اسے جانچے، آپ داد دینے پر مجبور ہو جائینگے۔ چونکہ وہ شاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے اور پراگندہ کافن نہیں جانتے تھے، اس لیے ان کی کئی طرح شہرت نہیں ہوئی۔ صرف زبان کی ان کے ہاں چند اہمیت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ لکھنؤ، دنگ پند نہیں تھا وہ شہرہ آبرو میں کام کے والدہ تھے اور تو

اور اپنے استاد کو۔ یہ کی نوع خوانی بھی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ اس لیے فانی بھی ان کے پسندیدہ شعرا میں نہیں تھے۔ اصغر سے متعلق انھیں شکایت تھی کہ ان کے کلام میں دو کوش نہیں؛ ثقیل ہے اور اس میں ردائی ناپید ہے۔ اسی سے اندازہ کیجیے کہ ان کے اپنے کلام میں کیا ہنگام۔ وہ اپنی غزل سے متعلق کہتے ہیں:

خون دل رنگ تغزل میں کیا ہے شامل

سٹ گیا ہوں تو یہ انداز بیاں آیلے

جگر اور حسرت ان کے محبوب شاعر تھے۔ جگر سے ان کے ذاتی تعلقات بھی اتنے قریب کے تھے کہ مثالی کہے جاسکتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے عاشق تھے۔ جگر کا دوسرا محبوب کلام آتش گل۔ تسکین مرحوم ہی نے مرتب کیا تھا۔ وفات سے کوئی پانچ مہینے پہلے جگر نے ۲۶ مارچ ۱۹۶۰ء کو اپنے کلام کی طباعت و اشاعت اور اس کی آمدنی کی تفصیر سے متعلق ایک وقف، جگر ٹرسٹ کے نام سے قائم کیا تھا۔ انھوں نے اس کا دوا صد متولی تسکین صاحب ہی کو مقرر کیا؛ اور انھیں اجازت دی تھی کہ اپنے عہد جسے چاہیں متولی مقرر کر دیں۔ تسکین نے اپنی وفات سے پہلے غالباً کسی کو جانشین نامزد نہیں کیا۔ وہ بھر پر بہت مہربان تھے۔ میں جب باہر چلا گیا، تو خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے جگر مرحوم کی زندگی میں ان سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا، جو تقو شش دلا ہوا، میں چھپ چکا ہے۔ اس کی فرمائش بھی تسکین صاحب نے کی تھی۔ ہوا یہ کہ شمس الہدیٰ تمیس صاحب نے جو گوئڈہ میں مقیم تھے، جگر کی سوا انھوں نے لکھنے کی داغ بیل ڈال دی۔ انھوں نے جگر سے پوچھا کہ آپ کے حالات کے لیے کمن احباب سے رجوع کروں۔ منجھلا اور احباب کے جگر نے میرا نام بھی بتایا۔ میں اس زمانے میں قاہرہ میں مقیم تھا۔ تسکین نے مجھ سے مضمون لکھوانے کا فرض اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ میں نے تعیل اور شاد میں یہ مضمون لکھا تھا۔ جب میں برسزدہ لہجہ میں تھا، تو انھوں نے 'مناخ تسکین' کا پورا کلام خود



نکھ کر مجھے تحفہ بھیجا تھا۔ یہ مجھ کو اس کے بہت بعد شائع ہوا۔

ابھی دو ڈھائی چھینے ہوئے، میں میرٹھ گیا۔ سیف صاحب کے ہاں پہنچا۔ انھوں نے حسب معمول ملازم سے کہا کہ تسکین صاحب کو اطلاع کر دو کہ مالک واپس آئے ہیں۔ جب تک وہ آئیں، سیف صاحب نے بتایا کہ مجھے اندیشہ ہے، انھیں گلے کا کینسر ہو گیا ہوگا۔ لیکن یہ میری سنتے نہیں؛ کیا کہا جائے! اتنے میں تشریف لے آئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آواز صاف نہیں ہے، آٹھ بجیں درمیان میں لفظ سناٹی نہیں دیتا، کمرور بھی بہت جو رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ فریاضے؛ طبیعت کیسی ہے؟ جواب دیا کہ خلق پر نزلہ گور رہا ہے، اسی نے پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے یا اسپتال میں اپنا مشکل معائنہ کیوں نہ کروا لیجیے؟ اس پر انھیں شبہ ہوا۔ چمک کے کہنے لگے، نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ نزلے کا ایک جڑب تھنڈے میرے پاس ہے، وہی استعمال کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اس پر مجھے جو آت نہ ہوئی کہ کچھ اور کہتا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہی مشورہ حکیم سیف صاحب مجھ سے پہلے دے چکے تھے۔ اسی لیے انھیں شبہ ہوا کہ میں نے یہ انھیں کے کہنے پر کہا ہے۔

آخوند ہی پیش آیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اطلاع ملی کہ جمعرات ۱۴ جون ۱۹۷۱ء صبح کے ۶ بجے آگے میں انتقال ہو گیا۔ جب حالت بگڑنے لگی، تو انھیں علاج کے لیے سر ڈی جی ناسیڈ اسپتال، آگرہ میں داخل کیا گیا تھا۔ یہاں بہت تکلیف میں وقت گزرا۔ جب حالت یابوسی کی ہو گئی، تو اسپتال سے اٹھ کر اپنے چھوٹے بھائی فضل الرحمہ صاحب افضل محلہ تاج گنج کے مکان پر آ گئے۔ وہیں وقت سو عودا یا بیٹی بھی آگئے کہ نصیب ہوئی۔ تاج محل کے قریب ہی 'شرق کی طرف' شاہی زمانے کی بنی ہوئی، سید احمد بخاری کی درگاہ ہے۔ اسی میں دفن ہوئے۔ انا شروانا المیرہ

راجون

ہر باب دوست ڈاکٹر نور احمد نوری نے ایک کے قیسے عیسوی تاریخ لکھی ہے:  
ایک ملا یہ مصرع غم غلہ کمال میں تسکین ترشی

(1940 = 1941)

T

۱۹۱۸ء میں اپنے خاندان ہی میں شادی ہوئی تھی۔ لا ولد فوت ہوئے۔

ان کا کلام چار مرتبہ چھپا:

سرایہ تسکین (اول): (بلند شہر ۱۹۳۶ء)

سرایہ تسکین (دوم): (سہارنپور ۱۹۳۷ء)

گلگونہ تسکین: (لکھنؤ ۱۹۵۲ء)

مناج تسکین: (لکھنؤ ۱۹۶۲ء)

انہوں نے مکاتیب جگر (دول ۱۹۶۲ء) کے عنوان سے جگر کے وہ تمام خطوط بھی شائع کیے تھے جو ان کے پاس محفوظ رکھے تھے۔ اس میں جگر کے خطوط ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں انہوں نے مولانا اسعد صاحب (ناظم مظاہر علوم، سہارنپور) کے ۲۸ خط صحافت اسعد کے نام سے اور اپنے استاد عزیز لکھنوی کے ۱۶ مکتوبات عزیز کے عنوان سے نظمیں کر دیے ہیں۔

ان کے پاس جگر کے خطوط کے علاوہ ان کی کچھ بیاضیں وغیرہ بھی تھیں۔ وہ پاتے سے کہ یہ سارا ذخیرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ کر دیا جائے، تاکہ آئندہ جگر پر تحقیقی کام کرنے والے طلبہ اس سے استفادہ کر سکیں۔ کس وجہ سے مسلم یونیورسٹی میں یہ انتظام نہ ہو سکا۔ اس پر انہوں نے یہ تمام چیزیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے حوالے کر دیں۔ یہاں یہ اشیاء گوشہ جگر کے نام سے مرکزی کتاب خانے میں رکھی گئی ہیں۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت ۱

اب کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو جو ان کے مجموعے 'مناج تسکین' سے لیا گیا ہے:

عشق میں عشق کا حاصل نہیں دکھایا جاتا      نہ درد یا بھی سائل نہیں دکھایا جاتا  
 بے طلب بھی بھی مل جاتی ہو منزل، تسکین!      ہر کہیں جادہ منزل نہیں دکھایا جاتا  
 کفر و دیں سب کی سیر کو آیا      کچھ نہ دل کے سوا نظر آیا  
 دل ہے بے آرزو نظر بے ذوق      تجھ کو جیسا نہ عمر بھر آیا  
 جب کہیں تذکرہ حسن و لا رام آیا      کوئی محفل ہو، ہر اک لب پہ ترانہ آیا  
 تو پہ کے بعد ہی ساقی کا یہ پیغام آیا      میکدے سے جو گیا، پھر نہ کہیں کام آیا  
 عشق سے پہلے نہ کچھ تھے خوشی ہوتی ہے کیا      کیوں چلتے ہیں تائے چاندنی ہوتی ہو کیا  
 کوئی خاموش ہے، کوئی نال طلب      اپنا اپنا جنوں، اپنی اپنی طلب  
 ہا ہر جراتِ شوق و جوش طلب      ہے مقام محبت، مقام ادب  
 جن کو جنوں نے کو دیا، عشق میں خاناں خواب

ذمیت بھی ان کی کامیاب، سوت بھی ان کی کامیاب  
 تری نظر میں کائنات، میری نظر میں صرف تو

تیرا بھی حسن، بیتظیر، میرا بھی عشق لا جواب  
 کہنے کو تو کہ آئے غم دل، گمراہ تک      وہ غم نظر یاد ہے، وہ چین جبین یاد  
 مہیا، ہر سرستی دساقی، ہر آغوش!      کا فر ہے جسے آئیں جواب بھی دل و دیں یاد  
 اب کرم کی بھی دل کو تاب نہیں      کیجیے کس امید پر فسر یاد  
 اے، اس دل کی سرسریں تسکین!      جو محبت میں ہو گیا برباد  
 جبر میں اختیار ہے تو، مگر      جیسے کوئی نفس میں ہو آ زاد  
 دل کی دنیا عجیب دنیا ہے      جتنی برباد، اتنی ہی آباد  
 جگدہ، جگدہ سہی تسکین!      آگے اب تو، ہر جہ برباد آباد  
 ترا خیال بجا ہے تیرے حسن سے معمور      تمام شوخی دستی، تمام نکبت و نور

جنوں، کہاں یقین، انتہا ہے سوز و غم  
حیات راہِ محبت میں ساتھ دے دنگ  
جنوں نہ ہو تو محبت دل و نظر کا فتور  
سفرِ تمام ہوا، ادا بھی ہے منزل دور  
تری نگاہ کی رسوائیاں نہیں منظور  
تیری طلب کے سب ہیں مراحل  
تم دے گئے ہو، تنہائی، دل  
غمِ دل اور اتنا راحت انجام  
محبت بھی ہے، رسوائی کا ڈر بھی  
یقین، ذوقِ جنوں کی شرط اول  
ہر آرزو کا احساس ہے غم  
کچھ چشمِ تر ہی کام آئی، ورنہ  
تنگ طلب ہیں دونوں ہی، تسکین!

تسکین! یہ کسے دست ہے، راہِ حرم نہیں

کچھ ہوش ہے، کہاں سے کہاں آگئے ہو تم!  
زندگی مرگِ ناتمام ہے آج  
نہ تھا، نہ جسو، نہ جنوں  
تری منظرِ جلوہ گاہیں بہت ہیں  
جہیں تیرے درپہلگی تھی نہ جب تک  
دجرِ ستم، کچھ ہوا تو مستائیں!  
دردِ محبت دل میں چھپایا  
دنگِ زمانہ دیکھنے والے  
کونے بگڑا ہے، تسکین! میرے ایساں کوثرِ غم  
اگر ہونہ آہوں سے آباد سینہ

دہی عظمتِ زندگی سے ہیں واقف کہ طوفاں سے محظور ہے جن کا سفینہ  
ہزاروں جام و ساغر ٹوٹتے ہیں بہت دشوار ہے یہ خاند سادی  
صد اوقت کیا، جو ہو محدود و پناہاں جنوں کیا، جب نہ ہو بنگار سادی  
ہزاروں بار جب ڈٹی ہے توبہ تو آیا ہے شعورِ پاکبازی  
محبت، حسن بن جاتی ہے، نکلیں محبت میں اگر ہو بے نیازی  
ان کی نخل میں، جہاں ہم بھی گئے نہ گئے آج کیا کیا ہمیں الزام لگاتے دگئے!  
انجم و ہر و ماہ سے پہلے جلوہ تھا، جلوہ گاہ سے پہلے  
کھیل کچھ نہ کوئی شغلِ نغاں دمِ اٹھا ہے، آہ سے پہلے  
تخاف کے تو پہلو اور بھی تھے ستر ہی کس لیے کم ہو گیا ہے!  
نہ دن دیکھے، نہ صبح دیشام دیکھے تجھے کیا چشمِ پرِ نم ہو گیا ہے؟  
اسیری سے فطرت بدلی نہیں چھٹے، اور نشین بنانے لگے  
سکوں اگر ہی ہے وہ عشق میں قدم جب رکے، ڈگڈگانے لگے  
کس قدر ہم سے نا آشنا ہو گئے! تم محبت کے ہوتے ہی کیا ہو گئے!  
دل بب آسودہ امید کوم ہوتا ہے غم کا احساس اگر ہو بھی تو کم ہوتا ہے  
ہم نے دیکھا ہر حسینوں کو بھی مردم سکوں ہم کبھے ہیں، محبت میں جو غم ہوتا ہے  
وہ عام نہیں، سنگد و باب جنوں نکال کے چلتے ہیں بعد نظر نقش قدم ہوتا ہے  
حادثے ہوتے ہی، اہتے ہیں جہاں میں سکیں دل کے جانے کا گم اور ہی غم ہوتا ہے  
زندگی اپنی حقیقت کتنی اب تک محروم تم بے ہو، تو یقیناً دل و جان آیا ہے  
ننگہ سادہ، اسے معاذ اللہ! ننگہ، التفات کیا ہوگی!  
کمالِ محبت، جمالِ آفریں ہے اگر دل میں ہو، تو دنیا حاصل ہے  
وہ اک بجد ہے جہیں، اللہ! اللہ! کوئی آستیں جس کے قابل نہیں ہے

بایں نامرادی بایں بدگمانی  
مبت سراپا، یقین ہی یقین ہے  
آلِ خلق پہ ہم صبر کو تو سکتے تھے  
مگر یہ دل، جو ابھی تک تم سے خیال میں ہو  
یہی ہو کفر، تو ایمان کس کو کہتے ہیں  
کو سر ہے جدے میں اور دل تم سے خیال میں ہو  
حضور حسن، اک افادہ بن گیا اس کا  
کہیں تھی بات جو آغازِ گفتگو کے لیے  
ہزار و ہزار اچھے ہیں، ایسے دہریے  
جو راہ چھوڑ دے، منزل کی جستجو کے لیے  
نگھوں سے کھیلنے والے، ایشیائے کانٹوں کو  
جہانِ سخن کی ہر شے ہے آرزو کے لیے  
یہ فیصلہ آخر ادب اب یقین ہے  
جو کچھ ہے محبت ہے، نہ دنیا ہو نہ دیں ہو  
ملتی نہیں بے جان دے منزلِ جاناں  
مشکل تو ہے یہ راہ، مگر دور نہیں ہے

تیس تھی جس میں اک مدت سے آج وہ بھالا پھوٹ گیا  
ڈٹ تھیں جب سادی امیدیں، آخر دل بھی ڈٹ گیا  
تیرے لیے ملنے تھے سبک، اب یہ عشق ڈٹ گیا  
ایک تراکیا دامن چھوٹا، سارا زمانہ چھوٹ گیا  
دک، محبت کی بھی کوشش، اس نہ آئی، اسے تسکین !  
پھانس بھی دل کی دل سے نہ نکلی، دل کا دل بھی ڈٹ گیا  
تسکیں کا مرنا جینا کیا، افسوس ہے اتنا ابلتہ

عمر جس کو رہا دنیا بھر کا، دنیا کو اکی غم نہ ہوا  
نہرا بتاؤ، کبھی تم کو یہ خیال ہوا  
نگاہ کس پہ پڑی، کون پایا ال ہوا  
طرح طرح سے بھلایا، مگر یہ حال ہوا  
کہ ہر خیال سے، پیدا ترا خیال ہوا  
ہزاروں ادھ لگی آئے تھے بے بلائے ہوئے  
بھی سے کیوں یہ بھری بزم میں ال ہوا  
کفر وایاں، جادۂ الفت کی ہیں ریزنریں

ایک ہے کبے سے پہلے، ایک بتانے کے بعد

احساسِ نامرادیِ الفت نہ پوچھے  
کیا دل کے ٹوٹنے میں ہو لذت نہ پوچھے  
کچھ اور پوچھے یہ حقیقت نہ پوچھے  
کیوں آپکے ہو مجھ کو محبت نہ پوچھے  
سجدوں سے طے مقامِ محبت نہ ہو سکا  
کیا کیا ہوئی ہے سر کو عداوت نہ پوچھے  
جب یادِ یار سے بھی نہ تسکین ہو سکے  
ہوتی ہے کیا وہ کاہشِ زلفت نہ پوچھے  
تعلیٰ وارِ ابتداءِ محبت بس اک نگاہ  
ایسی نگاہ جس کی حقیقت نہ پوچھے  
پیشِ نظر ہو جب وہ جمالِ نظرِ فرد  
بھرا اضطرابِ شوق کی حالت نہ پوچھے  
کچھ کو دل میں کچھ بھی نہیں جز خیالِ یار  
لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھے  
وہ نوں ہی بھول جانے کے قابل ہیں عشق میں  
افسائے مجاز و حقیقت نہ پوچھے  
کبھی میں، بتکدرے میں، سویمِ جہاں میں  
دل کی کہاں کہاں ہو ضرورت نہ پوچھے  
تسکین! یہ جانِ دل تو ہیں بھی تسکینِ عزیز  
اب زندگی ہے کس کی بدولت نہ پوچھے  
مذہبِ حرم سے دل نہ دکھاؤ، پاسِ محبت ہنسنے دو  
کون کنگا تم کو ظالم! ادا کئے تو کھنڈے دو  
کوئی کنارہ کوئی سہارا کیا جانے کب مل جا  
یہ طوقاں کی ماری کشی، سبھی ہو جکببہ ہنسنے دو  
حرفِ دلکاشت، شکرِ شکایتِ دل میں یے ہیں ہم کیا  
اپنے کرم کا ذکر کہاں تک! کچھ تو ہیں ہی کھنڈے دو  
ٹپٹے شستے داغِ شینکے، دوہرے ہوس کھائے تسکین  
بٹنٹے بٹنٹے دل بٹنا ہو، خوب اسے ہم بٹنٹے دو

کس سے پوچھیں، ہم نے کہاں، وہ چہرہ روشن دیکھا ہے  
مغلِ مغل ڈھونڈ چکے ہیں، گلشنِ گلشن دیکھا ہے  
ہم کو دیکھو، منزلِ منزل لٹ کے ہوئے ہیں خاکِ نشین  
ہم سے پوچھو کیا کیا ہم نے، ہزن دیکھا ہے  
کس کو دیکھیں، کس کو نہ دیکھیں، بچوں بھی ہیں، کلیاں بھی، مگر  
جس سے نکلتی آنکھ، اسی کو، دل کا دشمن دیکھا ہے

## شاغل قادری، سید محمد شاغل قادری

ایک مذہبی اور سخی گھرانے کے فرد، ۲ جنوری ۱۹۲۲ء کو بمبئیہ (ضلع گیا، بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ فتح انجیل، مصوفی منش اور اہل بول میں سے تھے۔ چونکہ وہ بیشتر عبادت میں مشغول اور عورت گزریں رہتے تھے، اس لیے شاغل کی تعلیم و تربیت اپنے بڑے بھائی ذاکر قادری کی نگرانی میں ہوئی۔

ان کے چچا اسد اللہ قادری نے انھیں بچپن ہی میں مختلف شعرا کے بہت شعرا دکرا دیے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ابھی اسکول کی مثال طے نہیں ہوئی تھی کہ شعر گوئی کا چمکا لگ گیا۔ شروع میں مخلص صادق کیا۔ طبیعت چونچالی تھی، اس لیے بنیدہ کلام کے ساتھ مزاحیہ رنگ میں بھی کہنے لگے، ایسے کلام میں مخلص کا ذہن دکھایا۔ جب بھڑا راج ہائی اسکول میں پہنچے، تو اب مخلص بدل کر پہلے دانش اور پھر شاہزادہ رکھ دیا۔ ملازمت کے ابتدائی دو روز یعنی کرڈوئی انجینئرنگ، کس کے قیام کے زمانے تک، چندے شرر، مخلص سے بھی لکھتے رہے۔ لیکن باب انجمن ۱۹۴۷ء میں مستقل ملود پور لیوے کی ملازمت مل گئی اور بھاگلپور اسٹیشن پر تعیناتی ہوئی، تو اس کے بعد سے اپنے نام کے دو اجزاء شاغل اور



قادی کی پراکتفا کی بہان میں بھی ترجیح قادی کو رہی۔ مزاحیہ کلام میں البتہ آج تک پہلا  
تخلص کا وہ ہی چلا کر رہا تھا۔ اب اس کی جگہ تلخ زمانی نے لے لی۔

۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک بھیا گلپور میں رہے۔ اس کے بعد تدارک موہا اور صاحب گنج  
پہنچے۔ یہاں ۱۹۶۱ء تک رہے اور اسی سال ہاٹ پور میں ریلوے اسٹیشن ماسٹر کے عہدے پر  
فائز ہوئے۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی رہے، رفا و عام کے کام، شعر و سخن کی خدمت، اور  
مشاعرے منعقد کرنے سے انہیں فرصت نہیں ملتی تھی۔ شروع میں پروفیسر اختر صدر  
شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی سے اصلاح لی جب دوران ملازمت میں صاحب گنج پہنچے،  
تو حضرت سرور شریف عظیم آبادی سے مشورہ کر لے گئے۔ انھوں نے آہنا مجموعہء کلام متاع سو  
کے عنوان سے قیام بھیا گلپور کے زمانے ہی میں مرتب کر لیا تھا، اگرچہ اس کی اشاعت  
بہت بعد کو ہوئی (۱۹۶۵ء)۔ انھیں غزل اور نظم، بلکہ ہر ایک صنف سخن پر،  
کیاں قدرت حاصل تھی نہ سبب اور ریاست ان کے دلپند موضوع تھے۔ ان کے  
مجموعہء کلام میں غزل، نظم، قطعہ، نعت، سلام، ہجو سب ہی کچھ ہے۔ آخریں تلخیصات  
کے عنوان سے طنزیہ اور مزاحیہ کلام بھی ہے تاریخ گوئی میں بھی خاصی ہمارت تھی؛  
چنانچہ اس مجموعے میں چند قطعات ہمارے تاریخ بھی شامل ہیں۔

یہ مجموعہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے نام بدیں الفاظ معنون کیا ہے:

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے نام، جن کی نشر نے میرے فکر و فن کو

جلاد دی۔

اس سے ان کی افتاد طبع کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں؛ اپنے نزدیکوں کی طرح انھیں بھی ملکی  
سیاست سے گہری دلچسپی تھی؛ چنانچہ جمعیتہ العلما، ہند سے باضابطہ وابستہ تھے۔ وہ جمعیتہ  
کے جملہ کارہ سے بہت متاثر ہوئے۔ نظم کے علاوہ نشر بھی لکھتے تھے۔ ان کے شری مضامین  
مختلف رسالوں میں منتشر رہے ہیں اور آج تک مدائن نہیں ہوئے۔ ان سے یقیناً ایک اچھی

## تذکرہ معاصرین

ضیغیم طلبتیا رہ جائے۔

شب جمعہ ۱۲ جولائی ۱۹۱۹ء کو سٹیشن پنجوارہ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ ان کی بیگم دائمہ امراض تھیں۔ اپنی اولاد نہیں تھی۔ ایک بچے کو گودے لیا تھا، وہی ان کا حادثہ ہو گا۔

چند شعروں کے مجموعہ "کلام و متاع شوق" سے ماخوذ درج ذیل ہیں:

دھندلا دھندلا سا دل کا عالم ہے	آرزو کا چہرہ رخ مدھم ہے
ہر طرف ہے بلا کی تاریکی	دور منزل ہے، راہ پر خم ہے
مئے منوں کی ہے سیاحتی	جو دوا درود کی ہے، اسم ہے
موت ماحول پر ہوئی طاری	سرنگوں زندگی کا پرچم ہے
چشم حق میں نہیں، مگر بورس	روشنی گر نہیں، تو کیا غم ہے
دل میں شمع یقین تو ہے روشن	ہوا اگر تیرگی کا عالم ہے
لکے لکے نسیم کے جھونکے	کہہ رہے ہیں کہ مات اب کم ہے
پھر چمن میں بہار آئیگی	کھلنے والا سحر کا پرچم ہے

## دورِ فتن

ننگن فضا میں ہیں بہاروں پر چمن ہے	شاداب گل دلا لہو لہرین و سمن ہے
برشاخ گل تر پہ عناوُل میں غز، خوان	گلگشت میں بھڑک کوئی غنچہ دہن ہے
خوشامیں ارباب چمن خوب ہے، لیکن	شاعر کی نظر میں یہ نقطہ خواب بہن ہے
دیکھا تھا خنواں میں جو بہاؤں کا کبھی خواب	چھپا یا جواہر منوں پس خواب کا ظن ہے
مرحمانے ہوئے پھول کو شاداب دکھے	ردا ہو جو بیل، تو نہ کہیے کہ مگن ہے
کہا کہ بہیل کے دستِ احقیق گزرا	خطرے میں نہیں ہے، مصیبت میں چمن ہے
بیل کے لیے چمن کی صورت نہیں اب بھی	صیاد سے لٹا ہوا مال کا چپلن ہے

جس دل میں محبت نہیں ہر اہل وطن کی	وہ دل نہیں اے دوست! تارو کھن ہے
ہم جو رستم پر تو خاموش رہ گئے	مانا کہ کھن مرحلہ دار و رسن ہے
ہر غنچہ خواجہ کو بیدار کر گئے	ہشیار ہو، قادر کی یہ قدر قن ہے
ان کی پریشی پر جو کچھ تبسم مجھ کو	راز داں کو مرے انداز پر رونا آیا
ہے وہ تیر نیش، شاغل!	زخم تازہ ہے آج تک دل کا
شب براق گزار ہی عجب قصور میں	کہ جسے پاس مرے آپ آئے ملتے ہیں
جن میں مہنے کی سیر و اجسارت آئی	ان کے قدموں میں دانے کی سیادت آئی
رنگ لایا ہے مراغوں و فاکلشن میں	گل تو گل خار میں بھی جوئے محبت آئی
ہو اے سودو زیاں کی فکر کیوں	جس نے تیرے عشق کا سودا کیا
وہائی حیات کا باعث کبھی نہیں	وہ درد عشق جس کی خلش دائمی نہیں
طاہ و فایں کوئی دیتا ہے ساتھ کس کا!	غم کیوں مٹائیں ناحق ہم اپنی بکس پر
دل میں قصہ ریتاں لب پر سلام دوڑو	وہیت مجموعہ و اخلاص دہن جاتی ہے
ہم تو عشق کے بندے تھہرے	کوئی ناحق کیوں دشمن ہے
عشق کی منزل سہل نہیں ہے	ہر اک گام پر دار و رسن ہے

ہر دل میں غم و درد ہے بیتابی ہے  
 غنچا چمن ریت میں شادابی ہے  
 ساقی کو بھی ہے تشنہ لبی کا رونا  
 صباے مشرت کی وہ نایابی ہے

تھا عہد جزاں میں جو چلن اب تک ہو  
 بلبل کے لیے دورِ حمن ما اب تک ہو  
 کہنے کو تو آیا ہے گلوں کا موسم  
 صیدِ غم و آلام چن اب تک ہے

وقت کے خرابات میں پئے والو!  
اکرام پر اغیار کے جھٹنے والو!  
غلاب دمخدا دیں مہرجاؤں نہیں!  
ہشیار، خبردار، سیٹھے والو!

مسرور محل دلالہ کھلا دیتے ہیں  
- تاریک فضاؤں کو ضیاء دیتے ہیں  
یہ آخر شب اشکِ بزمِ امت کے گہر  
آئینہٴ خاطر کو چلا دیتے ہیں

## خیر بہروی، الباخیر

اس صدی کے آغاز (غالبا ۱۹۰۱ء) میں ضلع بیاڑی کے ایک گاؤں بہورہ میں پیدا ہوئے پرانے طرز کی فارسی، عربی کی تعلیم پائی تھی، اور اردو سے محبت تھی۔ اسی لیے روم مولوی عبدالحی نے جب انجمن ترقی اردو کا دفتر ۱۹۳۶ء میں اورنگ آباد سے دلی منتقل کیا، تو انھیں صدر دفتر میں بلا لیا۔ وہ تقسیم ملک تک انجمن کے غائبہ خصوصی کی حیثیت سے ملک بھر کا دورہ کرتے اور اس کی تنظیم کا کام کرتے رہے، کچھ زمانہ غالب نامیہ محمد بھی رہے جب تقسیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں انجمن کا دفتر ازبکستان علی گڑھ میں قائم ہوا اور قاضی عبدالغفار (دفتر جنوری ۱۹۵۶ء) اس کے سکریٹری مقرر ہوئے، تو خیر صاحب ان کے دستِ راست ثابت ہوئے، انھوں نے انجمن کے ازبکستان قیام و استحکام میں ان کی بہت مدد کی۔ قاضی عبدالغفار کی رحلت کے بعد نئے ماحول میں وہ زیادہ دن نہیں رہا، چنانچہ ۱۹۵۷ء میں متعفی ہو گئے۔

انھوں نے کسی زمانے میں غالب انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور اسی سلسلے میں غالب کی تصویریں ایک جلد میں، مرقع غالب کے عنوان سے شائع کی گئیں

(لکھنؤ ۱۹۵۷ء)۔ اس کے بیٹے غالب پوری حکومت نے کچھ مالی امداد کی تھی۔ اس کتاب کا ہندی آڈیشن بھی شائع ہوا تھا۔ لیکن چونکہ پورا منصوبہ ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے رتن غالب کے بعد وہ کوئی اور کام نہ کر سکے۔ انھوں نے لکھنؤ میں آل انڈیا میسر اکادمی قائم کرنے میں جناب مقبول احمد صاحب لاری کا ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ لاری صاحب اہی کے ساتھ رہتے تھے اور یہ ان سے ہر طرح کا سلوک کرتے رہتے تھے۔

خیر صاحب کو بہت دن سے یہ عارضہ تھا کہ اچانک ان کے منہ سے خون آنے لگتا۔ بلا مبالغہ بعض اوقات دودھ جیسی خورن خارج ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد ان کے جسم میں تازہ خون چڑھا یا جاتا تھا۔ اسی سے روز بروز نقاہت بڑھتی گئی اور حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ مسلسل بیماری سے گھر اگر وہ گزشتہ مئی کے اوائل میں اپنے وطن جوہرہ چلے گئے، تاکہ آخری آیام اپنے اعزاء و اقارب کے ساتھ گزار سکیں۔

بروز ہفتہ ۷ اچولائی ۱۹۷۶ء بوقت شب جوہرہ ہی میں انتقال کیا۔ خدا مغفرت کرے۔

## راز بلگرامی سید شریف الحسن

۱۹۰۱ء میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ریاض الحسن بلگرامی کی کچھ زمینداری تھی۔ مادری عربی فارسی کی کچھ تعلیم گھر پر ہوتی، ہاسکول میں آنکھوں سے درجے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن یہی انھوں نے ذاتی مطالعے سے پوری کی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا، فارسی اور عربی دونوں میں بہت اچھی استعداد تھی، اور شعر میں خاص طور پر حافظہ اتنا اچھا تھا کہ حوالے میں سند دینے میں کبھی دقت نہیں ہوتی تھی۔

فنِ عروض و شادان بلگرامی (دف جنوری ۱۹۲۸ء) سے حاصل کیا، لیکن شعر پر اصلاح سید وجاہت حسین دہلوی سے لی۔ اور طویل مشق سے خود استاد کی کا درجہ حاصل کیا۔ بلگرام کے میسوں نوجوان ان سے مشورہ کرتے تھے۔ شعر کے علاوہ نثر سے بھی مزاولت تھی۔ سید مقبول حسین واصل بلگرامی کے ماہنامے مرقع میں برابر کے شریک تھے اور اس میں کبھی کبھی نثری مضمون بھی لکھتے تھے۔ اس زمانے کا ایک مشہور تنقیدی مضمون شاد و عظیم آبادی اور اکبر الہ آبادی کے کلام کے موازنے سے متعلق تھا جس پر کچھ بحث بعد کو نگار (لکھنؤ) میں ہوئی تھی۔

مطبوعہ تصانیف یہ ہیں: حسین بیٹی، کاثر حسین، پیغامات

## تذکرہ معاصرین

آخری ایام میں تاریخ بلگرام مرتب کرنے کا ارادہ تھا، لیکن اس کے لیے جس ذہنی اور جسمانی سکون کی ضرورت تھی، وہ مستی نہ ہو سکا اور کام نامکمل رہ گیا۔

کلام کبھی محفوظ نہیں رکھا، بلکہ جس نے طلب کیا، اس کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ نظم، غزل، نعت، قصیدہ سب اصناف میں کہا، لیکن تلاش کرنے پر شاید ایک معقول مجلد کے لیے بھی اب مدلل سکے۔

سادات بلگرام کو اہل بیت سے بہت محبت تھی، ہر روز اذکار میں اس سے سنتی نہیں تھے، چنانچہ مرثیہ خوانی سے بہت شغف تھا، بلکہ فارسی ”وہ مجلس“ کے پڑھنے میں تو ان کی خاص شہرت تھی۔

تپ دق کے مرض سے ۱۰ اگست ۱۹۷۱ء کو بلگرام میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔  
موت کے طور پر چند شعرا درج ذیل ہیں:

بچوں کی دباں پر کلام محبت      بنا کعبہ حق، مقام محبت  
علی کے لیے خود سنی کہ رہے ہیں      محبت کا پہلا امام محبت  
کھل گئی بات، رنج یار کے ماتھے آئی      کچھ نہ کچھ پردہ اسرار کے ماتھے آئی  
ڈر رہا تھا، مرا کعبہ نہ کہیں طور بنے      خیریت ہو گئی، دیوار کے ماتھے آئی  
قدت کی نظر کا کب کہتا سوار اٹھی، پھر مڑ بھی گئی  
جو گود بڑی تھی حاتم پر لمحوں میں ہوا سے اڑ بھی گئی  
دنیلے بالآخر دیکھ لیا مولود حرم کے صدقے میں  
دیوار حرم سمت کی دھنی خود ٹوٹ گئی، خود جڑ بھی گئی



## طالب کشمیری، نند لال کول

پنڈت نند لال کول طالب جن کا مختصر عہدِ حیات کے بعد اچانک ۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو سرنگری میں انتقال ہو گیا، کشمیر کے خاصے صاحبِ وجہ استِ طبع کے فرد تھے۔ ان کے والد کا نام پنڈت تھاکر پرشاد کول تھا، جو ریاست کے بڑے زمینداروں میں گنے جاتے تھے۔ طالب کے دادا پنڈت دیوہ کول حکومت کشمیر میں دفترِ دیوانی کے افسر علی تھے۔ وہ فارسی کے منتہی اور شاعر بھی تھے، دیوہ نخلص تھا، عربی میں بھی خاصی دستگاہ تھی اور سنسکرت اور ہندی سے بھی واقف تھے، بلکہ ہندی میں تو ان کا ایک ادھ شعر بھی ملتا ہے۔ افسوس! ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ باقیاتِ صالحات میں سے فارسی کی چند غزلیں رہ گئی ہیں۔ شعرِ سخن کے علاوہ خوشنویسی اور مصوری اور نقاشی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اہل نظر سے خراجِ تحسین لے چکی ہیں، بشیرِ تصویر کیا سندھو دیو مالادہ مذہب سے متعلق ہیں۔ ان کا ۱۸۹۲ء میں سرنگری میں انتقال ہوا۔ دیوہ کے والد یعنی طالب صاحب کے جدِ امجد اے راگھونا تھا کول بہت بڑے رئیس اور زمیندار اور ریاست میں دندانتِ اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے تھے۔

## تذکرہ معاصرین

چندت نبذلال ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء کو سرسنگری میں پیدا ہوئے۔ خاندان کا ماحول علمی تھا۔ اس لیے ان کی تعلیم پر پوری توجہ دی گئی؛ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں بی اے، دو سال بعد ۱۹۲۴ء میں ایم اے (فارسی) پھر ۱۹۲۵ء میں منشی فاضل (فارسی) اور ماس کے ساتھ ایم اے اور ایف اے اور ادیب فاضل (اردو) کے امتحان پنجاب یونیورسٹی سے باقیادہ پاس کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی اور سری پرنسپل کالج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک رہا۔ اس سال یہاں سے سکریٹری ہو کر امرٹھک کالج میں پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی دارالدہ ہو کر چلے گئے، یہاں ۱۹۵۴ء تک رہے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۷ء تک کے تین برس جوں و کشمیر یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے ڈین کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں جوں و کشمیر کالج اکاڈمی سے بھی وابستہ ہو گئے۔

جس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس میں شعر گوئی کا شوق لا بُد تھا، لہذا یہ بھی کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے کچھ دن دبیر تخلص کرتے رہے، پھر اے بدل کر طالب کر لیا۔ شروع میں منشی رام سہاے متناکھنوی (ف ۱۹۳۲ء) سے اصلاح لی، جو منشی دودا کا پرشاد افق (ف ۱۹۱۳ء) کے بھائی اور منشی بشیشور پرشاد منور، مکھنوی (ف ۱۹۱۷ء) کے چچا تھے۔ متنا سے اصلاح کا سلسلہ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔ اس سال انھوں نے چندت برج کوہن و تاتریہ کیفی دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) کا تلمذ اختیار کیا۔ کیفی مرحوم نے اپنی وفات سے بدلتوں پہلے انھیں فارغ اصلاح قرار دے دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سیاب اکبر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) سے بھی شاگردی کا تعلق رہا؛ یعنی دہلوی اور سیاب دونوں سے بیک وقت استفادہ کرتے رہے۔ انھوں نے کیفی مرحوم سے تلمذ کا ایک شعر میں ذکر بھی کیا ہے:

حضرت کیفی کی شاگردی چنانچہ کبوتی ہوئی، میں ہوا طالب، تو غشا، فیض و حانی مجھے

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے: (۱) اشعار التخیل یعنی کلام طالب (بدایں ۱۹۲۷ء) اور (۲) مرقع انکار (بدایں ۱۹۵۲ء) اس کے علاوہ (۳) تراغ طالب کے عنوان سے ایک طویل مسدس بھی شائع ہو چکا ہو۔ منشی تیرتھ رام فیروزپوری نے اردو میں پرتھوی راج چوہان کی سوانحی نگہیں تھیں؛ طالب نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ کشمیر میں فاضل کے ایک شاعر ہونے ہیں، پنڈت راجہ کول عرض لگی، وہ دیر سے تخلص کرتے تھے، بہت مختصر کلام ہے۔ دیوان شائع نہیں ہوا تھا۔ طالب صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع کیا۔ ایک کتاب ادب ایوان میں کشمیریوں کا حصہ کے عنوان پر شائع کی تھی۔

پنڈت برج کشن کول، بنجیر اور پنڈت جگموہن دین شوق نے 'بہار گلشن کشمیر' کے عنوان سے کشمیری پنڈت شعرا کا ایک تذکرہ دو جلدوں میں شائع کیا تھا (۱۹۳۱ء-۱۹۳۲ء) طالب صاحب نے اس کے لیے شعرا کے حالات اور کلام کی فراہمی میں مزین کا بہت ہاتھ بٹایا تھا جس کا انھوں نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے۔

طالب صاحب نے غالب کے اردو اور فارسی کلام کا تجزیہ کر کے سرائے کلام غالب کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین تیار کیے "نوائے ادب" (بمبئی) میں شائع کیا تھا۔ اسی کو مرتب کر کے کتابی شکل میں 'جوہر آئینہ' کے نام سے چھپوایا۔ اگلی مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ منتشر حالت میں ہے۔

انھوں نے اٹھویں صدی کی مشہور کشمیری شاعرہ لادھارنہ کے کلام کا اردو اور فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ لادھارنہ کا کلام شہسوی فلسفے پر مبنی ہے۔ طالب کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ موضوع کی دقت کے باوجود اس میں کہیں اشکال پیدا نہیں ہوا۔ یہ کتاب غیر مکتوبہ رہ گئی۔ کاغذی ایام میں وہ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ یہ غالباً ناممکن ہو گئی۔ اچھا ہو کہ جتنا حصہ بھی لکھا جا چکا ہے، اسے شائع کر دیا جائے۔ اس سے مدد صرف ان کی مسنت شائع ہونے سے محفوظ ہو جائیگی، بلکہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے بنیاد

بھی ثابت ہوگی۔ وہ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی کہتے تھے جیسا کہ 'بہار گلشنِ کبیر' کے انتخاب سے ظاہر ہے۔ "مترق افکار" میں بھی کچھ فارسی کلام موجود ہے۔ خدا مظلوم سارے فارسی کلام کی مقدار کتنی بڑی بہر حال یہ بھی غیر مطبوعہ رہ گیا۔ بہت سے مضمون مختلف رسائل و جرائد میں منشر ہوئے ہیں۔

انہیں علمی خدمات کے جلد ویں صدر جمہوریہ سند نے اس سال انہیں فارسی کا انعام (تین ہزار روپے سالانہ) عطا فرمایا تھا۔ وہ ۴ اکتوبر اس کی سند لینے کو دئی آنے والے تھے کہ چار پانچ دن کی مختصر علالت کے بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۷۱ صبح ساٹھ سات بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے دہلی ملک بھا ہو گئے۔ ان کی آخری کتاب جو ہر آمینہ بھی بطبع سے نہیں آئی تھی، یہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان کی موت سے ایک صلح کل اور شریف دوست، سید روافد شفیق استاد اردو کا ایک خاموش خادم ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

ہر کوئی عجب تماشا ہے جمالِ یار ہے	ناچتی پھرتی صبا ہے، اور گاتی ہے بہا
غیرِ سرستہ کہنے کو ہوا پنا حالِ دل	رازِ کلیوں کی جنگ سے کہناتی ہے بہار
جس کو رفیق کبھی تھے، شستر سے کم نہیں	پہلوں ایک خار ہے میرے بیلے دل
بچپن کا اک رفیق تھا اب وہ بھی بھٹ گیا	دل میرا آشنا ہے، نہ میں آشنا دل
زخمِ جگر کی تشنگی اے ہمنشیں! نہ بوجھ	ہر شورِ نالہ، شورِ تمکداں سے کم نہیں
ہے اضطرابِ شوق، نقابِ رخِ امید	تازہ نگاہ، پر وہ مرگاں سے کم نہیں
لطفِ جنائے یار کا نقشہ نہ کھینچ سکا	کس کام کی ساری یہ طبعِ لطیف ہے
دیکھا جو وقتِ نزع کہا: "تے رہا ہر دم"	طالبِ بہانہ ساز بھی ہے اور ظریف ہے

تذکرہ معاصرین

ہو میرے رنج و راحت کا ذیادہ ابراز وہاں کوئی

دستے پائے محشر میں بھی میری داستان کوئی

مناصر کے قفس کی تیلیاں، اک روز ڈومینگی

ابھی سے ڈھونڈ لے مکہ حدم میں تو مکان کوئی

بند رکھتا ہوزبان استغاثہ شوقی سکوت

اب وہ سولے جہت سر سے ہی جاتا رہا

## رباعی

دنیا تو دباں جاں ہے پیری کے لیے

طالب پیری میں کب کوئی ساتھ چلے

ہے خواہش پرواز اسیری کے لیے

ہاں ایک عصا ہے دستگیری کے لیے

## عارف عباسی بلیادی۔ قاضی محمد عثمان عباسی

ان کا شجرہ نسب میراقت حضرت عبداللہ عباس سے ملتا ہو۔ بیخانان پہلے چریکوٹ (ضلع اعظم گڑھ) میں مقیم تھا۔ ضلع بلیا میں یلہنوار ڈوریلو سے آبپاشی سے کوئی چار میل دور ایک گاؤں پسوہاری ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ چریکوٹ سے نقل مکان کر کے پسوہاری میں آئے۔ یہاں حکومت وقت نے ان کی مناسب قدر و منزلت کی کو سکند پور عزلی کی قضاۃ ان کے سپرد کر دی۔

عارف کے والد قاضی محمد سلیمان عباسی صاحب علم بزرگ تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی کی تحصیل دیوبند اور دلی کے مدارس میں کی تھی، لیکن اس کی تکمیل نہیں کر سکے تھے۔ انھوں نے ساری عمر کہیں ملازمت نہیں کی، اپنی گھر کی زمینداری کی دیکھ بھال میں مصروف رہے اور اسی اکل حلال پر قانع تھے۔

عارف صاحب یکم مئی ۱۹۱۲ء کو پسوہاری ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر بمشکل سات آٹھ برس کی ہو گئی جب ان کے والد قاضی محمد سلیمان اللہ کو پیار سے ہو گئے۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی حسبِ درخواست نہ ہو سکی۔ انھوں نے امیر الدولہ اسلامیہ

## - تذکرہ معاصرین -

گھنٹہ سے دسویں بجے کی سندی اور اس کے بعد کریمین کالج بھنٹوں میں داخلے لیا۔  
 انٹر میڈیک یہاں تعلیم پائی اور اس کے بعد گھنٹوں یونیورسٹی سے بی اے کرنے کی تھائی؛ لیکن  
 گھر کے ناسازگار حالات نے تیکن کی فرصت نہ دی؛ آخری سال میں یہ سلسلہ ترک کر دینا  
 پڑا۔ پینالیا ۱۹۳۲ء کی بات ہو۔

سیراوقات کے لیے اب انھوں نے کالون تعلقہ دار کالج بھنٹوں میں مدرسہ کر لی۔ یہاں  
 والیان ریاست اور تعلقہ داروں کے نو بہال تعلیم پاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی  
 کے ساتھ اس کالج کے حالات بھی دیگر گول ہو گئے، اؤ عارف صاحب یہاں کی ملازمت  
 سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ریاست ناٹپارہ اور محمدی تعلقہ (ضلع کیشٹری) میں  
 صاحبزادگان کے تالیق کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۵۰۰ تک رمل۔ اس سال  
 انھوں نے آخری مرتبہ غیروں کی غلامی سے مخلو خلاصی پائی۔

اس کے بعد انھوں نے کہیں ملازمت نہیں کی۔ بقیہ زندگی اپنی آبائی کاشتکاری کی نگرانی  
 میں لگے رہے۔ اس کے ساتھ کچھ تجارت کا سلسلہ بھی کر دیا تھا۔ انھوں نے بیلنٹار و ڈ  
 (ریلوے اسٹیشن) میں سینٹ کی دکان کر لی، جس سے بفضلہ اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ عزت  
 ابرو کے ساتھ گھر کا بجلا خرچ چل جاتا تھا۔

صحت بالعموم اچھی رہی، جو سادہ اور آزاد زندگی کا خاتمہ ہے؛ لیکن وہ برس ہوئے ایچی  
 کی موت (۱۵ اگست ۲۰۱۹ء) نے اس پر بہت برا اثر ڈالا۔ ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء کو دل پر پہلا حملہ  
 ہوا۔ علاج معالجے میں کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن بیودہ اپنے عزیز دوست حکیم سیف الدین  
 کے پاس میرٹھ شہر گئے ہوئے تھے کہ وہاں دوسرا حملہ ہوا۔ اسی میں ۲۲ ستمبر ۱۹۷۱ء کو صبح  
 ساڑھے پانچ بجے روح قصہ حضری سے پردہ کر گئی۔ وہیں تدفین عل میں آئی حکیم  
 صاحب موصوف کے خاندانی قبرستان شاہ سلطان میں آخری خواجگاہ نصیب ہوئی۔  
 یوں معلوم ہوتا ہو، گو یا میرٹھ کی مٹی ہی نے انھیں وہاں کھینچ جلا یا تھا۔

اپنے پیچھے اولاد جسمانی میں پانچ بیٹے اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے۔ سب سے بڑے سعید الغفر  
الکبادیونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ انھیں بھی علم و ادب سے شغف ہو۔ اور سعید عارفی کے  
تلمذ نام سے کہتے ہیں۔

عارف نے شعر گوئی اگرچہ زائد طالعلمی ہی میں شروع کر دی تھی، لیکن اس میں باقاعدگی  
۱۹۴۱ء میں آئی۔ ابتدا میں آزاد فچوری اور حکیم سید باقر حسین شاعر لکھنؤی سے (ف ۱۹۲۲)  
مشورہ رہا۔ بعد کو جگر مراد آبادی سے مستقلاً ملحد اختیار کر لیا۔ حبیب احمد صدیقی نے بھی  
ان کی ذہنی اور فکری تربیت میں خاصی دلچسپی لی تھی۔ وہ خوش فکر اور زود گو اور زود گو  
شاعر تھے، مگر افسوس کہ کلام کی تمدن سے متعلق بہت بے پروا رہے۔ چنانچہ کوئی مجبوز  
مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ان کے بڑے صاحبزادے سعید عارفی اسے مختلف رسائل و  
جرائد سے فراہم کرنے کی فکر میں ہیں۔

دولت کو نہیں ہے، مگر غم ہے	غم بھی وہ، جو ہر نفس پرہیزگار
مجھ کو ہر غم سے ہو گئی ہے نجات	جس سے غم کے یہ فیض، یہ برکات
وہ تو کہیے، ترے غم نے بلا کام کیا	ورد مشکل تھا غم زبست گوارا کرنا
حسن کی فطرت، مشکل احتیاط	حاشی، بیگانہ سود و زیباں
نظر آتی جو جس کی روشنی میں اک نئی منزل	خدا دیکھے ترا نقش قدم ایسا بھی ہوتا ہو
لالہ دگل کہیں غور خید و قتر ہوتا ہے	حسن ہر رنگ میں فردوس نظر ہوتا ہو
میری اس نیند پر بیداری کو نین منشار	آنکھ لگتے ہی ترے پاؤں پر سر ہوتا ہو
اب سٹی جاتی ہے یہ لذت ناکا کی بھی	کیا قیامت ہو کہ آہوں میں اڑتا ہوتا ہو
ایک وہ بھی طلب و شوق کی منزل ہو جہاں	حسن خود ساتھ مرے گرم سفر ہوتا ہو
اللہ اللہ، یہ مرے حسن بھتور کا فروغ	دل میں اک طمع سی روشن ہو تری یاد کے
وہ روئے زیبا، فردوس رنگیں	وہ قد رونا، تنہیل محشر



حسنِ چشم، نازِ گلستاں	سوجِ نفس میں تسنیم و کوثر
ہر جنبش لب، اے محبِ از غفلت	ہر لغزش پا، آشوبِ بخشش
عملِ بیگناہ میں یقین ہے	بنائے زندگی ہو خاکِ علم
ہے یقین کے دم سے روشن کائنات	اے اسیرِ حلقہ و ہم دنگ
عکسِ خود سے دنیا اندھیری	نورِ جنوں سے عالم مند
جہاں تک جس کو احساسِ نظر ہے	وہیں تک حسن میں رضا یاں یہاں
محبت میں محبت کی قسم ایسا بھی ہوتا ہو	کدولِ روتا ہوا اور نہتے ہیں ہم ایسا بھی ہوتا ہو
محبت میں کبھی چشمِ کرم بھی بار ہوتی ہے	گلوں اشکِ شبنم کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہو
دہانِ عشق بن جاتی ہو اکثر بے زبانی بھی	لگا ہوں سے ہر پڑنا ہو غم ایسا بھی ہوتا ہو
ہجومِ غم میں کبھی عارفِ بسکوں محسوس کرتا ہو	خوشی سے بھی الجھ جاتا ہر دم، ایسا بھی ہوتا ہو
بھونک کر میں لے آشیانے کو	رکھنی بخش دی زمانے کو
وہ تراغم تھا، جو سنوار گیا	دندگی کے نگارِ خسانے کو
جس کی دیوانگی مونا زخرد	کون سمجھائے اس دوانے کو
کچھ حجابات اٹھ گئے عارقت!	کچھ حجابات ہیں اٹھانے کو
تری ہی سمت محبت کے قدم اٹھتے ہیں	موڑ آنے سے کہیں راہ بدل جاتی ہوا
کیا کیجیے اب اس کو کہ دل بیخبر رہا ہے	لے دوست! میں اٹھنے کو تو اٹھا ترے ہر
کیا بات پڑا آج ان کو نہامت سی ہو عارِ ابا	کیا پاگئے وہ کچھ، مرے اندازِ نظر سے
دہرِ والدہ تسلیم و رضا ہیں یہ لوگ	شکوہِ غم تیرے شاہیتِ اعظم کیا کرتے
وہ جو ناموسِ مشیت کے ہیں عارف!	دہ شنا خواہی، بابِ کرم کیا کرتے!
عشرتِ بنیم نگاہی بھی ضمیمتِ سبھو	فرصتِ شوق کے لمحات کہاں ملتے ہیں!
دلِ حشرِ آرزو ہو، نظرِ شرحِ آرزو	کس کی نگاہِ بطف ہو سائل، نہ پوچھیے

## تذکرہ معاصرین

گم ہو گیا جو اپنے ہی جلوؤں کے حسن میں    اس کا میاب دید کی مشکل نہ پوچھیے  
 وہ نگاہِ مست کی گردِ پیشیں کہ ہزار جامِ شاد ہوں  
 وہی دورِ بادۂ بے سبب، تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو  
 نہ کون تھا کسی حال میں، نہ قرار تھا کسی رنگ میں  
 تھیں پا کے بھی وہی جستجو تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

## منظر اکبر آبادی شمشاد حسین صدیقی ۔

منظر اردو کے مشہور شاعر جناب سیاب اکبر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت والد مرحوم کی نگرانی میں پائی۔ لیکن کمزوری صحت اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہ میں حائل ہوئی۔ سیاب مرحوم اپنی ملازمت کے سلسلے میں کانپور کے بعد اجیر، ٹونڈلہ، کانگرہ وغیرہ میں رہے۔ منظر کا بچپن بھی انہیں مقامات میں بسر ہوا۔ ٹونڈلہ کے قیام کے زمانے میں یہاں کے ریلوے ہائی سکول میں زیر تعلیم تھے، لیکن ابھی بچوں کے درجے تک نہیں پہنچے تھے کہ سیاب وہاں سے چلے گئے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں اردو سب کام سے ہاتھ اٹھا کر کانگرہ میں قصر الادب کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کی طرف سے ایک ماہنامہ پیدا جاری کیا۔ منظر اپنی کمسنی کے باوجود اس ادارے سے وابستہ ہو گئے، اور یوں تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد کچھ فارسی سحرنا، اور اردو مدرسہ عالیہ، جامع مسجد کانگرہ اور مدرسہ محمدیہ کانگرہ میں حاصل کی۔

قصر الادب کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف پرچے شائع ہوتے رہے جن میں ہفتہ وار

ساج، نریا، شاعر، کنول، مشورہ، ہفتہ وار ایشیائی خاص طور پر شہرت حاصل کی۔  
منظر کسی ایسی حیثیت سے ان سب سے متعلق رہے اور غالباً پندرہ برس تک ایشیا  
کے ایدمٹر رہے۔

جس ماحول میں انہوں نے پروش پائی اس میں شعر گوئی کو یا لازماً حیات تھی۔ یہ بھی  
بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے، اصلاح اپنے والد سے لی۔ اگرچہ غزل بھی کہتے تھے،  
لیکن زیادہ مرادلت نظم سے رہی۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں سیالپور کا کراچی میں انتقال ہو گیا، تو منظر صاحب انگلے سے پاکستان  
چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے ایک ہفتہ وار پرچم کے نام سے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ  
واقعہ ہے کہ پاکستان میں پریشان حال رہے۔ انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے ادبی  
وظیفہ ملا تھا۔ چند رستی ادھر بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی۔ ضیق النفس کا عارضہ تھا۔  
لیکن اس کے باوجود بظاہر تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اپنا تک ۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں کراچی  
کا شدید دورہ پڑا جس سے تک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اور دس منٹ بعد آٹا فانا  
ساڑھے دس بجے روح قبضہ عرصی سے پرواز کر گئی۔

کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

اب ہونے کے چند شعر دیکھیے، جو مختلف مسائل سے جمع کیے گئے ہیں،

میں پوچھتا ہوں یہ کونیا کے امرا دوں سے وہ کیا کرے کہ جو نا کام آرزو ہو جائے  
جسے منظور ہو یا بادی مطلق، منظر! آئے تو ہمارے ہستی کا گریباں ہو چلے  
لو کہیں تھا کہ تھی ہر چیز پر اک سا دی ظلمی جراتی ہو کہ اک دنیا جواں معلوم ہوتی ہو  
عبادت ہو کہ سجدے و ذکر تہوں خدا کو جس طبعیت ہو کہ اب تک بہت پرستی کو ترستی ہو  
دیکھیے، کس نام سے ہو ذکر مرگ، عاشقی نام میری تجو دی کا زندگی مشہور ہو  
شائے چپ ہٹا خفا مٹوں کچھ بے شب کا شائے مناسب وقت ہو دل چاہتا ہو اک نغمہ گزشتہ

اب کہیں تیری تمنا کا ٹھکانا بھی نہیں      دیکھ انعام، آتماؤں کے ٹھکرانے کا  
 مراد مل گئی، تو زندگی کو رو بٹل دنیا      نشاطِ محفل پہتی عبارت ہو مرے دل سے  
 عجیب کچنیز جو انسان کا ہونا بھی نہ ہوتا بھی      جہاں آباد ہوتا ہے وہیں برباد ہوتا ہو  
 کبھی مثلِ غیر رسماً مرا حال پوچھ لیتا      جو نہ چارہ ساز تھا تو زمانہ ساز ہوتا  
 بباد کر کے دے نہ فریب التفات کے      اب ہم تری نگاہ کے قابل کہاں رہے  
 جب میں نہ تھا تو دل کا نعتینِ محال تھا      جب دل نہ تھا تو آپ کے جلوے کہاں رہے  
 جدید جو کوئی تصویرِ یزدنِ نظرت میں      بنا بنا کے ہیولے مٹائے جاتے ہیں  
 بیکار ہو جنوں سے بھی فرصت اگلے      اب اتنی دور لوٹ کے جائیں تو گھر طے

## سامی، ہادیو پرشاد

ہرودئی (روپی) کے ایک متوسط الحال کاشتہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد کا نام دیوی پرشاد تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے: بڑے شامہا پرشاد تھے اور چھوٹے بی ہادیو پرشاد۔ ہادیو پرشاد ۱۰ جولائی ۱۸۹۵ء کو ہرودئی میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم جوہلی ہائی اسکول، لکھنؤ میں پائی۔ اس کے بعد کیننگ کالج میں داخلہ لیا۔ بی ایس سی آخری سال میں تھے کہ والد چل بسے۔ چونکہ اس کے بعد مالی حالت ٹھیک نہ رہی، اس لیے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب انھوں نے ضرورتاً فیض آباد کے ایک اسکول میں نوکری کر لی جنسے بعد نارمل اسکول، جیلپور میں منتقل ہو گئے، اور پھر گویا بھڑکے لیے یہیں کے بورے۔ ۱۹۲۰ء میں بکرہ تعلیم نے انھیں تدریس کی تربیت حاصل کرنے کے لیے منتخب کیا، جس کی سند اسپنس ٹریننگ کالج، جیلپور سے سند حاصل کی؛ اور اس کے بعد وہیں گورنمنٹ کالج ہائی اسکول میں مدرس مقرر ہو گئے۔

۱۹۳۹ء کے اوائل میں بھکائی بھھا، جیلپور نے انھیں تہکاری سٹی کالج میں اردو تدریسی کا کچر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اردو یا فارسی میں ایم اے نہیں تھے۔ اس لیے

## مذکرہ معاصرین

یونیورسٹی اپنے قواعد کی رو سے ان کے انتخاب پر بجا طور پر اعتراض ہو سکتی تھی، لیکن ان کی مسئلہ قابلیت اور تجربے کے پیش نظر ناگپور یونیورسٹی کے ادیاب جلد عقد نے استثنائی طور پر ان کے تقرر کی اجازت دے دی۔ اس پر انھوں نے جنوری ۱۹۴۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور بقیہ عمر کی ہتھکارتی کالجز میں گزار دی۔ اپنی عمر کی صحت اور پرانہ سالی کے باعث وہ یہاں سے ۱۹۷۰ء میں سکندرشہ ہونے۔

پچھلے کئی برس سے ان کی صحت تسلی بخش نہ تھی۔ ان کی بڑھتی پڑتی ہوئی کچھ نقص پیدا ہو چکا تھا، جس سے گردن میں بھی کمی آگئی تھی۔ مزید مصیبت یہ کہ نئی حالات بھی بہت ناخوشگوار ہو گئے۔ خانگی جاداد سے متعلق کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا اور نوبت عدالت تک پہنچی۔ مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا۔ اور وہ پریشان رہنے لگے۔ اسی زمانے میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور اس کے بعد اس کے متواتر حملے ہوتے رہے۔ آخری حملہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو ہوا اور اسی دن سپر کے پانچ بجے وہ میڈیکل کالج میں جان بحق ہو گئے۔ لا اولدفوت ہوئے۔

جبکہ ذکر ہوا وہ گھر کے ناموافق حالات کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے، لیکن خدا داد ذہانت اور ذاتی جدوجہد سے انھوں نے پرکھی پوری کر لی۔ سائنس کے وہ طالب علم رہے تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی میں ان کی مہارت کا کچھ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کئی ایچ ڈی کے طلبہ اور پروفیسران سے مشورہ کرتے اور رہنمائی حاصل کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں بھی اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی جب سے وہ بہت دن تک مدھیہ پروفیشن کے فارسی عربی بورڈ کے صدر کے عہدے پر فائز رہے۔

شعر و سخن سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ جب شعر کہنے لگے، تو افتخار الملک مضطر خیر آبادی سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہ ایک نعتیہ نظم (ردیت حسنہ) کے علاوہ جو جذباتی

کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا؛ اتنا اطمینان ہے کہ وہ محفوظ ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔

اس نعتیہ نظم کی شای ہندول یہ ہے کہ فروری ۱۹۲۷ء (یعنی شب ۵/ شعبان ۱۳۴۵ھ) کو مغرب کے بعد ایک ستارہ ٹوٹا اور آہستہ آہستہ اس کی روشنی سے آسمان پر لفظ ”محمدؐ ظاہر ہوا۔ یہ نظم ”دشیش آء“ کہ گھٹنے تک دیکھا گیا اور پھر خندرجی تدمم ہوتا ہوا سٹ گیا۔ یوپی اور مدھیہ پردیش (سی پی) کے متعدد شہروں میں ہزاروں اشخاص نے اسے دیکھا۔ اس زمانے کے اخباروں میں بھی اس کا بہت چرچا ہوا تھا۔ اس سے تعلق یکم مارچ ۱۹۲۷ء کو جیلپور میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جس کے کوائن ستارہ عہدی کے عنوان سے علی احمد جیلپوری نے شائع کیے تھے۔ اس مجموعے میں سامی کی اس نظم ”رویت حسد“ کے علاوہ تین فارسی رباعیاں ”ایک فارسی نقطہ اور ایک فارسی نعت بھی شای ہیں۔ یہ نظم ”رویت حسد“ انھیں آیام میا جذبہ سامی کے عنوان سے بھی چھاپی گئی تھی۔ یہ سندس کی شکل میں ہے۔ اس میں سترہ بند (۱۵ شعر) ہیں۔

غزل کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں

سامی کی حقیقت کیا احباب کی شفقت ہے

بھٹوں کو تو اچھا ہی اچھا نظر آتا ہے

عشق میں لٹتے ہیں اکثر کارواں منزل کے پاس

غرق ہو جاتی ہیں اکثر کشتیاں ساحل کے پاس

تم تھے تو نگاہوں میں ویرانہ گلستاں تھا ہم آج گلستاں کو ویرانہ سمجھتے ہیں

اک ہم ہیں کہ غیروں کو اغیارہ نہیں سمجھا اک آپ ہیں انہوں کو بیگنا سمجھتے ہیں

نیکوؤں کے بھی بدے اب بدی سے ملتے ہیں

دوستی کے سب پہلو دشمنی سے ملتے ہیں



## تذکرہ معاصرین

ابھیں غرض کہ حد میں نہیں غریبوں کی      یہ بخود ہی تھی ہماری جو ہم کا آئے  
 ایسی پریش سے تو بہتر تھا غافل تیرا      حال یوں پوچھا کبھی جیسے کھاسائی نہ تھی  
 اب انھیں میری دفا کا اعتبار آیا، تو کیا      بعدِ مردن، مژدہ دیدار بھی آیا، تو کیا  
 جہاں سارا نرا آئیہ صورت نما نکلا      کہ جس بت کو گاہِ غیر سے دیکھا خدا نکلا  
 ایک مدد سے جو کچھ کہ نہ سکا تھا ساسی      میں درِ حضرت مضطر پر جس میں سانس ہوا

## افقر موبانی اسید محمد حسین

محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاء (ف ۲۱۳۲ء) کے خلیفہ حضرت نصیر الدین (ف ۵۱۲ھ) ہزارہ دہلی کے نام سے کون صاحب علم و اہل وقت نہیں ہو گا! انھیں کے خلیفہ اور جانشین حضرت سید محمد گیسو دراز تھے (ف ۲۱۴۲ھ) جن کا مدفن گلبرگ میں ہو۔ ان سے آگے یہ سلسلہ طریقت جلالہ ان کے خلفائے رحمت حضرت سید شاہ عبدالکحیکم عرف دادا میاں اولاً بہت دن کا سپی (ضلع جالندھر) میں مقیم رہے اور پھر ۸۵۰ھ میں دہلی سے نقل مکان کر کے قصبہ موبان (ضلع آٹاڑ) میں آقامت گزریں ہو گئے۔ یہی دادا میاں ہمارے شاعر سید محمد حسین افقر موبانی کے جدِ علی تھے۔ حضرت دادا میاں کی آنکھیں پشت میں افقر کے دادا مولانا شاہ غلام علی پیرناوہ عرف میاں جی ہوئے۔ پری مریدی کا یہ سلسلہ رشد و ہدایت انھیں ختم ہو گیا۔ ان کے جانشین مولانا سید اکرام علی افقر موبانی کے والد تھے۔ یہ ۱۸۴۵ء میں موبان میں پیدا ہوئے انھوں نے عربی فارسی اور علوم دینیہ کی تعلیم اپنے والد صنی حضرت میاں جی سے پائی۔ وہ حاجی تو بہ تبادہ نقشبندی جاری رکھتے، لیکن انھوں نے یہ سلسلہ بیعت قائم نہیں رکھا، اور خود سید حاجی وارث علی شاہ دیوہ (ف ۱۹۰۵ء) کے مرید ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

## تذکرہ معاصرین

انہوں نے قصبہ موہان اور قریب دھوار کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں بجنور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، بسمل تخلص تھا!۔ انفر صاحب نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ان کا کلام دیوان کی شکل میں مرتب نہ ہو سکا، صرف کچھ اوراق میرے پاس موجود ہیں۔

انفر صاحب کا انہوں نے خود مجھے اطلاع دی تھی ۳۱ جولائی ۱۹۸۸ء کو اپنے وطن مولوی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے محمد حسین کے علاوہ ان کا تاریخی نام "ظفر وارث" بھی رکھا جس سے ۱۹۸۸ء پر آمد ہوتے ہیں، ان کے بچے تحفہ معاصرین آخر تک انہیں اسی تاریخی نام سے کراتے رہے۔ انفر کی ناخیاں قصبہ آسیون (ضلع ۱۲) میں تھیں جہاں ان کی ابتدائی تعلیم رہیں اپنے ماموں مولانا ضیاء الدین قادری کی نگرانی میں ہوئی۔ اس کے بعد یہ موہان آ گئے اور اب دینیات اور دوسرے علوم رسمہ کی تحصیل میں لگ گئے۔ انہوں نے مقامی اردو مڈل اسکول سے ۱۹۸۱ء میں بھرمرہ سال مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کسی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۸۵ء میں وہ مستقلًا لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں انہوں نے حکیم عبدالعزیز (بھووانی ٹولہ) سے طب کی تعلیم پائی، لیکن انہوں نے کہیں باقاعدہ مطلب نہیں کیا۔ جب فکر معاش ہوئی، تو ۱۹۸۷ء میں مطبع نو کشور میں مصحح مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ بہت دن تک رہا۔ کئی سال بعد سرکاری ملازمت مل گئی اور وہ کورٹ آف وارڈس میں ضلع دار مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد تحصیل میں ناظر آمد واصل باقی نوہیس کے عہدوں پر بھی رہے، ان کا زیادہ تر طبع آباد (ضلع لکھنؤ) میں گزرا۔

انفر ۱۹۱۲ء میں سہی چلے گئے۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ وہاں کے ایک سینہ حاجی منشی محمد حسین لکھنؤ آئے جب وہ مطبع نو کشور گئے، تو یہاں ان کی ملاقات انفر سے ہوئی۔ منشی محمد حسین کا ایک ہفتہ وار پرچہ "مفید روزگار" تھا، وہ اس کے لیے کسی

ایڈیٹر کی تلاش میں تھے۔ جب وہ افقر صاحب سے ملے تو انھیں بہٹی آنے اور مفید روزگار کی امداد سے منجھانے کی دعوت دی۔ افقر نے اسے قبول کر لیا اور اپنی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ ہو کر بہٹی چلے گئے۔ یہاں وہ تین برس ۱۹۱۵ء تک رہے مفید روزگار کے ایڈیٹر تو تھے ہی، مگر محمد حسین کے ایسا پرائیڈوں نے ایک مزاحیہ پرچہ مولانا پانچ بھی جاری کیا۔ لیکن بہٹی کی مرطوب آب و ہوا انھیں راس نہیں آئی، اب وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ بالآخر انھوں نے تنگ آ کر ان صحافتی سرگرمیوں پر لات ماری اور لکھنؤ کی راہ لی۔ اس سے معاش کا مسئلہ تو حل نہیں ہو سکتا تھا۔ بارے مطیع نوکٹو کے تنظیم نے دستگیری کی اور یہ دوبارہ اپنی پرانی جگہ پر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں وہ ڈسٹرکٹ گزٹ کے مدیر ہو کر گوئندہ چلے گئے۔ یہ کانگریس اور خلافت کی سرگرمیوں کی روز افزوں ترقی کا زمانہ تھا، ان دنوں کے خلاف حکومت کے پراگندہ سکیشن تیزی سے کام کر رہی تھی، اور اس کام کے لیے سب ضلعوں سے گزٹ شائع ہونے لگے تھے۔ گوئندہ گزٹ بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ ۱۹۲۲ء میں یہ گزٹ بند ہو گیا اور افقر صاحب لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں ان کا لمبا داماد لے دے کے نوکٹو چھاپہ خانہ تھا، اب کے انھیں صحافتی تجربے کے پیش نظر روزانہ اور دو اخبار کا نائب مدیر مقرر کیا گیا۔

اس زمانے میں سید جالب دہلوی (ف جولائی ۱۹۰۳ء) لکھنؤ میں ہندو اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ افقر صاحب سے ان کے دید و دید کے تعلقات تھے، جالب کے مشورے سے افقر نے ہندو اخبار چھاپنا جاری کیا، اس کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۲۴ء میں نکلا تھا۔ اس میں لکھنؤی اسلوب بیان اور طریقہ سخن پر بڑی کڑی تنقید شائع ہوئی، جس سے یہاں کے شعرا اٹھ اٹھے، اور انھوں نے افقر کے خلاف باقاعدہ محاذ بنالیا۔ مخالفین کے نام لکھنے سے فائدہ؟ یہ سمجھیے کہ عزیز، آزاد، ججو، مولانی، آسنی، الدنی، امید شہو

وغیرہ تو البتہ غیر جانبدار ہے، قصیدہ لکھنا تمام بڑے اور چھوٹے شاعروں کے خلاف ہو گئے تھے۔ لیکن اصف گوشتی، 'بجو دمو دانی' اور 'ماثر کھنوی' جام جہاں نیک کے متاثرہ مضمونی نگار تھے۔ جب کھنوی شعرا کی دھکیاں میسوا ثابت ہوئیں تو متعدد حضرات نے تنک عزت کے مقدمے دائر کر دیے۔ انقر نے ان کے اوجھے حملوں کے آگے متحیاہ ڈالنے سے انکار کر دیا اور ڈوٹ کر مقابلہ کیا؛ اور بالآخر مخالفوں کو ہر میدان میں شک اٹھانا پڑی۔ یہ پوجہ اپنی پوری اکن بان سے ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔ اس کے منہ ہو جانے کے بعد وہ پانچ چھ برس تک پڑھاتے رہے جہاں سے ۱۹۵۰ء میں سکے و ش ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں اتر پردیش کی حکومت نے ان کا ایک سو دو پیہ ماہ زادہ وظیفہ مقرر کر دیا جو انھیں اپنی دفاتر تک ملتا رہا۔ توکل اور صبر و شکر انھیں ورثے میں ملا تھا؛ اس لیے اس قلیل و جرمع معاش کے باوجود انھوں نے کبھی شکایت کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی حضرت وارث علی شاہ (دوہ) کے مرید تھے۔ ان کے نام کے ساتھ وارثی کا اضافہ اس مناسبت سے تھا جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، انھیں علی ہوگا کہ وہ بالعموم ایک گیر و اہمد باندھے رہتے تھے۔ یہ بھی وارثی گروہ کا امتیازی نشان ہے۔ ان کے کمرے میں عین پنگ کے اوپر حضرت وارث علی شاہ کی ایک تصویر لٹکی رہتی تھی، اگرچہ اس پر ایک پردہ پڑا رہتا تھا۔

انھوں نے اپنے پیر کی یاد ماننے کو ۱۹۰۵ء میں سالانہ طرعی مشاعرہ کی بنیاد رکھی تھی؛ یہ مشاعرہ اپریل کو ہوا کرتا تھا۔ اسے وہ اپنی زندگی بھر باقاعدگی سے کرتے رہے۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ مصرع طرح ہمیشہ ہرچ شمن سالم میں ہوتا اور قافیہ آسان۔ اس کے لیے وہ شاعروں کو دعوئے شمار بھیجتے تھے؛ اور ان شاعروں کے علاوہ اور کسی کو کلام پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

چونکہ وہ بہت کمزور ہونے لگے تھے اور کمزوری روز بروز بڑھتی تھی؛ اس لیے انھیں معلوم تھا کہ اب وہ

زیادہ دن جیسے کے نہیں۔ چنانچہ آخری مشاعرے کے موقع پر انھوں نے اپنے احباب اور طائفہ سے ان کے نام لے کر یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس مشاعرے کو آئندہ بھی جاری رکھیں۔ سالِ رداں کے مشاعرے میں انھوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ آئندہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ وہی ہوا۔

کبرسنی کا عالم تھا۔ ۸۴ برس کی عمر سندھستان کے معیار عمر کو دیکھتے ہوئے کم نہیں ہو۔ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ قانع کا حملہ ہوا جس سے وہ بہت معذور ہو گئے۔ سالِ گذشتہ دوسرا حملہ ہوا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اب دونوں کے بہان ہیں، لیکن موت کا بہانہ قلبی دورہ ہوا۔ وہ ایک زمانے سے حملہ لات کھن (ماسوں بھانجے کی قبر کے موڑ پر) لکھنؤ میں رہتے تھے۔ یہیں منگل کے دن ۲ نومبر ۱۹۶۹ء ۱۲/۱۲/۱۲۹۱ھ کو بعد مغرب انتقال ہوا۔ تدفین اگلے دن (۳ نومبر) بعد ظہر ہوئی۔ نمازِ جنازہ ان کے رشتے کے بھتیجے محمد اختر دارلٹ نے پڑھائی۔ عیش باغ کے قبرستان میں قبر نصیب ہوئی۔

ابھی وہ تارِ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ انھوں نے (۱۹۰۰ء میں) شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا سب سے پہلا شعر تھا:

دل غنی ہے تو مفلس کیا ہے

گھر میں اللہ کے کمی کیا ہے

یہ شعراں کے خاندان کے مذہبی ماحول کا ترجمان ہے جس زمانے میں یہ لکھنؤ آئے ہیں یہاں حکیم ضامن علی جلال (ف ۱۹۰۹ء) اور منشی امیر اللہ قیلم (ف مئی ۱۹۱۱ء) دو صاحبِ فنِ ستارہ موجود تھے۔ چونکہ افقر کو سن (ف ۱۸۵۲ء) کے کلام اسے شغف تھا، اس لیے انھوں نے قیلم کی شاگردی اختیار کی۔ قیلم خود نواب اصغر علی خاں نسیم (ف ۱۸۶۶ء) کے شاگرد تھے جن کا سن کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح افقر کا سلسلہ سخن تیسری پشت میں سمن سے جا ملتا ہے۔ اصغر گوئندوی (ف نومبر ۱۹۳۶ء) اور حسرت گوئی

(ف ۱۹۵۱) ان کے خواجہ تاش تھے۔ انقرہ ۱۹۰۵ء کے آخر میں تسلیم کے شاگرد ہوئے؛ حسرت ان سے دو تین سال پہلے شاگرد ہو چکے تھے اور صغر گوشتدکی دو تین سال بعد آئے۔

ان کی کچھ تصنیفات شائع ہو چکی ہیں: (۱) رسائل قصوف، پانچ حصے (مکتبہ ۱۹۱۵ء)؛ (۲) حید کی نالی (مکتبہ ۱۹۱۵ء)؛ (۳) سعی عمل (نقش) (الکتاب ۱۹۲۲ء)؛ (۴) مختصر سوانح عمری حضرت حاجی وارث علی شاہ (مکتبہ ۱۹۳۳ء)؛ (۵) فردوس معانی (پبلک لیا) (مکتبہ ۱۹۲۶ء)؛ (۶) رہنماے شاعری حصہ اول (مکتبہ ۱۹۲۶ء)؛ (۷) نظر گاہ (دوسرا انتخابی دیوان) (مکتبہ ۱۹۶۱ء)؛ (۸) رہنماے شاعری حصہ دوم (مکتبہ ۱۹۶۶ء) ان میں سے دو کتابوں بنر ۳ اور ۷ پر حکومت کی طرف سے پانچ پانچ سو روپیہ انعام عطا ہوئے۔ ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ بڑا ہے جس سے ایک مجلد تیار ہو سکتا ہے (نظارہ) اس کے شائع ہونے کا امکان اب کم ہی ہے۔ اور جو انھوں نے مضعف کی تقلید میں شاعری اور دوستوں میں تعظیم کر دیا، اس کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے!

انقرہ کو زبان و بیان و عروض پر ماہر نہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ملک کے مختلف حصوں میں موجود ہے جن کی بدولت ان کا نام روشن رہیگا۔ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر سلام سندیلوی بھی ان کے شاگرد ہیں۔

جسمانی اولاد میں صرف ایک صاحبزادہ محشر سولہ تھی۔ وہ طب کے فارغ التحصیل تھے اور طبیب کی حیثیت ہی سے لازم ہو گئے تھے۔ ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ انقرہ اس دہانے میں حج کو گئے ہوئے تھے، وہ ان کی غیر حاضر ی میں فوت ہوئے۔ ماشاء اللہ ان کی اولاد موجود ہے۔ ان کے علاوہ دو لڑکیاں شادی شدہ اپنے گھروں والی موجود ہیں۔ کچھ کلام بطور نمونہ دیکھیے:

وہ کیوں جانے لگا دیر و دم کی ٹھوکر پی کھانے سے انقرہ کو میرے سیکڑے پر ناز ہو ساقی!

یکتا فی جہاں کی اللہ سے دستیں      سو جلوے ہیں بطرف دیگر، کچھ نہ پا چھے  
 بھی کو جو یاں جلوہ سرا نہ دیکھا      برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا  
 معاذ اللہ نزاع دیرو کبسر      بھگد اللہ در میخان آ یا!  
 موت کے ڈر سے کانپنے والے      موت ہی حاصل حیات نہ ہو  
 ہو کر م میں نہاں ستم نہ کہیں!      اتنا ممنون التفات نہ ہو  
 لے بس آؤں جائیں چھوڑیں خدوں کو      نہ قہ بات والے، نہ ہم بات والے  
 وہ ہونگے جہاں صبح کی بات ہوگی      جہاں ہونگے ہم، رات ہی بات ہوگی  
 جو کچھ چار تنگوں کو ہم جانتے ہیں      وہ گلچیں و صیاد کم جانتے ہیں  
 دل غنی ہے، تو مفلسی کیا ہے      گھر میں اللہ کے کئی کیا ہے  
 یوں تو تمام رات تراپتے کٹی، سگر      گوری جو دل پر دقت بھر کچھ نہ پا چھے  
 اس کی دنیا کا عالم نہ پوچھو      جس کی دنیا تمہاری نظر ہے  
 کسی نے نہ پہچانا ان کو اسی سے      ہزاروں تھے جلوے، اگر ایک کیا ہے  
 ہے مقصود ویر و حیرم ایک لیکن      وہ کافر نے، جو کبے شیخ جی سے  
 ہرگز ان کا وحش داستان کچھ اور جھٹا ہو      نہیں ہوتا جہاں کوئی دہاں کچھ اور کھٹا ہو  
 سب کچھ بڑا اور کچھ نہیں ساں تھے بغیر      دنیا ہے ایک خواب پریشاں تھے بغیر  
 شکل نہیں ہے کوئی بھی بتے ہوئے جسے      شکل نہیں ہو کوئی بھی آساں تھے بغیر  
 جینا ہی کچھ حال نہ تھا تیرے، ہجر میں      مرنے بھی اپنا اب نہیں آساں تھے بغیر  
 جوتا گیا حضور کی جاناں سے دور تر      وہ جو کشاکش حق و باطل میں رہ گیا  
 گہر میں کو، تو کافر کو مسلمان کرے      جس کو جو چاہے وہ غار کجگرایاں کرے  
 اللہ کی تقدیر کی ناکامی پیہم      یوں بٹیا ہوں اب جیسے کوئی کام نہیں  
 سنی تو اس نے غیروں سے ہوا کو بگیاں ہم      بہر صورت رہی بہتر ساری داستان ہم



تجلی جس جاتاں کی نہیں موتوں امین پر جہاں محسوس کرتا ہوں وہ میں معلوم ہوتی ہو  
 فکرو نیا، فکر عقیقی، فکر حق، فکر سخن جادوئے کی زندگی، افکار ہے، کیا کیا کھیے  
 خفا وہ ہیں اجل و قحطی پڑا دل بیتاب یہاں خطر اٹھائے کب تک ایسی زندگی کی سختیاں تھی  
 اس کی نہیں خدائی کہ اس کا خدا نہیں تم جس کو مل گئے، اسے بھر کیا ملا نہیں  
 تھے بلب سا غرور دست و دم بسر لغزش بیجا میکہ سے جو بھی نکلا، میکہ ہر دوش تھا  
 میں کہو نگاہ پریشانی بے خاطر، نا صبح! اور اس نے جو مرا حال پریشاں دیکھا؟  
 دامن کا چاک، عجیب کا چاک، آستین کا چاک سب مل گئے ہیں جاگ بگیاں کے آسٹریس  
 گھٹتے ہیں جناب شیخ جب سچا لے سے ہو کر نہیں بچتے زباں سے کچھ گراں دیکھتے ہیں  
 جبین شوق، بد بھد سے میں اچنی کو بھقت ہر ایک تلاش قدم، نفس پاسے یار نہیں  
 نقارے و دے کا ہولا کہ اعتبار، مگر وہ کیا کہے، جسے صمت پر اعتبار نہیں  
 دلکش یوں ہی تھی میری جنت کی داستان دنیا کا اس پر حسن بیاں، کچھ نہ پوچھے  
 افقر کو اس کے حال پر رہنے بھی دیجیے بس جان کر خواب جہاں، کچھ نہ پوچھے  
 خدا رکھے، غضب کی دلکشی دنیا میں ہو، فقر! جو کھلیگا، وہ دے کہ جان اس محفل سے کھلیگا  
 میں کہے کو ترے کچھ راہد کہتا نہیں بس یہ کہتا ہوں

ہوتے ہوئے ان کی چو کھٹک سزا وہ کہیں خم کوئی کرے  
 مل جاتا ہے جو راہ میں کوئی عراب عشق کو اس کا چھیرہ دیتے ہیں پہڑوں اسی سے ہم  
 جناب شیخ نہ فرمائیں کچھ یہاں، فقر! یہ میکہ ہے، بشارت کی خانقاہ نہیں

## سید عبد اللطیف (ڈاکٹر)

ڈاکٹر سید عبد اللطیف بروز جمعہ ۶ صفر ۱۳۰۹ھ (۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء) کو کرنول (تامل ناڈو) میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت تک پہنچتا ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ جہانیاں جہاں گشت اثنا عشری امام دہم حضرت علی نقی (ت ۲۵۴ھ) سے دسویں پشت میں تھے، لیکن فرشتہ سے قبل کی کسی تاریخ یا تذکرے میں اس کا ذکر نہیں ملتا، نہ خود جہانیاں جہاں گشت کے ملفوظات ہی میں کوئی اس طرح کا دعویٰ ہے۔ بعد کے مصنفوں نے فرشتہ کی تقلید کی ہے، لیکن ہر جگہ درمیانی کڑیوں کے ناموں میں اور سلسلے میں کچھ نہ کچھ اختلاف ملتے ہیں۔ اس خاندان کے جو فروع سب سے پہلے ہزارستان آئے، وہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے دادا سید جلال الدین حسین سرخ بخاری ابن سید علی ابوالموید تھے۔ وہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں بخارا سے ہجرت آئے۔ یہاں سے ملتان پہنچے اور حضرت شیخ بہار الدین زکریا سے علوم باطنی کی تکمیل کی۔ ملتان سے اوچے گئے، جو بہار پور سے ۳۸ میل دور دریائے ستلج اور جناب کے سنگم پر ایک مختصر ماقصبہ ہے۔ یہ کسی زمانے

میں بڑا علمی مرکز رہا ہے۔ سید جلال سرخ بخاری کا ۹۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۱ء میں انتقال ہوا۔ وہ اچھری میں مدفون ہیں۔

خندوم جہانیاں جہان گشت بن سید احمد کبیر بن سید جلال سرخ بخاری کے حالات سے اپنی دل کے سینے روشن ہیں۔ وہ صاحبِ علم و قلم اور برگزیدہ صوفی تھے۔ ان کا بصرہ، سال چہار شنبہ ۱۰ ذی الحجہ ۸۵۷ھ (۲۳ ذی قعدہ ۱۲۳۸ء) کو اچھری میں انتقال ہوا اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

اس خاندان نے ہر دور میں صوفیہ کو اہم اور اعلیٰ عظام پیدا کیے ہیں۔ ان کی ایک شاخ کو نول میں ملت ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف اسی کو نول خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شاہ حسین اگھینی وہاں کے مشہور عالم و صوفی تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء میں کو نول میں رحلت کی اور خاندانی ہڑواڑ میں اپنے جدِ اعلیٰ حضرت شاہ عبداللطیف قادری عارف یا ہوپادشاہ (د ۱۶۷۹ء) کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ ان کی عمر کے بارہویں سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ مقامی الٰہی سکول میں بھیج دیے گئے، یہاں سے ۱۹۱۰ء میں دسویں درجے کی سند لی۔ اس سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لیے مداس کو چھین کالج میں داخلہ لیا، یہاں سے ۱۹۱۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہاں ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔ ان کے والد سید شاہ حسین ان کے کو چھین کالج میں داخلے کے خلاف تھے۔ وہ ٹھہرے پرانی وضع کے ذریعہ آدمی انھیں اندیشہ ہوا کہ بڑا زیادہ انگریزی پڑھ کر گمراہ اور بیدین ہو جائیگا۔ لیکن سید عبداللطیف نے یہ برجستہ جواب دے کر انھیں قائل کر دیا کہ اباجان، میں تو انگریز اس لیے سکھینا چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعے سے قرآن اور اسلام کی مقدس تعلیمات کو مغربی ممالک میں عام کر سکوں۔ انھوں نے بچپن کے اس وعدے کو آخر میں پورا

کر دکھایا۔ کالج میں ان کا خاص مضمون اصول تنقید ادبیات اور تاریخی تنقید ادبیات انگریزی تھا اور اس میں وہ اس سال کے کامیاب طلبہ میں سے اول آئے تھے۔

اس زمانے میں ذاب بگین پٹی کے بھائی میرا سید علی خان مرکزی مجلس و اضح قوانین کے رکن تھے۔ ان کی وساطت سے سید عبداللطیف صاحب، سید ذاب علی چودھری سے ملے اور ان کے ذاتی سکرٹری مقرر ہو گئے۔ چونکہ سید ذاب علی بھی مجلس مذکورہ کے رکن تھے، اس سے ان کا قیام اکثر دلی میں رہتا تھا اور ان کے ہاں ملک کے علماء کی آمد و رفت تھی۔ اس طرح سید عبداللطیف کا ان سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں سربراہیم رحمت اللہ (بھٹی) تھے۔ وہ ان کی قابلیت اور انگریزی میں مہارت سے خاص طور پر بہت متاثر ہوئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چند برس بعد جب انھوں نے بھٹی کے مضامین میں پنج گنی کے پہاڑی مقام پر متول طبقے کے طلبہ کے لیے ایک پبلک اسکول قائم کیا، تو انھوں نے اس کی پرنسپل کے لیے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دی۔ وہ دہاں دو برس تک رہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا تو وہ ۱۹۲۰ء میں یہاں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ایک اسکیم تیار ہوئی کہ یونیورسٹی کے مختلف مضامین کے جارج اسٹنٹ پروفیسروں کو مزید تعلیم کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ ہر ایک کو تین سال کی تعلیمی مدت دی جائے، جس کے دوران میں انھیں نصف تنخواہ ملے گی، مزید براں ہر ایک کو خرچہ کے لیے تیس ہزار روپیہ خرچ بھی دیا جائے، جس پر ان سے سود نہیں لیا جائیگا۔ انگریزی کے شعبے سے ڈاکٹر سید عبداللطیف کے بھیجنے کا فیصلہ ہوا اور ان کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم اور پروفیسر وحید الرحمن کا انتخاب ہوا تھا، خیال تھا کہ یہ فی اسے آنر (انگریزی) میں، انٹرنیشنل یہ پیش آئی کہ ریاست کے نمائندہ مقیم انگلستان نے اطلاع دی

کہ تاہم جیکبیں پُر چرچکی تھیں، لہذا اس سال داخلہ ممکن نہیں، اگلے برس یعنی ۱۹۲۲ء میں داخلہ ہو سکیگا۔ ان ایام میں ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار سید شاہ حسین حسینی بہت سخت بیمار تھے اور حالت تشویش تک تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ ولایت کلاں خٹل ایک برس کے لیے ملتوی ہو گیا ہے، تو باپ کی کا اظہارِ تردد کفار، انھوں نے اطمینان کی سانس لی کہ جلد، بلاتلے۔۔۔ اب میں ٹیکوٹی سے والد کی خدمت اور تیار داری کو سکوٹھ جاؤں۔ لیکن جب ان کے والد کو صورتِ حال کی اطلاع ملی، تو انھوں نے سخت مخالفت کی اور اصرار کیا کہ یہ موقع اتنے سے نہیں دینا چاہیے۔ تم انگلستان جاؤ اور لندن یا آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے اصحابِ مجاز سے ملو، وہ لازماً تمھارے داخلے کی کوئی نہ کوئی تسلیل کمال یسکے، اور انھوں نے مزید یہ کہا کہ بیفکر ہو، تمھاری داسی تک مجھے موت نہیں آسکی۔ اس حکم کے آگے انھیں تسلیمِ غم کرنا پڑا، اور یہ انگلستان چلے گئے۔

انگلستان میں وہ گنگو کالج (لندن یونیورسٹی) کے صدر شعبہ انگریزی پروفیسر راز داہیل گولانز کے سامنے پیش ہوئے۔ سر راز داہیل اور ان کے ساتھی پروفیسر عبداللطیف صاحب کی انگریزی میں مہارت اور انگریزی ادب پر عبور سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے پوچھا: آپ ہی اسے (آرژ) میں داخلے کی جگہ ایم اے یا پی ایچ ڈی کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے؟ بھلا انھیں کیا اندر ہو سکتا تھا! چنانچہ براہِ راست پی ایچ ڈی کی تیاری کرنے لگے۔ مقالے کا موضوع قرار پایا: انگریزی ادب کے اخراجات اور ادب پر راز اس کی تیاری اور پیش کرنے کی معادیتیں برس مقرر ہوئی۔ یہ ۱۹۲۲ء کے شروع کی بات ہے۔

۱۹۲۳ء کے وسط میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی نے انگلستان اور امریکا کی یونیورسٹیوں کے انگریزی کے پروفیسروں کی پہلی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں شمولیت کے لیے انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں نے اپنا ایک ایک نمائندہ بھیجا، لیکن لندن

یونیورسٹی نے سر رابرٹ گولڈنر کی سفارش پر دو نمائندے بھیجنے کی منظوری دی: ایک وہ خود اور دوسرے سید عبداللطیف، حال آنکہ وہ ہنوز صرف دسیرج اسکا لکھے اور ہر دفعہ نہیں ہتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سر رابرٹ گولڈنر کے دل میں ان کی کتنی وقعت تھی، اور وہ ان کی قابلیت کے کس درجہ قائل تھے۔ اسی سفر میں انھوں نے ہارورڈ اور ہیل یونیورسٹیوں کا امریکا میں اور میک گل کالج کینیڈا میں دورہ کیا۔

امریکا سے واپسی پر سر رابرٹ گولڈنر نے ان سے کہا کہ آپ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں؟ تین سال کی قید تو عام حالات میں ہے۔ مقالے کے لیے آپ کا سوا چھ ہجڑا تو آپ اسے بچا کر کے قلبہ کر دیجیے، ہم آپ کا مقالہ دو ہی سال میں پڑھنے کو تیار ہیں اس پر انھوں نے وہ جینے کی رخصت لی اور شمالی کاسٹ لینڈ کے شہر سٹریٹفیلڈ چلے گئے۔ وہاں ٹیچر کرائیوں نے ایک مختصر نویس کی مدد سے مقالہ مکمل کیا اور لندن واپس آکر اسے پیش کر دیا۔ لیکن سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کا نوڈکیشن کا داغہ ابھی دور تھا۔ بارے سر رابرٹ گولڈنر کی وساطت اور اثر و رسوخ سے یہ اہم عملی سر ہو گئی: ایک غیر معمولی کا نوڈکیشن کا انتظام کیا گیا جس میں انھیں سند عطا کی گئی (۱۹۲۴ء)۔ یوں یہ تین برس کی جگہ دو ہی برس میں اپنا کام مکمل کر کے حیدرآباد واپس پہنچ گئے۔

جب یہ انگلستان گئے ہیں تو یونیورسٹی نے ان سے بھی ایک معاہدے پر دستخط کرائے تھے کہ واپس پر یہ کم از کم دس برس تک یونیورسٹی کی ملازمت کرینگے، نیز ان کی خواہ کا ایک حصہ قرضیں مبرا کرنے کو کاٹا جائیگا۔ چنانچہ وہ اب حیدرآباد پہنچے تو یہاں ۵۰۰-۱۰۰۰ روپے کے گریڈ میں ہر دفعہ مقرر ہو گئے۔ جونہی دس برس پورے ہوئے انھوں نے دسوا دی کہ مجھے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ انھوں نے بھلا کہ میرا ارادہ مزید ملازمت کرنے کا نہیں ہیں کیونکہ سے کچھ علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری صوفیائی درخواست پر کونشن کم از کم اتنی ضرور ہو کہ شریفانہ سہراوقات کے لیے کفایت ہو سکے، تاکہ معاش کی تنہائی

میرے علمی کام کے، جسے میں سائل نہ ہو۔ ریورسٹی کے اصحاب مجاز نے یہ درخواست منظور کر لی۔ اولاً انھوں نے پوری خواہ پر ایک سال کی رخصت منظور کی؛ پھر ملازمت کھڑے ہونے میں پانچ برس کا اضافہ کیا، تاکہ ٹین کی رقم کچھ بڑھ جائے۔ لیکن اس سے بھی بچش و ڈھکا سوا لہ سے تجاوز نہیں ہو سکتی تھی۔ جب یہ حالات نظام مرحوم میر عثمان علی خان دکن (فروری ۱۹۶۷ء) کے علم میں آئے، تو انھوں نے حکم دیا کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا ملازمت سے دست بردار ہونے سے مدعا خدست علم ہے، اس کی تصدیق کرنا چاہیے۔ پس ان کے لیے پوری پانچ سو ماہ کی پیشی منظور کی جاتی ہے (جو عام حالات میں پچیس سال ملازمت کے اختتام پر دی جاتی ہے)۔

ترک ملازمت کے بعد ۱۹۶۷ء میں انھوں نے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار نیوا ایرا (عصر نو) جاری کیا۔ اور اس زمانے میں نظام دکن ادا ان کی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیں اور حیدرآباد میں اصطلاحات نافذ کریں، جس سے لوگوں کو ریاست کے نظم و نسق میں شریک کیا جاسکے۔ ۱۹۶۷ء میں نظام کو یہ مشورہ کوئی مرد قلندر ہی دے سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سب ان کے غلوں کے قائل تھے، اس لیے اگرچہ کسی نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا، لیکن ان سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوئی۔

ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی کچھ کم اہم نہیں تھیں، اگرچہ وہ رہیں بحیرہ ہنس اور نظریاتی سطح پر کیونکہ انھوں نے عملی سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ چوتھے دہے میں ہماری سیاسی فضا بڑی سبجان خیر تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ملک کی آزادی کے لیے اصرار کر رہے تھے، لیکن جس بات پر دونوں متفق نہیں تھے، وہ تھیں مسئلہ انگریزوں سے غلطی کے بعد ملک کا دستور کیا ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بھی اس مسئلے پر دو در سالے (انگریزی میں) قلمبند کیے تھے: (۱) مسلم کلچر اینڈ ادا ہندستان میں اسلامی کلچر، اور (۲) ڈفرنٹ کلچرل زندگی اینڈ ادا ہندستان میں مختلف کلچری خطے، انھوں نے

ان رسالوں میں جو نظریہ پیش کیا تھا، بعد کو اسے ایک باقاعدہ اسکیم کی شکل دے دی جس کی مدد سے ہندوستان کا دستور وفاق قرار پانا تھا۔ ہر ایک وفاقی خطے کے لیے پوری اندرونی آزادی کی سفارش تھی، مگر حکومت میں صرف دفاع، امور خارجہ، تجارت و درآمد و برآمد و مواصلات کے اہم ذرائع رکھے گئے تھے، غیر محبوب اختیارات بھی وفاقی سطحوں کو تفویض کیے گئے تھے۔ اس سے وہ مسلم لیگ کے حلقوں میں بھی خاصے مزوت و مقبول ہو گئے۔ بلکہ جناح صاحب ان پر بہت اعتماد کو نہ لگے۔ مسلم لیگ نے کسی زمانے میں عبداللہ ارون کی صدارت میں ایک فائن کمیٹی بنائی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے نظریے کے مطابق پاکستان اسکیم کا ایک خاکہ وضع کیا جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی اس کمیٹی کے مکن تھے دوسرے اراکین غلام رسول، مرزا رضوان اللہ، ڈاکٹر افضل حسین قادری، پیر علی محمد راشدی تھے،

اپنی وفاقی اسکیم سے متعلق ان کی فریقین کے ذمہ سے خط و کتابت رہی۔ بالآخر گاندھی جی نے سرسرو جی نائیڈو کی وساطت سے انھیں یہی آنے والی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین سے ملنے کی دعوت دی۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ اس پر یہ بھی پہنچے اور کانگریس کے لیڈروں سے ملے۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے شب ۸ اگست کے جس جلسے میں ہندوستان چھوڑ دو کی قرارداد منظور کی تھی (اور جس کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد نے عبادی خاطر کے پہلے ہی خط میں کیا ہے)، ڈاکٹر سید عبداللطیف نہ صرف اس میں موجود تھے، بلکہ دوسرے لیڈروں کے ساتھ شہنشین پر بھیٹے تھے۔ آدمی رات کے بعد علی الصباح یہ سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور انھیں مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا گیا۔ اگر مسلم لیگ چاہتی تو اب بھی گفت و شنید کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن سر جناح (دستبر ۸ ستمبر ۱۹۴۷ء) نے جو یہ فیصلہ کیا، ڈاکٹر سید عبداللطیف اس سے اتنے دل گرفتہ ہوئے کہ انھوں نے اس کے بعد نظریاتی اور ذہنی سطح پر بھی کل ہند سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب انھوں نے اپنی تمام



تو جہ حیدر آباد کے مسائل پر مرکوز کر دی، اسی مقصد سے انھوں نے اپریل ۱۹۴۶ء میں ایک اور انگریزی ہفتہ وار کلیئر (Clarion) نام کا نکالا۔ یہ پرنٹیں برس تک جاری رہا۔ اس کے آخری شمارے پر ۱۱ مئی ۱۹۴۸ء کی تادم خبثت ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مجلس اتحاد المسلمین اور مولوی قاسم رضوی (دفعہ ۱۹۷۰ء) کی عاقبت نااندیشی کے باعث حیدر آباد کی فضا بہت کدو ہو رہی تھی۔ وہی یہی کس طرح علی (دفعہ ۱۹۷۱ء) کی وزارت عظمیٰ نے پوری کر دی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے پوری کوشش کی کہ کس طرح حیدر آباد کے قاعدوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ جب رستے پر جہاد ہے، وہ تباہی کے غار کی طرف جاتا ہے جس سے ریاست حیدر آباد اور نظام و کن دونوں لمبا بیٹ ہو جائیگے۔ لیکن رضوی نقار خانے میں لطیفی طوطی کی صدا کسی نے نہ سنی۔ نتیجہ ہم سب کو معلوم ہے، اور اسی کی جگہ کوئی انھوں نے کلیر کے آخری شمارے کے ادارے میں کی تھی۔

حیدر آباد کے انضمام کے بعد وہ اتنے دل برداشتہ تھے کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے جانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک لطیفہ خیزی کے نتیجے میں انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ بہر حال کچھ دن سکون اور آرام کے لیے پانچ گنی چلے گئے۔ دہاں سے واپس حیدر آباد آئے، تو ان کے وطن کو زل سے ایک دفعہ پہنچا کہ وہ آئیں اور عثمانیہ کالج، کونول کی پرنسپل سبھا لیں۔ اس کالج کے قیام میں خود ان کی مساعی بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں یہاں کا انتظام بہتر تھا اور مظہرین کو اندیشہ ہونے لگا تھا کہ چشم بد دور کالج بند ہو جائیگا۔ دفعہ کے اراکین ان کے ملنے والے تھے اور مقصد نیک، ان کے اصرار کے سامنے انھیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ وہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک دو برس اس کالج کے پرنسپل رہے۔ جب ایک معقول جانشین کا انتظام ہو گیا، تو مستعفی ہو کر حیدر آباد چلے آئے۔ ۱۹۵۲ء میں کونول سے واپسی کے بعد انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمائش پر

انسٹی ٹیوٹ آف انڈیولوجی اسٹڈیز اور اکیڈمی آف اسلامک سٹڈیز کی بنا رکھی۔ مولانا آزاد کی وساطت اور سفارش پر انھیں اس کام کے لیے م کوئی اور آمد پر ویش حکومت نے مالی امداد بھی دی۔ ان دونوں اداروں کی طرف سے تقریباً سہ ماہی میں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد وہ مولانا آزاد کے بہت قریب آ گئے، اگرچہ وہ انھیں آزادی ملک سے بہت پہلے سے بھی طرح جانتے تھے۔ مولانا آزاد نے ان سے فرمائش کی کہ وہ ان کے شاہکار ترجمان القرآن کا ترجمہ انگریزی میں کر دیں، اور اس کے لیے انھیں دعوت دی کہ وہ ان کے پاس آ کر وہی میں قیام کریں۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء سے مولانا آزاد کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) تک ان کا مشترکہ زمانہ مولانا آزاد کے ساتھ بسر ہوا۔ جس دن مولانا کی رحلت ہوئی ہے، وہ یہیں کوٹھی میں موجود تھے۔

میری ان سے پہلی ملاقات مولانا آزاد ہی کے وہاں ہوئی۔ میں ۱۹۵۴ء میں مصر سے آیا، تو حسب معمول مولانا کی خدمت میں بھی سلام کو حاضر ہوا۔ مجھے اس بات کا فرض حاصل ہے کہ وہ خود دہیسنے دوسرے یاد فرما سکتے تھے۔ ان کے سکریٹری محمد اہل خان مرحوم مجھے ٹیلیفون سے مطلع کر دیتے کہ کل صبح آجائے، وقت دہی فجر سے پہلے کا ہوتا۔ میں پہنچ جاتا اور وہ تین گھنٹے مختلف موضوعات پر خوب گپ دیتی۔ بالعموم ناشتے کے بعد میں اجازت لیتا کہ اب ان کی دوسری شخصیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دن رخصت ہو رہا تھا، مولانا آزاد میرے ساتھ کمرے کے دروازے تک آئے۔ دروازہ کھولا، تو سامنے سے ڈاکٹر صاحب گھر رہے تھے۔ انھوں نے مولانا کو سلام کیا۔ اس پر مولانا نے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ اکلہ دام صاحب کو کو جانتے ہونگے! انھوں نے جواب نفی میں دیا۔ مولانا نے تعارف کرایا اور وہ اس کمرے میں چلے گئے، اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آ گئے۔ اس کے بعد ان سے بہت ملاقاتیں رہیں۔

ایک دن کہنے لگے: میں تو خود آپ کی تلاش میں تھا۔ بات یہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب 'عورت اور اسلامی تعلیم' کا انگریزی ترجمہ اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کر دوں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا! میں نے ہامی بھری۔ اس پر انھوں نے جناب عبدالعلی سے اس کا ترجمہ کروایا اور 'دوسرا ان اسلام' کے عنوان سے اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کر دیا (حیدر آباد ۱۹۵۹ء)۔ ان سے آخری ملاقات مارچ ۱۹۶۹ء کے ادائیں میں ان کے مکان پر حیدر آباد میں ہوئی۔ میں غالب صدی تقریبات میں شرکت کے لیے جناب عابد علی خان کا بلایا ہوا گیا تھا۔ اگرچہ قیام بچہ مختصر صرف دو ہی دن کا تھا، لیکن نامکمل تھا کہ بن لے چلا آتا۔ چنانچہ ایک دست کے ہمارے حاضر ہوا۔ دیر تک اوڑھ اوڑھ کر باتیں ہوتی رہیں، اس موقع پر ایک لطیفہ ہو گیا: جلتے کیسے دکن کی تو سوں کا ڈو کھر ہو گیا۔ میں نے کہا یہ لوگ تو انا ڈی ہیں۔ وہ زرا چونکے اور دریافت کیا کہ کیا مطلب؟ میں نے عرض کیا کہ جب آریہ لوگ یہاں آئے تو انھوں نے یہاں کی غیر آریہ اقوام کو ان - آریہ، کہنا شروع کیا، جس سے رفتہ رفتہ لفظ ناپرادہ نیر بنے۔ اردو دانوں نے اسی کو جگاڈ کو انا ڈی بنایا اور معنی اس کے ہوئے، وہ شخص جو کسی خاص فن میں طاق نہ ہو۔ منہس پڑے اور کہا آپ کی اچانک کی داد دیتا ہوں، لیکن خیال رکھیے، کوئی سن نہ لے۔

افسوس کہ مولانا آزاد کی زندگی میں وہ ترجمان القرآن کا ترجمہ مکمل نہ کر سکے۔ تفسیر سورہ فاتحہ اور البقرہ کے متن اور حواشی کا ترجمہ وہ کو چکے تھے کہ مولانا بیل بے۔ یہ حصہ انھوں نے دیکھ لیا تھا اور اس پر مباد کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کام اس کے بعد بھی جاری رکھا اور اسے ۱۹۶۱ء میں تین جلدوں میں مکمل کر لیا۔ ان میں سے دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور تیسری زیر طبع ہے۔

ترجمان القرآن صرف چھ دیباچوں کے ترجمے اور تفسیری حواشی پر مشتمل ہے! مولانا سے

مکمل کو ہی نہیں سکے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب اسے انگریزی میں منتقل کر رہے تھے، تو انھیں اپنا وہ وعدہ یاد آیا جو انھوں نے تعلیم کے آغاز میں اپنے والد سے کیا تھا۔ اس پر انھوں نے عزم کر لیا کہ جس طرح کبھی ہو پورے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر دینا چاہیے۔ ان کے ہندوستانی اور یورپی دوستوں نے بھی ان سے اس کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس پر بقیہ ۱۲ پاروں کے متن کے ترجمے کا اسناد کیا اور اسے بھی شائع کر دیا۔ نتیجے میں ان کا اصول یہ تھا کہ اصلی متن کی روح نمایاں ہو، نہ کہ محض مرادف الفاظ دکھ دیے جائیں۔ ان کا ترجمہ سب کے سامنے ہے اور صاحب نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کہاں تک اس میں کامیاب رہے ہیں۔

ادرجن کیوں کا ذکر ہوا ہے، ان کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مکمل فہرست درج ذیل ہے۔

1. The Influence of English Literature on Urdu Literature (1934)
2. Ghaliib - A Critical Appreciation of His Life & Urdu Poetry (1937)
3. The Muslim Culture in India (1932)
4. The Muslim Problem in India (1939)
5. The Pakistan Issue - Plan of Federal Constitution of India. Congress-League reaction and Press statements (1943)
6. The Cultural Basis of a New World Order (1937)
7. An Outline of The Cultural History of India - edited and compiled (1958)
8. Address on National Integration (1967)
9. Language and National Integration (1968)
10. The Concept of Society in Islam (1937)
11. Prayers of the Prophet (1937)
12. Towards Reorientation of Islamic Thought - A fresh examination of the Hadith Literature (1954)
13. Basic Concept of the Quran (1958)
14. Bases of Islamic Culture (1959)

15. Madras University Lectures :  
Principles of Islamic Culture (1961)
16. Was the Prophet of Islam Unlettered ? (1964)
17. The Problem of Islamic Studies in Indian Universities (1964)
18. The Call of the Quran (1966)
19. Faith and Action — The Quranic View (1967)
20. The Unity of Man — The Quranic View (1968)
21. Tarjuman-al-Quran of Mawlana Abul Kalam Azad—a rendering into English in three volumes Vol. I (1962), Vol II (1967), Vol. III under print)
22. Al-Quran rendered into English (1969)
23. The Mind Al-Quran Builds (1952) Revised edition (1971)

اردو دان حلقوں میں ان کا نام اس مختصر کتابچے کی وجہ سے زندہ رہ گیا، جو انھوں نے غالب کے عنوان سے انگریزی میں لکھا تھا (حمید آباد ۱۹۳۷ء) بعد کو اس کا سیدنا لدین قریشی لکایا جو اردو ترجمہ بھی شائع ہوا (حمید آباد ۱۹۳۷ء)۔ یہ صحیح معنی میں مطالعہ غالب کے سلسلے میں انقلابی مضمون ثابت ہوا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ غالب پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اردو میں غیر جانبدارانہ اور معروضی تنقید کا یوں بھی فقدان تھا اور برہمنی سے اب تک ہے، اور غالب سے متعلق مبالغہ آمیز خیالات تو ہمارے ذہنوں پر بطور تسلط تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بخوری (دسمبر ۱۹۷۱ء) نے اس سلسلے میں کچھ ایسے بلند بانگ دعوایں کیں تھیں کہ جو سمجھے وہ بھی اور جو نہ سمجھے وہ بھی گنگ ہنوز رہ گئے۔ ڈاکٹر بخوری کے مطالعے اور وسعت نظر اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی ذہانت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ ”محاسن کلام غالب“ میں انھوں نے غالب سے زیادہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس مضمون پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکے تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جیتے رہتے تو ان میں توازن آجاتا اور وہ غالب کی حقیقی عظمت پر بھرپور دیکھتے اور اسے ہم سے قابز قبول

طریقے پر روشناس کراتے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ڈاکٹر لطیف نے اپنی مختصر کتاب 'غالب' میں اسی افراط و تفریط میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی دوسری اہم کوشش غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب دینے کی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے سر اکر حیدری کی دہشت سے نسخہ حمید یہ کی اصل میں نسخہ بھوپال حاصل کیا اور پورے کلام کو مرتب کوکے چھاپنا شروع کر دیا۔ اس کے ۲۶ صفحات تک چھپ چکے تھے کہ اس مطبع میں جہاں یہ چھپ رہا تھا، آگ لگ گئی اور مطبوعہ کا غذات اور ان کا تیار کردہ اصل سودہ بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ وہ کہتے تھے کہ اس انوسنگ حادثے کے بعد دوبارہ اسے مرتب کرنے کی مجھ میں سمیت نہیں تھی! یوں یہ مفید کام ادھور رہ گیا۔ خوش قسمتی سے مطبوعہ جسے کے فرے کھی طرح تکمیل کاغذی مرحوم دت ۱۹۶۱ء کے ہاتھ لگ گئے تھے جو انھوں نے مولانا ناتیا علی خان عرشی کو بھیج دیے اور انھوں نے دیوان کا نسخہ عرشی مرتب کرتے وقت ان سے استفادہ کیا۔ بہر حال الفضل المتقدم کے اصول کے مطابق ڈاکٹر لطیف ہمارے شکر کیے کے مستحق ہیں کہ دیوان کی تاریخی ترتیب کا خیال سب سے پہلے ان کے ذہن میں آیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کے اصول مرتب کر دیے، جس سے ان کے پسروں کو روشنی ملی اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

ان کی ان ہی علمی خدمات کے اعتراف میں ابھی پارسال یوم جمہوریہ (۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء) کے موقع پر حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔

پانچ چار سال سے ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ پہلے آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ بائیں آنکھ پر عمل جراحی کوایا جو بد قسمتی سے ناکام رہا اور آنکھ بالکل بیکار ہو کر رہ گئی۔ دوسری کی بینائی بھی بہت کم تھی اور وہ مدد کے بغیر چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کمی نہیں کی۔ قرآن کا ترجمہ انھوں نے اسی زمانے میں

کمل کیا۔ پہلے اٹھارہ پاروں کے متن کا ترجمہ تو ترجمان القرآن کے ساتھ پورا ہو ہی چکا تھا، اب تکمیل کے لیے باقی بارہ پاروں کا ترجمہ درکار تھا۔ وہ عربی نہیں جانتے تھے انگریز اس کے حوت خناس مزدور تھے۔ انھوں نے طریقہ کار یہ اختیار کیا کہ تین چار معادوں ساتھ لیے۔ ایک قرآن کی آیت پڑھتا، دوسرا اس کے مختلف ترجمے (اردو، فارسی، انگریزی) پڑھتا، کبھی کبھی وضاحت کے لیے بعض اہم تفسیروں کا معلقہ حصہ بھی پڑھا جاتا۔ اس کے بعد وہ اپنا ترجمہ لکھوا دیتے، جوان کے نزدیک اصل کی روح کے قریب ترین تھا۔ وہ ترجمے سے زیادہ ترجمانی کے قائل تھے۔ ان کو کوئی موجودہ ترجمہ یا ترکیب ان کے معیار پر پوری اترتی تو انھیں ان معنوں کو لفظ بلفظ اپنے ہاں لے لینے میں بھی عار نہیں تھی۔ ان کے نزدیک اصل مقصود یہ تھا کہ ایک اوسط درجے کے قاری کی سمجھ میں آجائے کہ قرآن کیا کہتا چاہتا ہے۔

پچھلے سال ڈیڑھ سالے انھیں حلقے کے کینسر کی شکایت تھی۔ علاج معالجہ ہوا، لیکن میوڈ؛ اب خوراک تک گٹھے سے نہیں اترتی تھی۔ یہاں چیزوں پر کوئی کہاں تک جی سکتا ہو۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب آخری مرحلہ بہت دور نہیں ہے، تو پھر ماہ قبل انھوں نے کوئٹہ میں اپنے جبر علی حضرت سید عبداللطیف یاہو پادشاہ کے مزار کے جوار میں اپنی قبر کھدوائی۔ گسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی ساری عمر حیدر آباد میں بسر ہوئی، یہاں کے بھی آپ پر حقوق ہیں، آپ لے کوئٹہ کو حیدر آباد پر ترجیح کیوں دی، تو جواب میں یہ شعر پڑھا:

ما بفلک امانہ ایم، یا رب ملک بودہ ایم  
باد آبخا سیر ویم خواجہ کو آں شہر است

اپنی بیماری کے آخری ایام میں وفات سے کوئی ایک مہینہ پہلے انھوں نے ڈاکٹر سید عبداللطیف قرآنک انیڈانڈ کچلر اسٹڈیز ٹرسٹ کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم

کیا، جس میں صرف یہ تین چار سطر ہیں،

ملکہ ڈاکٹر سید عبداللطیف ولد حضرت سید شاہ حسین صاحب مرحوم، عمر ۷۰ سال، پیشہ وظیفہ باب پر و نصیر چاند چٹانہ ساکن ۷۴ آغا پورہ، حیدر آباد بہ نسبت ہوش و عواس، اُس دیرینہ دلچسپی کی بنا پر مجھے قرآنی اور دیگر مذہبی امور سے ہے، ایک قرآنی ٹرسٹ قائم کو تا ہوں اور اپنی تمام کتابوں کے حق تصنیف کو اس ٹرسٹ کے حوالہ کیا ہوں۔

اس کے اغراجات کے لیے بیس ہزار روپیہ کا عطیہ بھی اپنی جیب سے دیا اور اپنی جملہ تصنیفات کا حق اشاعت بھی ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کس زمانے میں ایک ادارہ اسلامیات کے لیے قائم کرنا چاہتے تھے، اور جیسا کہ چودھری محمد شفیع (دم ش) نے ڈاکٹر سید عبداللطیف کو ایک خط میں لکھا تھا، اقبال مرحوم اس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دینے والے تھے۔ اداسے کی تاسیس سے قبل اقبال دہلت فرما گئے۔ بہر حال ان کے کام کی تکمیل ڈاکٹر عبداللطیف نے کر دی، اپنی زندگی میں بھی ادارہ کے ذریعے سے اور مرنے کے بعد کے لیے یہ 'قرآنی ٹرسٹ' قائم کر کے۔ خدا اکوے، اس کے کارکنوں کو اسی خلوص اور تندہی سے کام کی توفیق ملے، جو ان دونوں مرحوموں کی خواہش تھی۔

آزادہ وقت آگیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ۳ نومبر ۱۹۶۹ء (۱۳۵۱ھ) ساڑھے پانچ بجے صبح اپنی قیام گاہ پر جان جان آفریں کے سیر دکن۔ ہوش و عواس آخری لمحے تک بیکار ہے، بلکہ ان کے ارادہ خود لوگ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے؛ انہوں نے خود کہا کہ اب کوئی سورۃ یسین کی تلاوت کرے؛ اور اس کے بعد پورے سکون سے اپنے سولہ حقیقی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

لاولہ وقت ہوئے۔ لیکن ان کی اولاد معنوی اتنی ہے، بالخصوص ان کا انگریزی ترجمہ قرآن



- تذکرۂ معاصرین

کہ اس سے مستفیض ہونے والے ہمیشہ انھیں دعاے خیر سے یاد رکھیں گے۔ اسی دن یمنی مہاجر  
سہ ہر کو ۳ بجے معطر جا ہی مارکیٹ کی مسجد الاکنٹہ میں نمازِ جنازہ ہوئی، جس کی امامت  
مولانا ابو الوفاء کی۔ اس کے بعد میت کو دفن کیا، جہاں ان کی وصیت کے مطابق اگلے  
دن 'زہ نوبہ' بعد نمازِ صبح تدفین عمل میں آئی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ

## مہر، مولانا غلام رسول

۱۹ نومبر ۱۹۰۷ء کو مولانا غلام رسول ہر کا حرکت قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال ہو گیا۔

نئی نسل کے، خصوصاً وہ لوگ جو آج بچپن کے پٹے میں ہیں، انھوں نے یہ ایک سطری جبر پڑھی یا سن ہوگی۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ غلام رسول ہر کون تھے اور انھوں نے اردو صحافت کی خصوصاً اور علم و ادب کی عوامی خدمت کی!

مولانا غلام رسول ہر ۱۲ اپریل ۱۸۹۵ء کو جالندھر سے کوئی چاند سیل دور، ایک چھوٹے سے گاہن بھوپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قریب کے ایک اور گاہن میں ہوئی۔

اس کے بعد جالندھر شہر کے مشن ہائی اسکول میں داخلے کیا یہاں انھوں نے دسویں درجے تک تعلیم پائی۔ اب وہ لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج سے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس

کیا۔ وہ ابھی انٹر کے درجے میں تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جولائی ۱۹۱۳ء میں اپنا شہرہ آفاق ہفتہ وار اہلال کلکتہ سے جاری کیا۔ ہر صاحب اس سے پہلے شعر کہنے لگے تھے اور خدیسی اور سیاسی مطالبے میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اہلال کے خریدار

بن گئے اور یہ پرچہ مسلسل ان کے مطالعے میں رہنے لگا۔

مولانا آزاد نے اہللال کے ذریعے سے ملک کی عام سیاسی بیداری میں عموماً اور مسلمانان ہند کی تاریخ میں خصوصاً جواہر لال ادا کیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختراً اتنا کہنا کافی ہو گا کہ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریز دوستی اور کانگریس دشمنی کا جو سہو دیا تھا، وہ اس وقت تک اس ملک میں اسلامی سیاست کا اصل اصول بنا ہوا تھا۔

کے خلاف پہلی آواز مولانا ابوالکلام آزاد نے بلند کی۔ ان کا اسلوب تحریر اور اپنے نظریات کی تائید میں قدم قدم پر فصیح حدیث سے استدلال ایسا برجستہ اور بدیع تھا کہ اس نے گویا آگ لگا دی۔ نوجوان طبقہ اہللال پر دیوانہ وار فریفتہ ہو گیا۔ غلام رسول جہڑی اہللال اور صاحب اہللال کے والد شیدا بن گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی تنظیم کے لیے ایک جماعت 'حزب اشتر بنائی تھی اور اس کے اراکین کی تربیت کے لیے 'دارالارشاد' قائم کیا تھا۔ غلام رسول جہڑی 'حزب' اور 'دارالارشاد' کے رکن بن گئے۔ ان تمام اراکین کے نام ایک رجسٹر میں درج کیے جاتے تھے۔ ہر صاحب نے مولانا آزاد سے جو تعلق اپنی نوجوانی میں قائم کیا تھا، اسے اپنے آخری دم تک نباہا۔ اس دوران میں کیسے کیسے سیاسی لڑنے اور نظریاتی جھگڑے نہیں ہوئے لیکن ان کے پاسے امداد کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ مولانا کے عاشق تھے اور کبھی ان کا نام حضرت اور دہشتہ اشتر علیہ کے اضافے کے بغیر نہیں لیتے تھے۔

ہر صاحب نے ۱۹۱۵ء میں بن اسے پاس کر لیا، تو انھیں حیدر آباد (دکن) میں ملازمت مل گئی۔ وہ وہاں پانچواں وقار الامر میں انسپکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر اتحادی قوتوں کا ترکی کے خلافت رویہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بہت تشویش کا باعث رہا تھا۔ ہر صاحب نے حیدر آباد کے بعض دوستوں کے مشورے سے ایک اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا، 'سلطنت' اس کا نام تجویز ہوا اور انھوں

نے اجراء کے لیے درخواست دے دی۔

اوپر مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بنگال سے اخراج کا حکم صادر ہوا۔ چونکہ بہار کے علاوہ بیشتر دوسری صوبائی حکومتیں پہلے سے ان کے اپنے ہاں داخلے پر پابندی عائد کر چکی تھیں، اور سب راستے سدودیا کر دیے گئے، لہذا ان چار جہتیں بعد میں ان کی نظر بندی کا حکم صادر ہو گیا۔ ان کے کلکتے سے نکلنے پر حکومت نے ان کے گھر اور دفتر کی کاغذی حالتی، ان کے تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ انھیں میں صاحب اشرف کے اراکین کا رجسٹر بھی تھا، جس میں من جملہ اور اصحاب کے ہر صاحب کا نام بھی درج تھا۔ یہ سب لوگ حکومت کی نظر میں مشتبہ اور خطرناک قرار پائے اور ان سے متعلق پوچھ گچھ ہونے لگی۔ خدہ شدہ ہر صاحب کا کھوج بھی نکلا، اور رپورٹ ملی کہ ان دونوں یہ حیدر آباد میں ہیں اور ایک اخبار سلطنت نکالنے کے لیے ان کی قلمی مشین کی درخواست زیر غور ہے۔ حکومت جو مولانا آزاد کے اخبار الملال ہی کے اخراجات سے جز بہرہ بردار تھی، بھلا ان کے کسی مرید کے اخبار کی اجازت کیوں دینے لگی تھی چنانچہ ان کی درخواست رد کر دی گئی۔ اس سے تھوڑے دن بعد ہی ۱۹۱۶ء میں ہر صاحب حیدر آباد سے وطن واپس آئے۔

مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کو اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار سے روزانہ بنایا تھا۔ ظفر علی خان اردو صحافت کا ایک اور درخشندہ نام ہے۔ ان کا اخبار زمیندار گویا اردو صحافت کی درگاہ تھا۔ بھلا جس اخبار میں مختلف اوقات میں عبدالرشید العلامی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول، جہر، عبدالحمد سالک، جواغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خان میکیش، نصر اللہ خان عزیز نے کام کیا، ہوا اور ہاں سے انگ ہونے کے بعد زندگی بھر کامیاب صحافتی تحریکی ہو، اس اخبار کو صحافت کی درگاہ کے سواے اور کس نام سے یاد کیا جائیگا؟ اور ان اصحاب میں سے کس کا نام اردو صحافت میں فراموش کیا جاسکتا ہے؟

یہ حقیقت ہے کہ غفر علی خاں بنیادی طور پر ادبی آدمی تھے۔ وہ انگریز سیاست کے خاں زادہ میں نہیں بچنس گئے ہوتے، اور کچھ نئی سے علم و ادب اور صحافت ہی کو اپنا اور دھنا بکھڑنا بنائے رہتے، تو تاج اور دو کاو امن کیسے کیسے گلہ رائے رنگ رنگ سے منظر اور مشکبو ہوتا۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہی بات حسرت موہانی اور مولانا محمد علی پڑ اور شاہد گنجی صد تک مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی صادق آتی ہے۔ کون بتا سکتا ہو کہ ان اصحاب کی شکل میں اردو ادب نے کتنی بڑی قربانی دی ہے، سیاست کی بارگاہ پر ۱۹۲۰ء میں مولانا غفر علی خاں نے اہرام کو کے عبدالعزیز سالک کو زمیندار میں آنے کی دعوت دی۔ سالک صاحب اس وقت مولوی سید متا علی (امتیاز علی تاج کے والد) کے رسالوں تہذیب، نوان اور پھول کے ایڈیٹر تھے۔ سالک کو انکار کرتے دہنی ؟ اور وہ زمیندار سے وابستہ ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن بعد ان کا نام سر روتی پر ایڈیٹر کی حیثیت سے پھینک دیا اور وہ اس کے ادارے چلنے لگے۔ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء کا زمانہ ہادی تحریک آزادی کے آغاز زمانہ تھا اور شباب کا بھی۔ عدم تعاون کی تحریک پورے دور خود سے چل رہی تھی۔ حکومت بھی اپنے پورے لاؤ ٹھکرے اس کے مقابلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور کس نے حکومت کے خلاف کوئی بات کہی یا کھی، اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ پنجاب میں روزنامہ زمیندار خاص طور پر حکومت کی نظروں میں کشمکش کا تھا۔ غفر علی خاں گرفتار ہوئے، ان کے بیٹے اختر علی نمان گرفتار ہوئے، یہی اب سالک صاحب کے ساتھ بخش آیا۔ انہوں نے ایک ادارہ کھا، جو حکومت کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا۔ چنانچہ وہ گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لیے جیل خانے بھیج دیے گئے۔

جہر صاحب حیدر آباد سے واپس آکر خلافت تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ تھے اور اس کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نکالنے کی بھی فکر میں تھے۔ سالک کے جیل چلے جانے کے بعد زمیندار کے منبر جو جہر صاحب کے دوست تھے، ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آئیے اور

زمیندار کی باگ ڈور سنبھالیے۔ انھوں نے بھی خیال کیا کہ اگر ذاتی اخبار نکالنے سے پہلے  
 دوسرے پرچے میں کچھ چیز حاصل ہو جائے، تو یہ مفید رہیگا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء  
 میں ہر صاحب زمیندار کے ایڈیٹر بن گئے۔ لیکن وہ یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکے۔  
 پکڑو حکمران کا زمانہ تھا، اور زمیندار تو خاص طور پر مقرب سرکار تھا۔ ممکن ہے حکومت  
 نے اپنے کل پرزوں کے ذریعے سے بھی دباؤ ڈالا ہو۔ بہر حال ہر صاحب کے خاندان  
 کے بزرگ لاہور آئے اور انھوں نے اصرار کیا کہ وہ زمیندار کی ملازمت سے استعفیائے  
 دیں اور واپس اپنے وطن چلیں۔ ہر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد ہی حکومت نے زمیندار کی مالی ضمانت منسوخ کر لی، جس پر دعا دینی  
 طور پر، اس کی اشاعت بالکل بند ہو گئی۔

تین چار مہینے بعد زمیندار پھر جاری ہو گیا۔ اب کے اخبار کے کو تادمہ صاحب کے  
 گھاؤں پہنچے اور ان کے خاندان والوں کو قائل معقول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس  
 پر ہر صاحب دوبارہ زمیندار کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں سالک صاحب  
 بھی قید کاٹ کھڑا ہوا اور آکوان کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ  
 ہر دسالک کا یہ قرآن السعدین روزنامہ زمیندار کا آخری ہے، اور وہ محافت کا  
 بھی لازمی و در ثابیت ہوا۔ ہر کے بخیدہ، تین، مدلل اداریوں کی اور سالک کے  
 افکار و حوادث میں ہمارے تمام قومی مسائل پر طنز و مزاح کے انداز میں تبصرے کی  
 دھوم مچ گئی۔ بہت لوگوں نے ان کی نقل کی۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!

مارچ ۱۹۲۳ء کے آخر میں ہر دسالک نے بوجہ زمیندار سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا  
 اخبار کے مشترک علی نے بھی ان کا ساتھ دیا، ان میں ادارتی شعبے اور کاتب تک سب  
 شامل تھے۔ شروع میں ان کا اپنا نیا اخبار جاری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن  
 علی کے آجانے سے وہ مجبور ہو گئے کہ ان کے روزنامہ کا مسئلہ تھا۔ اب ان کے لیے اخبار

نکلانے کے سوائے کوئی چارٹہ کار درہا۔ چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۴۷ء کو روزنامہ انقلاب جاری ہوا۔ جن اصحاب کو اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس سے نظریاتی اختلاف کے باوجود اعتراف کر چکے کہ انقلابی صحافتی معیار سے کمتر کبھی کوئی بات نہیں کی۔

تہر نے یورپ اور مغربی ایشیا کے بیشتر ممالک کے سفر کیے تھے۔ اور وہاں کے کئی اکابر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر ان کی گہری نظر تھی جو ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی آئی۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ ایک کی جگہ دو دو ملک وجود میں آئے۔ ہر دو ممالک نے دیکھا کہ تبدیل شدہ حالات آزاد صحافت کے لیے سازگار نہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنی آزادی ہمارے بھی قائم رکھیں اور حکومت بھی ہم سے خوش رہے، تو یہ ناممکن ہے۔ چونکہ آزادی ختمیہ ان کے نزدیک خوشنودی حکومت سے عزیز تر تھی، انھوں نے انقلاب کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو انقلاب ہمیشہ کے لیے منجمد ہو گیا۔ ایک کامیاب، باخود و سوشل، نفع مندا خوار کو اصول کی خاطر منجمد کر دینے کی ایسی اور مثال شاید ہی کہیں مل سکے!

اس کے بعد ہر صاحب نے براہ راست سیاست سے ہٹ کر تعلق رکھا۔ ان کی کتاب غالب پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے غالب کے خطوط اور دوسری تحریروں کے اقتباسات کو اس طرح سے مرتب کیا ہے کہ اس سے کم و بیش غالب کی پوری سوانحی سائنس آگئی ہے۔ یہ کتاب ان کے غالب سے متعلق ایک بڑے پروگرام کا حصہ تھی، جو ان کی اور اور سرگزیموں کے باعث ادھورا رہ گیا۔ لیکن اہل نظر مجھ سے اتفاق کر چکے کہ جو کچھ ہو گیا، وہ بھی بہت قابل قدر ہے۔ پچھلے ۲۵ برس میں غالب پر بہت کام ہوا ہے اور اس کی بعض اچھی سوانحیں وجود میں آئی ہیں۔ اس کے باوجود دہر کی 'غالب' کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوئی اور غالب کا

کوئی سنجیدہ طالب علم اس کے مطالعے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔  
اس سلسلے میں بہت بعد کو انھوں نے اردو خطوط غالب بھی دو جلدوں میں مرتب کیے تھے  
ان کے ساتھ مکتوب ایہم کے حالات اور مفید حواشی کا اضافہ کیا جس سے ان کا افادہ  
وسیع تر ہو گیا۔

صحافت سے دستکش ہو کر انھوں نے اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا تھا۔  
انھوں نے ۱۹۳۵ء میں حضرت سید احمد شہید داسے بریلوی کے حالات جمع کرنا شروع کیے  
تھے۔ اب فرصت ملتا ہوئی، تو انھوں نے اس کتاب کی تکمیل پر توجہ کی۔ ۱۸ سال کی محنت  
شاقہ اور تلاش و تحقیق کے بعد اسے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے انھوں  
نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی اور کون کون سے کونویں نہیں جھانکے۔ حضرت  
شہید احمد شہید کی تحریک کے بقیۃ السیف افراد کو ریاست ٹونک میں پناہ ملی تھی۔ ان  
صحاب کے باعث تحریک سے متعلق بہت قلمی لٹریچر ٹونک کے سرکاری کتب خانے میں جمع  
ہو گیا تھا۔ ہر صاحب اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسے مولانا آزاد نے دہاں سے منگو کر  
اٹھیں دیا تھا۔

بعد کو انھوں نے حضرت شہید کے رفیقوں کے حالات بھی جمع کر کے 'سرگزشت مجاہدین'  
کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے کے کوائف 'انقلاب' ۱۹۵۷ء  
کے نام سے شائع کیے۔

غالب کے بعد ان کا دوسرا پسند موضوع اقبال تھا۔ ان کے اقبال کے ساتھ بہت زمانہ  
کے تعلقات تھے، بلکہ ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع بھی ملے تھے جب ۱۹۳۱ء میں اقبال  
دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے ہیں، تو ہر بھی ان کے ساتھ  
تھے۔ ایسی پر بھی دونوں یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے ایک ساتھ مؤثر  
اسلامی، یروشلم کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ہر صاحب کہا کرتے تھے کہ اقبال کا ہر



نصف یا ایک تہائی کلام شائع ہوا ہے۔ اس سے ان کی مراد پر بھی کراقبال نے اپنی کئی تطلیں یا شعروں سے شائع نہیں کیے یا کسی مجموعے میں شامل نہیں کیے کہ ان کے خیال میں یہ ان کے معیار سے فروتر تھے یا ان کے عام طرز فکر سے میل نہیں کھاتے تھے چونکہ مہرزد تو ان کے ساتھ رہے تھے، اس لیے اس طرح کا دافرا کلام ان کے پاس جمع تھا۔ وہ اسے توضیح حراشی کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ خدا معلوم اب اس ذخیرے کا کیا حشر ہوتا ہے! انہوں نے بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم مجموعوں کے مطالبہ و معافی سے متعلق مستقل مصنفات چھوڑی ہیں۔ ایک کتاب اقبال کی سوانح سے متعلق بھی ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے تجویز کے ادب پر خاصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں ان کی چھوٹی بڑی، خدا بھوٹ نہ بولنے، کوئٹہ پر اس کتابیں ہونگی۔ انہوں نے ترجمے بھی کیے۔ اس میں زیادہ توجہ تاریخ اسلام پر رہی۔ عجیب ہمہ گیر طبیعت پائی تھی۔ لیکن ترجمہ ہو کر تالیف، سوانح ہو کر تاریخ، سیاست ہو یا مذہب، ادب ہو یا شعر۔ غرض کوئی میدان ہو، وہ کسی قسم کی گھیبابت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جو بھی کہی اور جب بھی کہی، ایسی کر سننے والے کو اس سے شرم محسوس ہوتی، اور خود انھیں کبھی بعد کو اس کے باعث ندامت۔

صحت کی طرف سے کبھی شکایت نہیں کی۔ سرخ و سفید رنگ، لمبہ بالا، اور زشی خناسب جسم۔ وہ اپنی عادات میں بہت باقاعدہ تھے۔ مسلم ٹاؤن میں ان کا اپنا مکان تھا۔ ہنر یہاں سے بہت قریب جو گری سر دی ہر موسم کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد نکل پڑتے۔ نہر کے کنارے کوئی دو میل چلے جاتے۔ اس طرح روزانہ کم و بیش چار میل کا اوسط تھا۔ واپس آکر ناشتہ کرتے اور اس کے بعد کام کی میز پر بیٹھ جاتے۔ بارہ بجے تک نوشتہ و خواندہ کا مشغلہ رہتا۔ یہاں سے اٹھتے تو دہر کا کھانا کھاتے اور پھر تھوڑی دیر

قبیلہ لڑکرتے۔ تین بچے دوبارہ مطالعے کی میز پر پہنچ جاتے اور چھریکے تک مشغول رہتے۔ پھر شام کی سیر اور اس سے واپسی کے بعد کا وقت احباب کے لیے وقف تھا۔ یادہ ان کے وہاں آجاتے یا یہ کسی کے وہاں چلے جاتے۔ رات کا کھانا کھا کر جلد سو جانے کے عادی تھے۔

ایسی منظم زندگی کا یہ نتیجہ تھا کہ صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ موت اچانک ہوئی۔ منگل کے دن ۱۶ نومبر ۱۹۶۷ء (۲۷ رمضان ۱۳۹۱ھ) کو علی الصباح حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن سپرہ کو مسلم ناؤن ہی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ راعب مراد آباد کے قطعہ تاریخ کے آخری مصرع سے عیسوی تاریخ نکلتی ہے۔ یہ ہے:

نشر اقدس و تقاریر وطن غلام رسول

وہ ہنوز کالج کے طالب علم تھے کہ ۱۹۱۷ء میں ان کی شادی ہوئی۔ لیکن چار یا پنج سال بعد یہ بیگم دو خود سال بچے اپنی یادگار چھوڑ کر انھیں ان بخت و عافیت دے گئیں۔ دوسرے کالج انھوں نے بہت دن بعد ۱۹۲۹ء میں کیا۔ اس خاتون سے ان کے دس بچے پیدا ہوئے۔ دھانچے وقت ان کے گیارہ بچے

موجود تھے۔ بچے بیٹے عبد السلام، اسلم، غازی شاہین، اکرم، جاوید، سلطان، طاہق، امجد سلیم اور پانچ بیٹیاں۔ پانچ بڑے بیٹے برسرِ پردہ لگا رہیں؛ سب بچوں نے امجد سلیم بی اے کے معلم ہیں تین بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے گھر بلا کی ہیں؛ دو ہنوز نا کتھہ ہیں۔

میرے ان کے ۱۹۲۶ء سے استاد تعلقات تھے۔ ۵۵ برس تھوڑی مدت جنہیں ہوتی۔ غائب نے ہوس کے انتقال پر کہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ۴۰ برس سے جانتے تھے، حضرت ۴۰ برس کا تو دشمن بھی نہیں ملتا، دوست کا کیا ذکر! میں ہر کے لیے کیا کہوں۔ میں نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا۔ نیکی اور شرافت کا نمونہ، دوست پروری اور وضع وادی کی مثال:

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

## سیدین، خواجہ غلام السیدین

ان کا سلسلہ نسب حضرت رسول کریم صلعم کے مشہور صحابی حضرت ابوالقباہ انصاری تک پہنچتا ہے۔ یہ اور اردو شاعری کے مجدد خواجہ الطاف حسین حالی (ف ۱۲۱۹) تکبھی تھے۔ مولانا حالی نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ہمارے بزرگوں میں سب سے پہلے خواجہ ملک علی ہروی مجدد غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۷) ہیں خاندان آئے حکومت وقت نے ان کی مناسب آؤ بھگت کی۔ جاگیر اور پانی پت کی قضاۃ کے علاوہ انھیں منڈی میں مختلف اجناس کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ لیکن یہ سارا جاہ و مال بہت مدت سے ختم ہو چکا تھا اور سیدین کے باپ دادا تک خاندانی نیکنامی اور عزت و شرف کے سوا اس میں سے کچھ نہ پہنچا۔

سیدین کے دادا خواجہ غلام عباس کا نکاح مولانا حالی کی بھانجی سے ہوا تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے غلام محسن، غلام اشعلیں، غلام السبطین؛ سب سے بڑے غلام محسن قابل گو عالم دین اور مصنف تھے۔ انھوں نے ہر ربہ، اسپنسر کی مشہور کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ "لسفہ تعلیم" کے عنوان سے اردو میں کیا تھا۔ میں نے اپنی طالع بینی کے زمانے میں ان کے

بعض مذہبی رسالے اور ایک آدھ مناظرے کی کتاب دیکھی تھی۔ ان کا ۱۹۳۸ء میں لاہور انتقال ہوا۔

سب سے چھوٹے خواجہ غلام السبطین تجارت اور ملازمت کرتے رہے۔ ہماری زبان کے نامور افساد نگار اور ناول نویس اور فلم ساز خواجہ احمد عباس انھیں کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۳۲ء میں رحلت کی۔

خواجہ غلام اقلین صحیح معنوں میں فخر خاندان تھے۔ ۱۸۷۲ء میں بانی نپت میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ ۱۸۸۴ء میں وہ حالی کے ساتھ دلی آئے۔ پانچ برس بعد یہاں گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ یہی زیاد تھا جب انھوں نے "انظر فی تاریخ" کے عنوان سے کوئی ۲۰ صفحات کا مضمون حیدرآباد کے مشہور دانش کے حسن حسین جیسے کو بھیجا۔ یہ مضمون حسن کے معیار کے مطابق قابل انعام ٹھہرا اور انھیں ایک اشرافی انعام میں ملی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۶ برس سے متجاوز نہیں تھی۔

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۸۹ء میں ایم اے او کلک علی گڑھ میں داخلہ لیا، اور چار سال بعد ۱۸۹۳ء میں (بھروسہ ۲ برس) بی اے اور پھر ۱۸۹۵ء میں قانون کے امتحان پاس کیے۔ ۱۸۹۶ء کے شروع میں وہ ریاست حیدرآباد (دکن) میں ملازم ہو گئے۔ وہاں وہ پانچ برس سے کچھ زیادہ رہے۔ ۱۹۰۱ء میں وطن واپس آئے اور میرٹھ میں وکالت شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاج پوشی کے موقع پر دسمبر ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہیرانی نس سرگودھا کی زیر صدارت دلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر خواجہ غلام اقلین نے "اصلاح تمدن" (سوشل ریفارم) سے متعلق ایک تقریر کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس نے اپنی سرگرمیوں میں اس موضوع کا اضافہ کر دیا؛ اور اس کے لیے الگ شعبہ قائم کر کے خواجہ غلام اقلین ہی کو اس کا سکریٹری بنا دیا۔ انھوں نے پورے خلوص سے اس شعبے کا پیغام گھر گھر پہنچایا

کے لیے جنوری ۱۹۰۳ء میں اپنا مشہور رسالہ "عصر جدید" جاری کیا جو پہلے ماہنامہ اور بعد کو ہفتہ وار شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مشنوں کے دورے کیے، تقریریں کیں، نیز اس تحریک کے مقاصد کی تشریح کے لیے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام "مضامین اصلاح و ترقی" تھا۔ یہ مشینز مفت تقسیم کی گئی تھیں۔

وہ اعتقاد شیعہ تھے اور شیعہ کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں سنی شیعہ فرقوں کے اختلاف اور کشمکش سے بہت رنج تھا۔ انھوں نے بساطِ پھر دو زوں گردیوں میں صلح صفائی اور یکجہتی کی نصیحتیں کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انیسویں صدی کے علمائے کرام نے انھیں اپنے تعاون سے محروم رکھا!

۱۹۰۹ء کے انتخاب میں وہ صوبائی کونسل کی رکنیت کے لیے امیدوار کھڑے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان تھے، جو ان سے کہیں زیادہ بااثر و رسوخ تھے؛ لہذا وہ ہار گئے۔ لیکن وہ اس سے حوصلہ نہیں ہارے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ دوبارہ کھڑے ہوئے اور اب کے اپنے مقابلے میں خان بہادر سید آل نبی دیکل و میس آگرہ کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے۔ اکثر ان کے نام کے ساتھ "آزمل" لکھا جاتا ہے؛ یہ اس انتخابی کامیابی کا نتیجہ ہے۔ لیکن افسوس! ان کی صحت خطرناک حد تک خراب رہنے لگی۔ اگر وہ احتیاط کرتے اور مناسب طریقے پر علاج ہوتا، تو شاید تندرستی بحال ہو جاتی۔ لیکن ایمان کی حرارت اور قوم کی ذہنی حالی کی اصلاح کا جذبہ انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ کثرتِ کار لیے لیے اندرونِ دیہاتوں، ملکِ سفروں کی کوفت، اور ذہنی تشویش نے انھیں قبل از وقت موت کے منہ میں ڈھکیں دیا۔ جسمِ ان کی روح کا ساتھ نہ دے سکا، اور تندرستی صہبائے یابگینہ پگھل گیا۔ بروز جمعہ ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء رات کے دس بجے اس مجاہدِ قوم کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے پانی پت میں انتقال ہو گیا، جنازہ اگلے دن اٹھا، اور عید گاہ کے متصل درگاہِ میر تقی میر پر خاک ہوئے۔ صرف ۴۲ برس کی عمر پائی۔

جسٹایہ کوئی مرنے کی عمر تھی !

ان کا نکاح مولانا حالی کے بڑے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین (ف ۱۹۲۲ء) کی صاحبزادی مشتاق فاطمہ سے ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑے، مختار فاطمہ، غلام السیدین، سیدہ خاتون، انظر عباس، مصداق فاطمہ۔ مختار فاطمہ کا نکاح سید حسن زیدی سے ہوا تھا۔ سیدہ خاتون کا عین عسکریہ شباب میں ۱۹۲۹ء میں انتقال ہو گیا۔ حالی کے مختصر مجموعہ سخن، اجواہراتِ حالی، میں ایک بھولی ٹیسی مشنوی ان سے متعلق ملتی ہے۔ سیدین کی کتاب آئندگی میں چراغ ۹ میں بھی ایک مضمون ان سے متعلق موجود ہے۔ خواجہ انظر عباس ابھی چار برس ہوئے ۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو اللہ کو پیار سے ہوئے۔ مصداق فاطمہ بحیثیت ادیب و مصنفہ صاحبہ عابدہ حسین کے نام سے مشہور و معروف ہیں اور کئی تعارف کی محتاج نہیں۔

خواجہ غلام السیدین جنھیں ان کے سب احباب سیدین کے نام سے جانتے ہیں، مرحوم خواجہ غلام افغانی کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کے دن پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تربیت اپنے والد اور نانائو و حالی کی نگرانی میں ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن مجید ختم کیا، اس کے ساتھ علم تجوید و قرأت کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ان کی انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے دسویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ اور پھر علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ اس سال اپنی یونیورسٹی سے بی اے کے داہدھا بمعلم تھے، اس امتحان میں وہ درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں یوپی کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر مسٹر پنکھڑی تھے، وہ ان کے نتیجے اور خاص طور پر انگریزی میں غیر معمولی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی سفارش پر حکومت نے انھیں وظیفہ عطا کیا اور یہ ولایت چلے گئے۔ وہاں لیڈر یونیورسٹی سے پہلے تعلیم و تدریس کی سند (ڈپلوما) اور پھر ۱۹۲۵ء میں ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ کہا

سال کے آخر میں وہ ہندستان واپس آئے۔

والہی پاتول علی گڑھ ٹریننگ کالج میں ریڈر مقرر ہوئے۔ تھوڑے دن بعد صبیح الرحمن صاحب صدر شعبہ کہیں باہر گئے، اور یہاں کی جگہ پر لگ گئے۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ۱۹۲۷ء میں انھیں کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ ترقی کر کے پرنسپل ہو گئے۔ اتنی کم عمر میں شاید ہی کوئی اور پرنسپل بنا ہو۔ وہ اس کالج میں ۱۹۳۸ء تک رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ریاست کشمیر کی حکومت نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ مدیر محکمہ تعلیم کے عہدے پر دہاں چلے گئے۔ کشمیر میں وہ ۱۹۴۵ء تک رہے۔ اب ان کی ماہر تعلیم کی حیثیت سے ملک میں شہرت ہو چلی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں ریاست راجپور نے انھیں اپنے ہاں بلا لیا۔ وہ دو برس تک راجپور میں میٹر تعلیم رہے۔ آزاد دی ملک پر جب ریاست جمہوریہ ہند میں شامل ہونے والی تھی، اتوں کا عہدہ بھی تحفہ میں آگیا۔ جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں وہ یہاں سے سبکدوش ہوئے، تو حکومت بمبئی نے اسی عہدے پر انھیں اپنے ہاں مقرر کر دیا۔ انھوں نے صوبہ بمبئی کے تعلیمی نظم و نسق میں ایسی خوشگوار اصلاحات کیں کہ شدہ شدہ حکومت ہند تک ان کی خبر نہ پہنچی۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء میں ہلاک مرکزی وزارت تعلیم میں میٹر اور جوائنٹ سکٹر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس زمانے میں سکٹر ڈاکٹر ناراجند تھے ۱۹۵۳ء میں ان کے بعد پرنسپل ہائیو کیراف، اگست ۱۹۶۶ء سکٹر ہو کر آئے، تو سیدین ایڈیشنل سکٹر مقرر ہوئے اور تین سال بعد ان کے مستعفی ہونے پر ۱۹۵۷ء میں سکٹر بن گئے۔ یہیں سے ۱۹۶۱ء میں پنشن پر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ یہاں سے فراغت پائی، تو حکومت کشمیر نے انھیں دوبارہ اپنے ہاں دوبارہ بلا لیا۔ لیکن اب بحولہ دور تھا۔ حکومت کے کل پڑے انھیں اپنے مصالحت کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ سیدین کو یہ مداخلت پسند نہیں تھی۔ اب کے وہ سال کل سے زیادہ یہاں نہیں رہ سکے اور ۱۹۶۲ء کے شروع میں مستعفی ہو گئے۔

اپنی ملازمت کے دوران میں (۱۹۰۵ء) وہ دعوتی پروفیسر کی حیثیت سے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک گئے تھے۔ اب جو ملازمت کا جو اگلے سے اترا، تو بیرون ملک کی مختلف یونیورسٹیوں نے اپنے ہاں مدعو کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ مسکاتن یونیورسٹی (امریکا) گئے (۱۹۱۲ء - ۱۹۱۳ء)۔ اس کے بعد ۱۹۱۳ء - ۱۹۱۴ء کا ایک سال ہوائی یونیورسٹی میں گزرا۔ یہاں وہ مرکز برائے شرق و غرب میں سینئر اسکالر بن کر گئے تھے۔ ہوائی ہی سے ۱۹۱۴ء میں وہ شان فورڈ یونیورسٹی گئے اور اسی سال کے آخر میں وہاں سے واپس آئے، تو یہاں حکومت ہند ایک تعلیمی کمیشن کی تشکیل کا منصوبہ پختل کر چکی تھی؛ انھیں بھی اس کارکن نامزد کر دیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں اس عہدے پر دو برس (۱۹۱۶ء تک) رہے۔ کمیشن کا کام ختم ہوا، تو یہاں وہی میں ایک سرکاری تعلیمی اور انتظامی محالہ کے ادارے کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۱۶ء میں الگ ہوئے۔

۱۹۱۷ء میں شکاگو یونیورسٹی نے دنیا بھر سے آٹھ ماہرین تعلیم کا انتخاب کر کے انھیں (مبادی خدات کا متعہ دیا تھا، ہندوستان کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ ان آٹھ میں سے ایک ذات سیدین صاحب کی تھی۔ وہ شکاگو سے جون ۱۹۱۷ء میں وطن لوٹے تھے۔ اگر ہم گنوائیں کہ وہ یہاں ہندوستان میں اور بیرونی ممالک میں کون کونسی یونیورسٹیوں اور اداروں کی منتظر یا عاملہ کے رکن رہے، تو یہ طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت جو کہ ہمارے ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں سیدین صاحب کا ہاتھ رہا ہو۔ انھوں نے پس پردہ رہ کر خاموشی سے اس میدان میں جو خدمات سر انجام دی ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ملک سے باہر جب ادارے سے وہ بہت دن تک وابستہ رہے، وہ یونٹکو ہے۔ وہ اس کی مرکزی سرگرمیوں کے مختلف سطح پر مشغول رہے اور اس کی طرف سے انھوں نے بعض ممالک کا دورہ بھی کیا۔



شیدین صاحب کو اردو اور انگریزی - دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔  
 (لوں وہ فارسی اور عربی کے علاوہ فرانسیسی بھی جانتے تھے) ان کی اردو نثر بڑی جادو  
 اور شگفتہ ہے۔ بظاہر ہر سی پہل متع کو قاری خیال کرے کہ ایسی نثر کھینچا کیا مشکل  
 ہے؛ لیکن کھینچنے بیٹھے، تو دانتوں پسینہ آجائے اور اسے معلوم ہو کہ یہ کتنا مشکل کام۔  
 نثر کے علاوہ وہ تقریر کے بھی مرد میدان تھے، اور ان کی یہ صلاحیت کا ملا خدا داد  
 تھی۔ رشید احمد صدیقی نے کسی جگہ ان کی ۱۹۱۶ء کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے۔ جو  
 انھوں نے آل انڈیا انجکشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ کے موقع پر امرتسر کی ہال  
 میں کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ برس کی تھی اور اس کمسنی کے زمانے میں یہ تقریر یہاں  
 نے اس اطمینان اور وقار سے کی تھی کہ سننے والے بہت دن تک اس کا جرجر کرتے  
 رہے۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنی زندگی میں بعض بڑے بلند پایہ اور طلیق اللسان مقربوں  
 کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ میں بلا خوف و تردید، پورے ذوق سے کہہ سکتا ہوں کہ قدس  
 زبان، لہجے کی صانت - انداز و اسلوب خطاب، اور صبر کے مال اور علیہ سے پوری  
 واقفیت، دلائل کی قوت، اپنے نقطہ نظر کی وضاحت، سامع کی تشنگی اور اطمینان۔  
 غرض ان تمام باتوں میں جو کسی اچھی اور کامیاب تقریر کا مایہ الاتقیا ہیں، شیدین  
 کسی سے کم نہیں تھے۔ گفتگو میں بھی ان کا یہی انداز تھا بلکہ یہاں بلکا سا مزاح کا  
 چلہ سونے میں سہاگے کا کام دیتا تھا۔ وہ کبھی جارحانہ رویہ نہیں اختیار کرتے تھے  
 نرم لہجے میں، ذوق سے دہنہا عند یہ پیش کرنے میں کوئی ان کا حریف نہیں تھا۔  
 کھینچنے پڑھنے کا شوق انھوں نے درثے میں پایا۔ ان کے خاندان نے علم و ادب کی ترقی  
 و ترویج اور قوم کی ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت میں جو نمایاں خدمات سر انجام  
 دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، اور یہاں ان سے متعلق کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت  
 بھی نہیں، نہ یہ ممکن ہی ہے۔ شیدین نہ صرف ان اقدار عالیہ کے وارث تھے بلکہ

انہوں نے اپنی زندگی کو اپنے گفتار و کردار کو ان اصولوں کے مطابق ڈھال کر اپنے معصروں کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا۔ ان کا موضوع سخن تعلیم تھا۔ وہ ساری عمر معلم رہے۔ سقراط سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے روزمرہ کی گفتگو کے ذریعے سے اپنے عہد کے زجرانوں کو جو آگے چل کر یونانی قوم کے کرتا و کرتا بننے والے تھے سکھایا کہ اچھا آدمی اور اچھا شہری کہلانے کا نسخہ کون ہے اور کسی شخص کو اس لفظ "اچھا" کا مصداق بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ سیدین کا مطلع نظر بھی ساری عمر ہی رہا۔

وہ اقبال کے عاشق تھے یاد اور اقبال کا بیشتر کلام انہیں یاد تھا۔ وہ تحریروں و تقریر میں بلکہ عام گفتگو میں بھی عموماً اقبال کے اشعار استدلال یا موضوع کی وضاحت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے اقبال کا تعلیمی فلسفہ کے عنوان سے ایک کتاب بھی انگریزی میں تصنیف کی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں لاہور سے چھپی تھی۔ نظر ثانی اور اضافے کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں چھپا۔ اس موضوع پر کج تک یہ واحد کتاب ہے۔

ان کی بیشتر کتابیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ اردو میں مندرجہ ذیل عنوانات ہیں :

روح تہذیب (دلی ۱۹۳۲ء)؛ اصول تعلیم (سندھانی اکاڈمی، لاہور آباد ۱۹۴۹ء)؛ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک (۱۹۳۵ء) قومی سیرت کی تشکیل (۱۹۳۸ء)؛ شہیدِ وفا (۱۹۳۴ء)؛ آندھی میں چراغ (دلی ۱۹۶۲ء)؛ ذہن انسانی کا ارتقاء (نظامِ بکچر، دلی ۱۹۶۶ء)؛ زبان، زندگی اور تعلیم (انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۷۱ء)؛

آندھی میں چراغ پر انہیں ۱۹۶۶ء میں سائبیہ اکاڈمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ آخری کتاب (زبان، زندگی اور تعلیم) زیر طبع تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور یہ انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ یہ ان کی وفات کے کوئی ہفتہ بھر بعد شائع ہوئی۔ انگریزی کی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسالوں کی تعداد ۲۸ ہے۔

## تذکرہ معاصرین

ان کی طبی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں داور طبی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۶۲ء میں انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔ ان کے احباب نے ایک مجموعہ مضامین بعنوان اوشانِ الفت ان کی ساتھیوں ساگرہ پر ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ان کی نذر کیا تھا۔ اس کے مرتب ڈاکٹر سید عابد حسین ہیں اور یہ کتاب صدر جمہوریہ منہد ڈاکٹر سرو ملی دادا کارشناس کے ہاتھوں پیش کی گئی تھی۔ حکومت منہد نے ۱۹۶۶ء میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی نوازا کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی۔ وہ ہنود مسلک ملازمت بھی میں تھے کہ انھیں دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہیں ۱۹۵۰ء میں پہلا دورہ پڑا۔ لیکن اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کوئی نمایاں کمی نہیں کی۔ حسب معمول اپنے کام کاج میں لگے رہے۔ بے لے جے جی اور جوہانی سفر بھی کرتے چنانچہ ۱۹۵۰ء میں وہ وینسکو کے کسی کام سے واپس گئے۔ ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں۔ میں ان آیام میں بغداد میں مقیم تھا۔ میری ان سے پہلی ملاقات وہیں بغداد میں ہوئی۔ ان گزشتہ میں بائیس برس میں چارے تعلقات میں بہت گہرائی آگئی تھی۔ ان کی وفات سے میں ایک مہرمان دوست سے محروم ہو گیا۔ رحمتہ تعالیٰ۔ جیسا کہ کلمہ چکا ہوں ۱۹۶۳ء میں وہ دس کاٹھن میں تھے۔ وہاں ان کی رشتہ حیات کا انتقال ہو گیا (۲ جنوری ۱۹۶۳ء)۔ اس کا ان کی صحت پر جمید ناخوشگوار اثر پڑا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ وہ اپنی فریادہ ادوی سے مردانہ وار کام میں جٹے رہے۔ لیکن یہ امر واقع ہو کہ اس حادثے سے ان کا دل بچ گیا تھا۔ دل کا دوسرا شدید حملہ ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ میں ہوا جہاں وہ مسلم یونیورسٹی کے طب و تقسیم امینڈ میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اس کے بعد تواتر ٹھوڑے ٹھوڑے وقفے سے بگے بگے حملے ہوتے رہے۔ قیصر اشدید حملہ جان لیوا ہوا۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۷ء کو سینے میں درد کی شکایت کی حسب دستور ان کے معالج انھیں اپنے ساتھ اسپتال لے گئے۔ اگلے دن ۱۹ دسمبر کو فی سائین جے اشد کا یہ نیک منہ

## تذکرہ معاصرین

اپنے خاکی کے حضور حاضر ہو گیا۔ ہوش و حواس اکثر تک قائم رہے، بلکہ تین بجے تک وہ حاضر سے باتیں کرتے اور انھیں مختلف ہدایتیں دیتے رہے تھے۔ تجہیز و تکفین ۲۰ دسمبر کی صبح کو ہوئی۔ نماذ جنازہ مولانا سید علی صاحب (پیش امام مسجد پنجہ شریف، کشمیری گیٹ) نے پڑھائی، جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن ہوئے!

آسمان تربت پر تیری عنبر فانی کرے!

نواب کلب علی خان (ف ۱۸۸۷ء) والی راجپور کے ایک بیٹے شبیر علی خان تھے۔ سیدین کی شادی انھیں کی صاحبزادی عزیز جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہو گیا۔ اولاد میں چار بیٹیاں (دہرہ، بلقیس، سیدہ، ذکیہ) اپنی یادگار چھوڑیں۔

# اِشَارِیہ

## ۱۔ اشخاص

دکسی ہند سے کیے نیچے لکیرے مراد ہے کماں صفحہ پر نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے)

ابراہیم علی حش لکھنوی، میرزا ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰

ابراہیم علی خان (دوالی ٹونک) ۵۳

راہین ہنرک، ۱۸۹

ابوالحسن ۸۵

ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوری ۱۱۷

ابوالیوب اضاروی، ۳۰۷

ابوالوفا (مولانا) ۲۹۷

ابوسعید عسکری، ۱۳۷

اثر صبا، عبدالمسیح پال ۸۰

اثر لکھنوی، جعفر علی خان ۳۷۷

اجمل خان، حکیم ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۲۸

احسن مارہروی، علی اصمن ۲۳

احسن مراد آبادی ۱۷۲

احمد ابراہیم طوی ۱۴۲

احمد امین (شاہد احمد) ۲۷

احمد حسن (حکیم بڈن) ۱۱۷

احمد حسین (سید) ۹۲

احمد خان (سرسید) دیکھیے سرسید

آبرہی، ولیم ۱۶۳

آرزو، انور حسین ۲۳۱، ۲۳

آزاد، ابوالکلام ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۸

۱۹۹، ۳۳۳، ۳۳۹، ۳۸۸، ۳۸۹

۳۹۰، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲

۳۱۱

آزاد، محمد حسین ۳۸۹

آسکر والٹز، ۱۹۹

آسی الدینی، ۲۷۹

آشفتہ لکھنوی، ۳۵

آغا شہر کا شیری، محمد شاہ ۱۹۳

آفتاب احمد خان، صاحبزادہ ۳۰۹

آفتاب اختر، ۳۲۶

آلی رضا (سید) ۲۳۰، ۲۳۱

آلی نبی (سید) ۳۰۹

۱

آبید غوان "دیباں بشیر احمد" ۳۱۱

ابراہیم رحمت اللہ مراد، ۲۸۲

احمد دین پال ۸۰  
 احمد رضا ۲۵۵  
 احمد زان ۷۲  
 احمد شاہ ابدالی ۱۱۷  
 احمد شاہ بخاری (پطرس) ۱۶۶  
 احمد شجاع ۶۵  
 احمد عباس خواجہ ۳۰۷  
 احمد نسیم قاسمی ۱۲۵  
 اختر اورینوی، اختر احمد ۳۴۹  
 اختر شیرانی، محمد داؤد خان ۲۹۲، ۲۹۱، ۲۹۰  
 اختر حسن خاں ۱۳۲  
 اختر علی خاں ۳۰۱  
 ارتضیٰ احسنی ۲۵۸  
 ارسطو جاد، رجب علی شاہ ۲۸۹  
 اردو انٹیل، گولانڈو سر ۲۸۹، ۲۸۵  
 اسد، اسد اللہ (خواجہ) ۲۲۳  
 اسد لکھنوی، سلیمان خان ۵۵  
 اسد اللہ قادری ۲۲۸  
 اسد علی خان (میر) ۲۸۳  
 اسعد (محلانا) ۲۳۲  
 اسلام الدین عثمانی، ابو یوسفین ۲۸۶  
 اسلم حیرا چوری ۱۰۴  
 اسلم سیفی میرٹھی ۲۳۸  
 اسماعیل خان ۱۶۸  
 اسماعیل علی خان (ٹونک) ۵۶

انجیل میرٹھی، محمد اسماعیل ۳۳۸  
 اسیر الدینی، علی احمد خان ۲۶۹، ۲۶۸  
 ۲۲۰، ۲۱۹  
 اشتیاق حسین ۱۳۳  
 اسد گوڑوی، اصغر حسین ۲۵۷، ۲۵۶  
 اطہر ایڈی، عشق حسین ۱۱۸  
 اطہر حسین (خواجہ) ۲۲۳  
 اطہر عباس ۲۱۵  
 اجاز شمس ۲۸۲  
 اجاز صدیقی، اکبر آبادی ۲۹۹، ۲۰۳  
 اغزا ز احمد ۲۶۵  
 اعظم کرپوری ۳۲  
 اکن، صاحب وقار ۲۲۰  
 افتخار احمد ۲۶۵  
 افتخار الدین ۳۱۶  
 افتخار علی خان (ٹونک) ۵۶  
 انور میرٹھی، حامد اللہ ۲۲۳، ۲۲۵  
 انصاف حسین تانگی ۲۸۸  
 افضل علی (میر) ۳۸۰، ۳۷  
 انور لکھنوی، دوڑا کاپر شاہ ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۰۹  
 اقبال، محمد اقبال (سر) ۳۷، ۵۹، ۵۰  
 ۱۷۶، ۱۹۵، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۶، ۱۷۳  
 ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶  
 اکبر الہ آبادی، اکبر حسین (دیتا) ۲۵۵  
 اکبری بیگم ۳۸

۱۱۷	بڈن، حکیم احمد حسن	۲۷۵، ۲۷۳	اکرام علی بسل (ایتد)
۱۱۸	براؤن، ایڈونڈ جان	۳۰۶	اکرم (جہ ہیر)
۱۱۹	براؤن، ولیم	۱۲۵	الطاف شہیدی
۱۲۰	برنی، ضیاء الدین	۹۰	انزاف سنی
۱۲۱	بسل، خیر آبادی، احمد حسین	۲۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴	اتیاز علی تاج
۱۲۲	بسل، سید اکرام علی	۲۹۳	اتیاز علی خان مرثی
۱۲۳	بشیر الدین	۲۲۸	اجمل علی شاہ دادو
۱۲۴	بشیر الدین (مولوی)	۳۰۶	اجمل مسلم (جہ ہیر)
۱۲۵	بشیر الدین، احمد دہلوی	۱۷۱	ادار احمد مہاجر مکی
۱۲۶	بلقیس (دیگم بابا)	۲۷۶	اسد امین شری، ابوالکمال
۱۲۷	بلقیس (بنت مستدین)	۱۳۱	امیر احمد دہلوی
۱۲۸	بنگم چند پٹری	۲۸۳	امین الدین
۱۲۹	بہا الدین، ذکر یاد	۷۱	امین چند
۱۳۰	بہار گھنوی	۱۶۷	انار د اختر آدربی
۱۳۱	بہار مرثیہ نندن	۹۰	اندلس مراد آبادی
۱۳۲	بیان یزدانی، غلام مرتضیٰ	۲۶	انصار سامری
۱۳۳	بغیر، برج کشن گول	۱۰۳	انصاری، نعمت احمد دلاکٹر
۱۳۴	بہزود، عباس علی خان	۲۸۶	انور دہلوی، امراؤ پیرا
۱۳۵	بہزود سولانی، محمد احمد	۵۹، ۳۰	انیس، میر جہاں علی
۱۳۶	بہزود دہلوی، دید الدین	۱۳۷	اودنگ زیب (مالگیر)
۱۳۷	بیدل، عبد السمیع	۱۳۳	اولاد حسین شادان بگلری
۱۳۸	پ	۲۸۲	ایستش جشمس الدین
۱۳۹	پر دیز شہیدی، محمد اکرام الدین	۱۹۶	ایلیٹ، بی مایں
۱۴۰	پریم جہاں، (مذہب شادانی)	پ	پ
۱۴۱	پطرس بخاری، سید احمد شاہ	۲۲۲	بارک، سرائفٹ

۶۳ نشر، عین الہدیٰ  
۲۵۷ شمارہ کاپوری

### ج

۱۹۶ جارج براؤن شاہ  
۳۷۶ جالب و بلوی، تیرہ بشارت علی  
۲۳۸ نجای، خورشید احمد  
۲۰۳ جاوید (پسر شکیل)  
۳۰۶ جاوید سلطان  
۸۷ جدو تاتہ مرکز دوسر  
۲۹۷ جگر بریلوی، شام مہربان لال  
۲۰۲، ۲۰۱ جگر مراد آبادی، علی سکندر  
۲۰۳، ۲۰۲

### جگن ناتھ

۴۰ جلال کھوسوی، خاص علی  
۳۷۸، ۱۱۸ جلال الدین، چانیان جہانگشت  
۳۸۴، ۳۸۲ جلال الدین سرخ بخاری  
۳۸۲، ۳۸۲ جلیل انجوری (فضاحت جنگ)  
۱۸۲

۲۱۵، ۲۱۴

۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۱۹۹ جمیل احمد قادری  
۱۳۲، ۵۲ جمیل منہری  
۲۸۸ جہا، محمد علی  
۲۵۸، ۱۸۲ جوش ملیح آبادی، شبیر حسن خان  
۱۱۷ جوش ملیح آبادی، بسو رام  
۲۱۲ جہان اکرا (جیم خانہ خوان)  
۱۰۰، ۹۹ جمن خان

۱۹۶ پرو، ایڈگر الین  
۲۹۲ پیرا لونی

### ت

۲۹۱ تاج محمد نجیب آبادی  
۳۱۱ تاجا چند (ڈاکٹر)  
۲۸۶ تسلیم، اساس الدین  
۳۷۹، ۳۷۸ تسلیم، امیر اللہ  
۲۸۳ تسلیم، محمد عثمان  
۲۹ تفضل حسین خان (علامہ)  
۱۰۲ تقی زادہ ایرانی  
۳۹۶ تلہا پرشار  
۳۹۳ تھکین کھلی  
۲۱۰، ۲۰۸ تنہا کھوسوی، رام سہاس

۲۵۸، ۲۵۷

۳۵۹ تیرتہ رام فیروز پوری  
۲۹۰، ۲۵۸ یحییٰ الہ آبادی، مصطفیٰ حسین

### ٹ

۱۵۵ ٹاسٹائی  
۱۹۲ ٹائن بی، آرنلڈ  
۲۵۷ شاہر پرشار کول  
۱۹۸ ٹیگور، راجندر ناتھ

### ث

۴۸ ثروت اکا بیگم  
۳۱۳ ثروت جہان  
۱۳۲ ثمر سوانی



۲۵۷	حسین احمد مدنی (مولانا)	۱۹۶	میروم کے میروم
۱۲۳	حسین خان	۲۵	جین آسٹن
۳۲۳، ۳۲۴	حسینی، علی عباس	ج	
۲۰۳	حضور احمد	۳۰۰	چراغ حسن حسرت
۲۶۳	حفظ الرحمن (مولانا)	۲۸	چکبست، برج نوائے
۳۰۰، ۲۹۳، ۲۰۰	حفیظ جالندھری، ابوالاثر	۲۱۲	چند کلا دیوی شرم
۱۷۱	حفیظ اللہ	۱۹۹	چیمک کیرن
۱۹۳	حمید علی	۱۳۸	بیرخوف
۱۹۳	حمیدہ بیگم	ح	
۱۷۱	حمید حسن خان (مولانا)	۳۱۰، ۳۰۷، ۳۱۵	حالی، الطاف حسین
۲۵۸	حمید رضا	۱۷۲، ۱۰۰، ۳	حامد علی خان
۳۱۸	حمید علی خان (نواب)	۳۱۱	حبیب الرحمن، پردھیسر
خ		۱۹۷	حجاب اطمیل
۱۲۳	خان الایا شاہ	۳۰۰	حسرت، چراغ حسن
۳۱۸	خستہ، ہرگوبال	۳۳۹، ۱۸۹	حسرت موہانی، فضل الحسن
۹۱	خسرو، امیر	۳۰۱، ۳۷۹	
۳۱۲	خضر حیات خان ثوانہ	۱۷۱	حسن بن حسن یحانی
۳۳۳	خلیق احمد نظامی	۲۹۰، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸	حسن شاہ (امیر)
۵۵	خلیل، ابراہیم علی خان (دو ٹک)	۳۳۹	حسن قرعنی، شفق مراد پوری
۳۲۹	خلیل جبران	۲۰۵	حسن بریلوی، حسن رضا خان
۲۳۲	خمار بارہ بنگوی	۱۹۹	حسن نظامی
۳۰۷	خواجہ احمد عباس	۳۸۳	حسن الحسینی (شاہ)
۱۸۹	خواجہ احمد فاروقی	۲۸۳	صیب الدین
۲۰۸	خیال کھنوی، آغا پرشاد	۲۲۸	حسین (پسر ارب)
		۹۵	حسین، امام

۲۱۵	دارہاکرشن، مرادپلی	د	
۲۹۹	داشدن، م (تذکرہ)	دارغ دلہوی، ثواب مرزا خان	۱۹۰۰ ۲۳
۳۰۶	داعب مراد آبادی		۲۴۹، ۲۵۳، ۱۱۵، ۱۱۷
۲۵۷	راگوناٹھ کول	دپرکھنوی	۵۹
۲۸۹	رجب علی شاہ (ازسلو جاہ)	درویش محمد	۲۸۳
۳۱۳	رشید احمد صدیقی	ولگیر اکبر آبادی	۱۹۳
۲۲۸	رضاعلی، میرزا (اورہ)	دلیل خان	۹۰
۲۸۸	رضوان اللہ	ویا نرائن سنگھ	۱۵۳
۲۳۷	رفعت اللہ	دیری، راجہ ناتھ کول مرمن پٹی	۳۵۹
۲۱۲	رفعت جہان (بخت شیر احمد)	دیوہ کول	۲۵۷
۲۷۵	رگبیر دال	دیوی پرشاد	۳۷۰
۳۵۵	رمز نگری، دھابھت سین	د	
۲۲۸	رنج میرٹھی، فیض الدین	ڈیرا، دل	۲۹۲
۳۵۵	ریاض الحسن بگڑی	د	
	سن	ذاکر حسین (ڈاکٹر)	۱۹۹۰، ۹۸، ۸۹، ۳۹
۳۱۵	زمیدہ کلثوم		۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵
۳۱۳، ۳۱۲، ۳۱۱	زور، محی الدین کادری		۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷
	۳۱۷، ۳۱۵	فدہ کھنوی، پورن چند	۲۰۸
۳۱۶	زہرہ (بخت سیدین)	فدہ، محمد حسین	۲۸
	من	فک دارنی	۷۳
۹۵	ساحر، احمد شجاع (حکیم)	فکیتہ (بخت سیدین)	۳۱۶
۲۱۱	ساحر، امرا ناتھ (پنڈت)	ذوالفقار علی (سید)	۱۹۲
۳۱۸	ساک، ساک، دام	ذوالقادر جنگ	۹۱
۳۰۶، ۳۰۱، ۳۰۰	ساک، مجد المجید	ر	
۲۵۳، ۵۹	سائل دلہوی، سراج الدین احمد خان	راجہ ناتھ کول مرمن پٹی دیری	۲۵۹

۳۳۶	شہد لال (پنڈت)	۳۰۷	سبحان خان
۲۷۹، ۲۷۵	سوزن بریلوی، لہور پرنسپل	۳۱۸	سبقت، مہتاب راس
۳۳	سہگل، کنہن لال (گلوکار)	۳۲۷	سفاوت حسین
۳۴۰	سید احمد بخاری	۱۹۹	سرشار، رتن ناتھ (پنڈت)
	سید احمد بریلوی	۳۱۵	سرولی، داد صاحب شستن
۹۳	سید احمد دلوی	۲۸۸	سرور جی نائیڈو
۹۱	سید حسین بگرامی (علما ملک)	۱۸۹، ۱۰۹، ۱۰۹	سرسید احمد خان
۳۱۱	سید سجاد (ڈاکٹر)	۳۹۹، ۱۹۲	
۸۷، ۸۹، ۸۵	سید سلیمان ندوی	۳۸	سرور، دھما سہاسے
۳۱۵	سید صاحب حسین	۹۱	سرور الملک سرور جنگ
۳۱۶	سید علی (مولانا)	۳۳۹	سرور شریف آبادی
۱۷۱	سید علی زبیدی	۵۲	سری کرشن سنہا
۳۱۶	سیدہ (ہنس سیدین)	۱۹۷	سریشا (جگم آبروی)
۳۱۰	سیدہ خاتون	۱۰۳	سعید انصاری
۳۳۹، ۳۳۸	سیف الدین احمد (حکیم)	۲۹۸	سعیدہ (جگم روش)
۳۱۳، ۳۱۲		۲۳۳	سجاد کھنوی
۲۵۷	سیف الدین کچلو (ڈاکٹر)	۲۰	سنگڑ کرانکی
۷۳	سیاہ اکبر آبادی (مشتوق حسین)	۲۷۹	سلام سندیلوی
۳۱۸، ۳۱۷، ۳۵۸، ۱۵۳، ۱۵۵		۲۲۸	سلطان جان بگم (سہو پال)
ش		۲۰۳	سلو (بیگم شکیل)
۱۹۹	شہ جاد جی بنارڈ	۹۱، ۳۸	سلیم پانی پتی، دھیر الدین
۳۵۵	شاعر عظیم آبادی، علی محمد	۳۰۰، ۳۱۹، ۳۱۳	
۲۵۵، ۱۲۳	شادان بگرامی، اولاد حسین	۲۳۸	سلیمان (بن عبدالرزاق)
۳۰۰	شاد پرنسپل	۹۱	سلیمان (سر شاہ محمد)
۲۹۷	شاد پرنسپل احمد	۹۱	سلیمان اشرف

۲۱۸	سید الدین شاہ	۶۳	شاہ حسین (سید)
	سید ارنگ (حبیب الرحمن خان شروانی)	۳۱۰	شاہین جلیوں (میان)
	۹۳	۲۱۹	شاہ مرین لال سونی
۵۶	سید حبیب	۹۱	شاہ محمد سلیمان (مر)
۱۲۵	سید اسید محمد حسین	۸۶	شبلی (مولانا)
۱۲۳	سید علی ایرانی	۱۵۱	شبلی (فتیہ اول)
۶۳	صغیر بگرامی، فرزند احمد	۳۱۶	شبیر علی خان
۲۰۳	صفیر (ہشت تھکیل)	۲۸	شجاع الدولہ
۲۳۸	صفیر (ہجیم ارب)	۲۱۳	شرم، چند کلا دیوی
۳۲۰	سونی، شاہ مرین لال	۲۰۸	شعاعی کھنوی، ایشور پرشار
۲۸۲	صبا قریشی	۳۳۹	شفیق عمار پوری، حسن مرتضیٰ
	صن	۳۸۲	شمس الدین المیتش
۶۳	ضو، سید احمد حسین	۲۵۷	شوگر آجاریہ (سوامی کوٹن ٹریڈر)
۱۰۱	ضیا الدین (ڈاکٹر)	۳۵۹	شوق، بنگوہن دینہ
۳۷۵	ضیا الدین قادری	۲۸۵	شوکت، محمدا شہام الدین
۱۴۰	ضیا القادری برالونی، محمد یعقوب	۲۳۲	شوکت خانوی، محمد عمر
	۲۳۰۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۰۱	۱۷۳، ۱۷۲، ۱۰۱	شوکت علی (مولانا)
	ط	۱۰۳	شیدا، اجل خان (حکیم)
۲۰۳	طارق (پسر تھکیل)	۱۲۵	شیدا، راجندر ناتھ
۳۰۶	طارق (پسر مہرا)	۱۱۸	شیل (پری بس)
۳۸	طالب حسین، فرخ آبادی (پیر)	۲۱۰	شیخو فراین، بٹناگر
۱۷۰	لطیف احمد (سید)		ص
۲۹۷	لطیف احمد شاہ	۲۲۲	صابر براری
	طیب جی (عبد الدین فیض حسن، عبد الدین)	۳۱	صابر عابد حسین
	۳۳۳	۲۰۸	سید کھنوی، پچسن پرشار

۱۸۹۰/۱۸۹	عبدالشکور د پرویسر
۳۷۵	عبدالعزیز حکیم
۳۹۱	عبدعلی سید
۳۵۲	عبدالقادر (قاضی)
۳۱۱	عبدالقادر شیخ (سر)
۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸	عبدالقادر بالونی (نایب)
۲۱۹	عبدالقادر بالونی (مولا)
۳۱۷	عبدالقادر صدیقی
۱۸۹۰/۱۸۸	عبداللطیف (ڈپٹی)
۳۸۳	عبداللطیف قادری (دایا پرادشاہ)
۳۰۲، ۳۰۱، ۳۰۰	عبدالحمد سالک
۳۱۷	عبدالحمد صدیقی
۲۱۹	عبدالمقتدر قادری
۳۰۰	عبدالله انصاری
۲۱۹، ۲۱۸	عبدالله بالونی (شیخ)
۲۹۲	عبدالله بن عباس
۵۲	عبدالله خان (ڈپٹی)
۳۸۸	عبدالله بایان
۱۷۱	عبدالودود جیرا چوہدری
۳۲۲	عبدالله سندھی
۲۸۴	عثمان (خلیفہ سوم)
۱۹۱	عثمان حسن خانی و نظام دکن
۲۸۷، ۲۸۶	
۹۳	عراقی مدللانی، نور الدین
۳۹۳	عزیز داسپوری، اقبال علی خان

۳۰۱، ۳۰۰	ظفر علی خان
۱۱۸	ظہور الدین (سید)
۵۵	ظہیر دہلوی
	ع
۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰	بابر حسین (سید)
۲۵۸	بابر رضا
۳۹۱	بابر علی خان
۵۵	باشیر محمد سید خان (ڈپٹی)
۳۰۷	عباس خواجہ احمد
۲۲۳	عبدالحسین منطقی (سید)
۲۳۶	عبدالحق (محمد دہلوی)
۲۱۵، ۲۱۳	عبدالحق (مولوی، ڈاکٹر)
۲۵۲، ۲۱۷	
۳۸۳، ۱۷۳	عبدالحکیم (خلیفہ)
۳۷۳	عبدالحکیم شاہ (دادا میاں)
۱۷۱	عبدالحکیم صدیقی
۲۵۲	عبدالحمد لاہوری
۱۰۳	عبدالحی خواجہ
۱۷۱	عبدالحی قرعنی علی
۲۹۳	عبدالحق بن محمدی
۱۷۱	عبدالحق نگرانی
۳۰۶	عبدالحق مسلم
۱۷۳	عبدالحق قادیانی ندوی
۲۹۹	عبدالحق بیدل

خ	غ
۳۲۶	میرزا حبیب
۳۵۰	میرزا گھنوی، محمد ہادی
۳۲۲، ۳۲۹	
۳۰۰	عزیز، نعر اللہ خان
۳۱۶	عزیز احمد
۲۱	عشرت گھنوی، عبداللہ (خواجہ)
۲۹۰	عصمت، رحمت حلقی (زیدی)
۸۱	عطاء محمد (شیخ)
۸۵	غلامت علی (میر)
۱۷۱	عقیل احمد جعفری
۳۷۲	علی احمد جلیپوری
۱۸۲	علی اختر حیدر آبادی
۵۷	علی اشرف (سید)
۳۸۲	علی الملوید
۲۵۷	علی برادران (شوکت علی، محمد علی)
۱۲۵	علیم اختر منظر نگری
۳۸۸	علی محمد راشدی
۳۸۲	علی نقی محمد امجدی
۹۲۰	عماد الملک (سید حسین بگلرامی)
۱۱۸	عنایت اللہ سید
۹۱	عنایت رسول چریا کوٹی
۷۲	عوض علی (سید)
۲۲۸	عیس گھنوی، میرزا ابراہیم علی
	۲۳۰، ۲۲۹
۲۱۹، ۱۱۸	غالب
۱۹۹	غفار احمد (شکیل)
۳۱۰، ۳۰۹، ۳۰۸، ۳۰۷	غلام الشعلین
۳۰۷	غلام الحسنین
۳۰۸، ۳۰۷	غلام السبلین
۹۹	غلام حسین خان
۳۰۰، ۲۸۸	غلام رسول، مہر
۲۹۰	غلام عباس صیفر
۳۷۲	غلام علی پیرزادہ (میاں جی)
۱۱۷	غلام غوث (سید)
۳۵۷	غلام مجتہد دسندی (پیر)
۲۸۰	غلام محمد خان
۱۴۷	غوث علی الدین
ف	غ
۳۰۶	فاروق شاہین
۲۳۸	فتح البیار
۹۳	فخر الدین عراقی
۲۲۱	فدا حسین (قاسمی)
۹۸، ۹۷	فدا حسین خان
۲۵۸، ۱۵۲	فراق گوردھوری، دگھوچی سہاسے
۲۱۱	فراقی دریا بادی، ملا سید ناز علی
۲۹۷	فرحت، گنگا دھڑا
۲۲۸	فرخندہ محنت (میرزا)
۲۹	فضل حسین خان (میرزا)

۱۸۱	سلیم الشہ جہانگی	۲۲۱، ۲۰۱	فضل رسول بالونی
۲۳۶	کمال حبیب	۶۳	فضیلت الفاسیحیم
۲۵۸	کینٹی، برج پورین دناقرہ	۷۰	فقیر عزیز الدین
	<b>گ</b>	۷۱	فقیر نور الدین
۲۸۸، ۲۸۰، ۱۸۹	گاندھی (مہاتما) ۳۲	۱۸۱	غلام صدیق احمد قاضی
۱۶۶	گبار دمر پرشاد	۱۷۰	غیاث احمد
۳۳۷	گل حسین	۱۸۲	غین، فیض احمد
۲۱۹	گنپت سہلے (نقش)	۲۱۶	غین محمد
۲۵۲	گنگا سنگھ (مہاراجا)		<b>ق</b>
۲۰۳	گوپال روڈی، بی	۲۱۰	قادر بخش مولوی
۲۱۰	گوری سہاسے (ڈاکٹر)	۲۸۹	قاسم رضوی
۲۶۶	گوکرن پرشاد	۲۵	قائم علی (خان بہادر، سید)
۳۱۲	گمین آزاد بیگم بشیر احمد	۳۸	قرۃ العین حیدر
	<b>ل</b>	۲۹۹	کمر سنبھلی
۲۵۳	لاری، قبول احمد	۳۳۰	قیس، شمس الہدی
۲۲۰	لال بہادر شاستری	۲۰۸	قیصر لکھنوی، جگدہا پرشاد
۱۱۸	لانگ فیلو	۷۳	قیصر بھوپالی، محمد یوسف
۳۸۹	لائق علی (میر)	۲۰۳، ۲۰۰	قیصر حسین قادری
۱۹۶	لٹن، لارڈ		<b>ک</b>
۲۵۸، ۲۵۷	لغت سنہین (سید)	۲۰۲	کاردار (سٹر)
۳۵۹	لقہ مارڈ	۲۶۶	کالہا پرشاد
۲۶۳	لیاقت علی خان (ساجزادہ)	۶۰، ۵۹	کامل نظامی
	<b>م</b>	۲۵۷	کرشن دیرتھ، سوامی (شکر آپاری)
۳۹۰، ۶۳	مالک رام	۲۹۹	کلب علی (حکیم)
۱۸۶	میل دلپور، مرزا محمد تقی بیگ	۳۱۶	کلب علی خان (نواب)

۲۳۸	محمد شریف	۱۹۹	بابک علی سوز
۲۸	محمد شفیق (میرزا)	۲۵۹	جنتی (پسر سلطان نوری)
۳۱۲	محمد شفیق (میرزا)	۲۵۸	جنتی احسن
۱۲۰	محمد عبدالملک	۳۲۵	جنون کور کسوری احمد صدیق
۳۵۴	محمد عثمان عارف	۲۸۳	صوب (بیگم ماب)
۳۰۱ + ۲۵۴ + ۱۲۰ + ۱۰۱	محمد علی (مولانا)	۹۰	صوب عالم (نشی)
۲۲۸	محمد علی شاه (دود)	۹۱	صوب علی خان (نظام دکن)
۳۴۳	محمد گیسو راز	۳۴۹	مشر سوانی
۳۱۸	محمد فضل الرحمن	۱۲۶	محمود الحق
۱۹۲	محمد قاسم خان لوری	۵۲	محمود الحق (جامی)
۸۹ + ۸۵	محمد حسین (اکبر)	۲۰۰ + ۲۱۹ + ۲۵۰ + ۹۱	محمد رسول الله
۱۰۲ + ۱۰۳ + ۱۰۴	محمد حبیب (پرویس)	۱۸۹	محمد ابرار حسین خادوقی
۳۲۱ + ۳۲۱		۳۹۰	محمد اعلی خان
۳۲۹	محمد محفوظ	۲۸۵	محمد اشتام الدین
۹۰	محمد سجاد الله خان مقبول	۱۲۳	محمد اکرام، شیخ
۸۹ + ۹۰ + ۹۱	محمد حسینی خان شروانی	۲۹۴	محمد اکرم غنیمت کجانی
۹۲ + ۹۲		۲۸۹	محمد اقر
۲۴۲ + ۲۴۱	محمد نذر	۱۲۵	محمد فضل الله خان
۳۳۱	محمد نسیم	۳۱۳	محمد جعفر
۳۳۱	محمد نسیم	۱۵۳	محمد حسن حافظ
۱۹۲	محمد یعقوب	۲۴۶ + ۲۴۵	محمد حسین، نشی
۱۸۱	محمد یعقوب	۳۲۹	محمد حسین بیکل
۲۱۹ + ۲۱۸	محمد یعقوب	۳۱۳	محمد سرور (حاجی)
۱۹۸ + ۱۹۳	محمد بیگم	۱۴۱	محمد سلیم کشتوری
۱۹۹	محمد (میش تید)	۲۳۳	محمد طلیحان (سر شاه)
		۳۶۲	محمد طلیحان عباسی (قاضی)



۳۳۲، ۱۹۹	مولیٰ کمال خیر	۱۱۷	عمود الحسن (مولا)
۲۵۱	مولا بخش (شیخ)	۲۸۶	عمود الدین مشائی، ابوالفضل
۳۷۸، ۱۲۵	موسیٰ	۲۹۳	عمود
۵۹	موسیٰ کمال بھنگ		عمی الدین قادری زور، دیکھیے زور
۲۲۹، ۲۲۸	مہدی حسین، میرزا	۳۱۰	فتار خاں
۲۱۸	مہتاب علیہ بہت	۲۲۸	فہوم علی الدین
۳۰۰، ۳۸۸	مہر، غلام رسول	۹۱	مژگ الشرفان (نواب)
۲۷۹	مہر بریلوی، گویشور رائی مہر	۳۱۰	مستمن زیدی
۲۱	میر، میر تقی	۳۱۰	مصدق خاں (سالار علی حسین)
۸۰	میر حسن، مستید	۲۵۸	مصطفیٰ حسین
۸۵	میر محمدی (حکیم)	۲۷۱، ۱۵۵	مضطر فیاضی
۳۰۰	میکش، مرتضیٰ احمد خان	۲۰۸	مطلق کسنوی، اور کے راج
۳۱۰	میکنزی (مستر)	۳۷۱، ۲۵	منظر علی (میر)
۲۹۳	مینو میر	۱۲۳	منظر علی شاہ ایرانی
	ن	۷۳	منظر علی (شفا گویا لاری)
۲۹۸	ناصر رضا	۲۳۱	منزور، میرزا محمد عزیز
۳۰۵، ۱۷۰	ناظر حسین	۲۵	مصوم علی (میر)
۸۹، ۱۸۵	نجیب اشرف ندوی	۳۰۷	نگہ علی (خواجہ)
۲۰۳	نجم (بنت عقیل)	۱۹۳، ۱۹۲، ۳۹	نواز علی (مستید)
۳۹، ۲۵	نذرا باقر (میر)	۲۸۳	نقشہ دافتر، رشید الدین قادری
۲۵	نذر زہرا بیگم	۲۷۱	نقش، سعادت حسن
۲۸، ۳۷، ۳۹	نذر تجا میرد	۱۹۹	نظر علی سوختہ
۲۹، ۲۵	نذیر احمد (شخص العلماء)	۱۰۳، ۱۷۳	نظرو علی، سلطان الطینی
۳۷۸	نسیم، صفر علی خان (نواب)	۲۰۸، ۵۹	نور کسنوی، بیشیشور پراد
۳۰۰	نصرا شرفان عزیز	۳۵۸، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹	

۲۲۸	داعد خاتون	۵۴	نصیر الدولہ (فونک)
۲۶۶	دارش علی شاہ (دیوبند)	۲۶۴	نصیر الدین، چراغ دہلی
۱۴۴	دعشت کلکتوی، رضاعلی	۲۱۷	نصیر الدین ہاشمی
۲۳۶	دعید الحق حقی	۲۱۸	نظام الدین (نواب)
۳۱۴، ۹۱، ۴۸	دعید الدین سلیم پانی پتی	۲۱۰	نظام الدین (مولوی)
۳۱۶، ۳۰۰		۲۶۴، ۳۳۲	نظام الدین اولیا
۲۸۲	دعید الرحمن (پروفیسر)	۲۱۱	نظر، فوبت رائے
۲۵۵	دسل بگرامی، مقبول حسین	۲۴۶	نعمان احمد (قاضی)
۵۹	دنا، دھرم پال گپتا	۲۹۴	نفس کشوی
۲۳۰	دقار، دانش صاحب	۲۸۴	نواب علی، متید، چورسری
۸۱	دکھار الملک، مشتاق حسین (نواب)	۲۲۲	نور، یوسف حسن
۲۵۹	دیراناں علی (حکیم مصطفیٰ زیدی)	۲۶۲	نور احمد
	د	۵۲	نور احمد
۸۵	باشم شیر	۳۴	نور الحسن (شیخ)
۱۹۹	دایت اللہ مونس	۱۸۲	نورانی بیگم
۳۱۱، ۳۱۰	ہمایوں، میاں شاہدین	۸۱، ۳۷	نور محمد، عرف میاں حقو
۳۱۱	ہمایوں کبیر	۳۳۲، ۳۱۵، ۲۵۲	نوری، نور اللہ
۱۹۶	ہیسوگو، دکتر	۲۰۲	نوشاد علی (ستید)
	ی	۲۵۲	نہال سنگھ (رائے بہادر)
۲۱۸	یاد حسین (شیخ)	۳۰۰	نیاز فطوری
۲۵	یاس یگانہ، واجد حسین	۳۰۵، ۲۵۰	نیاز احمد
۲۹	یلدرم، بجاوید	۲۰۸	نیماں، اما پرشار
۲۲۲	یوسف حسن فخر		و
۸۹	یوسف خان	۲۲۸	واجہ علی شاہ (اورنگ)

## ۲ مطبوعات (کتب رسائل)

۲۸۱	اجالا (ہندی)	۲۳۰	آتش بک (ہجر)
۳۷، ۳۹	اختر النسا بگم (ہندو سماج)	۲۹۷	آجکل (ماہنامہ دہلی)
	ادب اردو میں کشمیریوں کا حصہ	۱۹۵	آرام کے ڈرامے (تاج)
۳۵۹	(طالب)	۱۹۹	آرمز اینڈ دی مین (شاہ)
۲۱۲	ارامے کفر (منہا)	۵۲	آزاد (روزنامہ)
۳۱۷	اردو (تجاری)	۲۸۱	آسان ہندی (باسط)
	اردو غزل گوئی اور اردو دہرائی	۱۳۱	آشفہ سری سری (ناظر)
۱۲۷	(عذلیہ)	۳۸	آفتاب وطن (آفتاب)
۳۱۸	اردو کی ادبی تاریخ (سرمدی)	۳۱۳، ۳۱۰	آندھی میں چرخ (سیدین)
۱۳۳	اردو کے ہندواریب (ناظر)	۱۱۰	آواز غالب (شاہ)
۳۱۸	اردو شاعری کا ارتقا (سرمدی)	۳۷	آہ مظلومان (ہندو سماج)
۱۰۳	اردو سے ملی	۱۱۰	آہیں (شاہ)
۵۲	استقلال (پٹنہ)	۳۲۵	آئینہ دل کنگ (اختر تہری)
۲۳	اسلام اور نظریہ شرافت (رفیق)	۱۹۳	آئی سی ایس (حسینی)
۳۳۴	اسلامی تصوف کا آغاز (حبیب)	۱۱۰	آیات جنوں (شاہ)
۳۲۹	اشک و شبنم (اشعر)		ا
۳۱۳	اصول تعلیم (سیدین)	۳۲۵	ابتلائے عظیم (اختر تہری)
۲۱۴	افکار بلند و منور	۱۰۸	ابو خان کی بھری (ڈاکٹر حسین)
۷۰	اقبال الی بکچرز (انگریزی)	۳۰	اتحاد (ہفتہ وار)
	اقبال کا تعلیمی فلسفہ (انگریزی، سیدین)	۳۰	افرستان (اثر)
۳۱۴		۳۰	اثر کے تنقیدی سناہین (اثر)

۲۱۲	المیزان روز ویٹ (منوی)	۲۲۱، ۲۰۱	اکمل التاريخ (صیا)
۲۵۲	ب	۹۳	البشیر (امارہ)
۲۵۲	بادشاہ نامہ (عبدالحیدر پوری)	۲۶۳	البعیثہ و المناس
۲۸۲	باسط کے سوشل	۲۹۳	العرف (ماہانہ)
۱۶۳	باسی پھول (حسین)	۹۲	المبین (سلیمان اشرف)
۲۵۳	بانچ فردوس (میدل)	۲۱۲	الہامات ایرانی (منوی)
۲۰۵	بال جبریل (اقبال)	۲۱۳	الہامات مغرب (منوی)
۲۰۵	بانگ درا (اقبال)	۳۹۹، ۳۹۸	الہلال (ہفتہ وار ہفتہ)
۱۱۰	بنکدہ (شار)	۱۷۲	الی اکواخ الفقرا (منظوم)
۱۸۲	برگ آوارہ (جانی)	۱۶۳	امیر خسرو کی کہانی (حسین)
۲۶۳	برہان (ماہنامہ دلی)	۱۹۳	امارکلی (تاج)
۲۳	بزم داغ (رفیق)	۷۱	انجمن (غیر جمعیہ)
۱۳۸	بساطِ قص (مخدوم)	۱۱۰	اندر غالب (شار)
۲۹۳	بشر ہے کیا کہیے (ماہ)	۲۲۲	انڈی پندرٹ (روزنامہ کشنی)
۹۲	بشری (چریاکوٹی)	۱۳۷	انٹائی ابوالفضل
	بہی میں اردو کا پہلا ڈرامہ - خورشید	۲۰۳	انقلاب (روزنامہ لاہور)
۱۹۵	(۱۳۱)		انگریزی ادب کے اثرات ادو ادب پر
۲۴۹	ہفتہ کا پھول	۳۶۵	(طبیعت)
۳۰	بہاراں (اثر)	۳۱۶	انگریزی افسانے
۲۱۰	بجارت (ہفتہ وار)	۲۰۹	ادو اخبار
۲۰	بہارستان (اثر)	۲۱۳	ادو صورت کا ترانہ (منوی)
۲۹۰، ۲۵۹	بہار گلشن کشمیر (تذکرہ)	۲۰۷	ایجوکیشن (اسپنسر)
۳۰۰، ۲۰	بھگوت گیتا (کی شری)	۲۹۸	ایشیا (ہفتہ وار)
۲۳	بیگناہ مجرم (مسدوش)	۲۹۲	ایف و ڈاٹ (انگریزی)؛ پیرالونی
		۱۶۳	ایک صورت ہزار جلوے (حسین)

پ	پ
پاس نگر بیان (اریب) ۱۲۸	۳۱۲ آثار منتقد (سوق)
پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری	۳۶۸ ۱۰۱ (دہانہ مارگرہ)
۱۱۰ (شاد)	۳۲۹ ۱۰۲ (اشعر)
پانچ مقبول فنس و مزاج نگار	۳۶ ۱۰۳ (جلیپور)
۱۱۰ (شاد)	۳۳۱ ۱۰۴ (مضامین دنیا)
پرائڈ اینڈ پریجورس ۱۹۰	۳۵۶ ۱۰۵ (تاریخ بلگرام دار)
پرستوی دہلی چوبلی (تیرتہ رام) ۳۵۹	۳۳۳ ۱۰۶ (تاریخ ہندو ہند سلطنت)
پریم (دہانہ مارگرہ) ۳۶۸	۳۳۳ ۱۰۷ (تاریخ فیروز شاہی برنی)
پردہ اور اسلام (علی بہادر خان) ۳۰	۳۴ ۱۰۸ (تاریخے سعد شن)
پکار (اشعر) ۳۲۹	۹۵ ۱۰۹ (خلیفہ حیات پرورد)
پکار (ہفتہ وار) ۲۸۱	۱۴۴ تحقیقی مضامین (مندیب)
پھول (ہفتہ وار لاہور) ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴	۳۴ ۱۱۰ (تخیلات (افضل علی)
۳۰۱، ۱۹۳	۳۱۱، ۳۹۰ ۱۱۱ (ترجمان القرآن (آثار)
پھوار (شاد) ۶۱۰	۸۴ ۱۱۲ (ترجمہ مولانا (مندی)
پھولین (امین ناشلی) ۳۱۸	۳۰ ۱۱۳ (ترجمہ زبان (علی بہادر خان)
پھولین (مندی) ۱۳۸	تذکرہ جواہر زوہر و محمد ابراہیم خاوری
پھولوں کی چھتری (حسین) ۱۶۳	۱۸۹
پیام اقبال (مندیب) ۱۳۴	۲۸۶ ۱۱۴ (تذکرہ شعراء صیورہ شائلی)
پیام فلک (فلک) ۱۸	۲۱۲ ۱۱۵ (تعبیر منظوم (سوق)
پیام شرق (اقبال) ۱۶۶	۱۰۸ ۱۱۶ (تعلیمی خطبات (ذکر حسین)
پیام وطن (روزنامہ) ۵۲	۱۰۹ ۱۱۷ (تفزیح (ہفتہ وار)
پیام یار (دہانہ مارگرہ) ۹۰، ۲۸۰	تفصیل ایمان فی تمامہ القرآن
پیشانیار (لاہور) ۱۱۹، ۹۱	۱۹۳ (منازل علی)
	۳۳۸ ۱۱۸ (تذکرہ غالب و ایک نام)

۳۱۰	جذباتِ جلیوں (شاہین)	۱۹۰	تنقیدی سرمایہ (عبدالشکور)
۲۱۲	جگر بے تخت تخت (منور)	۳۲۵	تنقیدی شعور (اختر گلبرگی)
۳۸	جلوۂ آفتاب (آفتاب)	۱۳۳	تنقیدی شعور (ناظر)
۲۲	جلوۂ امن (رفیق)	۳۰۰، ۱۹۴، ۱۹۲	تہذیبِ انصواں (لاہور)
۱۱۹	جلوۂ یار (ماہنامہ گھنٹوں)	۲۱۰	تیک (روزنامہ دلی)
۱۹۹	جوابِ شکوہ (اقبال)	ف	ٹ
۲۲۱	جوار غوثِ الہوری (ضیا)	۳۲۹	ٹوٹے ہوئے پردا (اشعر)
۳۱۰	جواہراتِ عالی (عالی)	ف	ث
۳۰۹	جوش و ہوش (میتھ)	۳۹۸	ثریا (ماہنامہ، لکھنؤ)
۱۷۲	جوبہِ ہفتہ وار (نبی)	ج	ج
۳۵۹	جوہرِ آمینہ (طاب)	۱۳۳	جامِ بخونہ (منور)
۲۸۲	بیون رکھا (باسط)	۳۷۹	جامِ جہاں نما (ماہنامہ گھنٹوں)
ج	چ	۱۸	جامِ نلک (نلک)
۲۱۳	چار دوست (منور)	۱۰۸	جامِ نو کیا ہے (ڈاکٹر حسین)
۱۹۹	چچا پھکن (تاج)	۳۷	جانبار (مذہب)
۲۱۲	چراغِ دیر (منور)	۱۱۰	جانِ پیمان (شاہ)
۲۹۵	چنار (ماہنامہ سرگلر)	۱۳۳	جائزے (ناظر)
۱۴۳	چند کلا (ناظر)	۱۹۹	جپ جی (ترجمہ محمد اہل خانہ)
۴۳	چندن (افانے)	۳۱۶	جدید اردو شاعری (سرور کی)
۴۲	چندک (ماہنامہ)	جسید بین الاقوامی سیاسی معلومات	
۱۳۷	چہاں خاں (روحانی سرمدی)	۲۹۳	(آزاد)
۳۰	چھان بین (اش)	۲۹۳	جدید سیاسی معلومات (آزاد)
۱۳۷	چھوٹا خدا (مندیب)	۳۷۱	جذباتِ سامی (سامی)
۱۳۸	چیرہ (چاند گھوٹ)	۳۸	جذبات کی دنیا (آفتاب)
۳۱۶	چینی اور جاپانی افسانے	۳۸	جذباتِ وطن (آفتاب)

۵	۱۱۰
۲۱۲	چین بیل (شار)
۲۹۲	ح
۱۵۲	حالی: مب وطن (ذکر حسین)
۲۰۸	حالی کا نظریہ شاعری (ناظر)
۲۱۰	حباب کے ڈرامے (ناظر)
۲۱	حب وطن (آفتاب)
۹۲	حدیث راز (راز خان پوری)
۲۱۳	حدیقۃ المذاہب (تسلیم)
۱۱۰	حمران نصیب (نذر جبار)
۳۲۹	حسرت موہانی (عبد الشکور)
۳۲۳	حسن (انسانہ حیدر آباد)
۲۶۳	حضرت امیر خسرو (حبیب)
۲۶۳	حکومت الہیہ (علی بہادر خان)
۲۱۶	حکیم بابا (حسین)
۱۵۲	حیدر آباد کے شاعر
۱۳۷	حیدر آباد لا پورٹر (انگریزی)
۱۱۰	خ
۳۰	خاوند (انسانہ ڈھاکہ)
	خجروش اور کچوا (ذکر حسین)
۱۹۰	خطوط غالب (مہر)
۲۶۵	خلافت (مورزا اسماعیل)
۲۵۶	خمسہ خسروی
۲۲۱	خورشید (مورزا کرچی)
۱۰۸	خون کے آنسو (منور)
۲۱۵، ۲۶۳	

۳۷۹	دساکن قصوف (انقر)	۲۸۶	دیوان شائل
۳۵۹	رجمات التحصیل (طالب)	۱۰۴	دیوان شیدا (اجمل خان)
۲۰۳	رمائیاں (تکلیف)	۱۰۴	دیوان غالب (اردو)
۱۶۳	رفیق تہلی (حسین)	۱۳۶، ۱۳۵	دیوان غالب (فارسی)
۶۵	رقعہ حیات (پرویز)		ڈ
۵۵	رقعات عالمگیر (نجیب اشرف)	۱۱۰	ڈارلنگ (شار)
۷۴	رگ حیات (شفا)	۱۶۰	قائد اوس (ابن)
۲۱۳	رگموش (منو)		ڈفرنٹ کچول زونز ان انٹرا
۱۶۶	رموز بخودی (اقبال)	۳۸۷	(لطیف)
۳۰	رنگ بست (امش)	۱۶۳	ڈنگون کا پاشا (حسین)
۲۰۳	ریختیاں (تکلیف)		ڈ
۳۱۳	رواج حزیب (سیدین)	۲۱۳	فکے سے آفتاب (منو)
۲۱۳	روحانی مطالعہ (منو)	۱۰۷	ذکر حسین (ذکر حسین)
۷۰	روزگار فقیر (فقیر و حید الدین)	۳۱۳	زہن انسانی کا ارتقاء (سیدین)
۲۹۰	روشنی (مصطفیٰ زیدی)		ر
۱۹۰	روزنامہ الرضوان (مبداء شکوہ)	۱۶۳	راج ہٹ (حسین)
۱۹۶	روشنی کے خدائے (راج)		راست کا بھولا اور دوسرے امانے
۳۷۹	رہنمائے شاعری (انقر)	۳۱۸	(مروزی)
۸۷	رہنمائے صحت (نجیب اشرف)	۳۲۹	راز و نیاز (اشعر)
۱۰۷	ریاست (ذکر حسین)	۱۱۰	راکو تلے (شار)
۱۷۳	ریاض (اپنا، کراچی)	۲۱۲	رائس وایلی نشر (منو)
۹۰	ریاض الاخبار	۲۱۳	رام کھار منو
۳۲۹	ریت اور جہاں (اشعر)	۱۳۷	ربا حیات بابا ظاہر عریاں (مندیب)
۲۶۳	ریٹ اسٹار اور چائنا (انگریزی)	۱۷۵	رباعیات غلام (داقت)
۲۱۲	ریزہ گل (منو)	۳۲۹	رضاء (اشعر)



۲۲	سدا بہار جہول (سدرشن)
۱۲۵	سدرہ دلوئی (الم)
۲۱۸	سراج ادواس کی شاعری (سروری)
۲۱۸	سراج سخن (سروری)
۲۶۵	سرخ بچے (آزاد)
۲۶۳	سرخ چین کے دھنپا (آزاد)
۱۱۰	سرخ ماشیے (شار)
۱۳۸	سرخ سویرا (مخدوم)
۱۶۳	سرتیادھپا شا (جینی)
۲۲۳	سرفراز (روزنامہ لکھنؤ)
۱۱۰	سرقہ اور تواریخ (شار)
۲۳۲	سرائے لکین (لکین)
۲۶۶	سرور سروری (ناشاد)
۲۱۳	سری روپ کا دستور
۲۷۹	سسی محل (افقر)
۷۱	سفرائہ منشی امین چند
۱۲۵	سلبیل (الم)
۲۸۵	سلطۃ الذہب (شوکت)
۲۳۲	سلطان محمود غزنوی (حبیب)
۲۹۹	سلطنت (میدر آباد)
	سمند کی جوان اور دوسرے افانے
۲۱۳	(منور)
۱۱۰	سمند کی شہزادی (شار)
۱۱۰	سنگم (شار)
۱۳۳	سنبھرا ملکہ (ناظر)

من	زبان اور علم زبان (سروری)
۲۱۸	زبان داغ (رضیق)
۲۳	زبان، زندگی اور تعلیم (سیدی)
۲۱۳	زبور ہم (اقبال)
۱۶۶	زخم گل (شفا)
۷۲	زترین افانے (راز)
۱۵۴	زمران ناز (منور)
۲۱۳	زبان (ماہنامہ کانپور)
۲۶۷، ۱۵۳	زمیندار (روزنامہ لاہور) ۳۱، ۳۲، ۳۳
۳۱، ۳۲، ۳۳	زمینداری (تین بھائی دیکھ)
۲۹۰، ۲۵۸	زنگاری بیگم (اثر)
۲۰	زہر طاعون آب حیات (سدرشن)
۳۲	ص
	سات خارے (آزاد)
۲۶۵	ساز حیات (فرحت)
۵۹	ساقی (ماہنامہ دلی وکراچی)
۲۶۷، ۱۳۷	ساقی نامہ (فرحت)
۶۰	ساگر سنگیت (منور)
۲۱۳	سبد تیارہ (ناظر)
۱۱۹	پچ جھوٹ (آزاد)
۲۶۵	پچی کہانیاں (مندیب)
۱۳۷	تاروں سے آگے (ناظر)
۱۳۳	تارہ چشت (ضیا)
۲۲۱	تارہ محوری (علی احمد چلیوڑی)
۳۷۲	

۲۱۳	شکشا (منقول)	۸۷	سوراج (نجیب اثرات)
۱۹۹	شکوہ (اقبال)	۲۱۲	سوز اقبال (منقول)
۱۰۸	شکشا (ذاکر حسین)	۲۱۲	سوز وطن (منقول)
۳۸	شمشیر وطن (آفتاب)	۲۲	سولہ سنگار (سدرشن)
۳۲۵	شہادت منشا (اختر تلمیہ)	۱۹۹	سیرۃ محمد رسول اللہؐ (محمداجل خان)
۲۶۰	شہر آفت (مصطفیٰ زیدی)	۱۷۲	سیرۃ محمد علی (دیس احمد حفی)
۳۲۹	شہناز (اشعر)		سیرۃ الحمید فی احوال سعیدہ
۳۱۳	شہید وفا (یتیم)	۲۲۱	(فدا حسین)
۳۲۹	شیطان (اشعر)	۲۶۵	سیرۃ صحابہ (آزاد)
	ص	۱۵۳	سیاہ انجمن آبادی (ران)
۳۲۲	صباغت اسعد (شکین)		ش
۲۹۲	صحیفہ (تجاری، لاہور)	۷۳	شاعر زیتون (شنا)
۲۹۹	صحیفہ خوشنویسان (شاعلی)	۲۹۸	شاعر ہا پناہ (آگرہ دہلی)
۱۵۵	صحیفہ ہراز (ران)	۲۷۹	شام بہاریں (دیا)
۲۱۲	صنعت (منقول)	۱۱۰	شام نگر میں سینا آیا (شار)
۲۰۳	صنم و صرم (شکیل)		شاہ گلین حفی تجی اور ان کا کلام
۲۱۳	صیبا کے نام (منقول)	۱۹۰	(عبدالشکور)
	ض	۲۰۰	شاہنشاہ اسلام (حفیظ)
۳۰۵	ضرب کلیم (اقبال)	۱۹۳	شاید کہ بہار آئی (مبینی)
۱۹۰	ضرب دی باہیں (عبدالشکور)	۲۰۳	شبستان (شکیل)
	ط	۱۸۲	شرائے (جامی)
۲۱۸	طبقات اکبری (نظام الدین)	۲۹	شمسیت (انجمن دیوبند و آفتاب)
۲۱۲	طہر زندگی (بشیر احمد)	۲۲۵	شعر ادب (اختر تلمیہ)
۲۱۲-۲۱۱	طوائف نجم (منقول)	۲۱۲	شعری ناکے (منقول)
۳۱۷	طیلسانیں (حیدر آباد)	۳۵	شہزادہ (سراج)

۳۰	فرنگ اثر (اثر)	ظ	ظریف کے ٹولے (آسی)
۱۱۰	فریاد (شار)	۱۹۶	
۱۹۰	فضل الرحمن اسلامیہ کالج بڑی میگزین	ع	
۳۰۵	فلسفہ تعلیم (غلام الحسنین)	مشتاق اہر (عراقی)	۹۳
ق		حصر جدید (اہنامہ، میرٹھ)	۳۰۹
۱۱۰	قاسمیں (شار)	طوسی تصورات (آخر تلہری)	۳۱۵
۳۹۰	قبائے ساز و مصطفیٰ (یدی)	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	۹۱
۳۱۶	قدیم خانے	علی گڑھ کی تعلیم تحریک (سیدین)	۳۱۳
۱۹۲، ۹۵، ۱۲۵	قرآن	علی گڑھ سنگتیں	۱۹۰
۱۳۵	قصائد قافی	عمر فاروق اعظم (اشعر)	۳۲۹
۳۱۸	قصہ شہنشاہ (منقذ)	عورت کی نسبت (سداش)	۳۳
۳۱۳	قوی سیرت کی تشکیل (سیدین)	خ	
۲۹۳	قیامت کی بات (عابد)	غالب (مہدی لطیف)	۳۹۳، ۳۹۲
ک		غالب (مہر)	۳۰۳
۳۱۲	کارنامہ اسلام (بشیر احمد)	غالب انسا ئیکلو پیڈیا (تیرہ پوروی)	۳۵۲
۹۱	کارنامہ سروروی (سرور الملک)	غالب اور اس کی شاعری (شار)	۱۱۰
۳۰۰	کاروان (روش صدیقی)	غالب، دیوان (نسخہ سعید)	۳۹۳
۵۲	کاروان ہند (ہفتہ وار)	غالب، دیوان (نسخہ عرش)	۳۹۳
۱۹۳	کاشوں میں پھل (مبین)	غریب خانے تک (دیس احمد جعفری)	۱۰۱
۳۱۲	کائنات دل (منقذ)	ف	
۱۹۳	کچھ جی نہیں (مبین)	فانی (میلادشکور)	۱۹۰
۳۱۶	کردار و انسانہ (سروروی)	فادوسٹ (منقذ)	۳۱۳
۲۵۹	کرم (اہنامہ، الہ آباد)	فرانسیسی خانے (عزیز احمد)	۳۱۶
۳۵۹	کشور کا فارسی ادب (طالب)	فرویں سانی (افقر)	۳۰۹
۳۱۸	کشور کے دو ادیب (سروروی)	فرنگ آصفیہ (میداحی)	۹۳

۱۳	مکتبہ نعل منظوم (منقذ)	کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ (سروری)
۲۱۳	مکتبہ نعل نثر (منقذ)	۳۱۸
۲۱۳	گیت گودند (منقذ)	۱۸
	ل	کلام فلک (نک)
		۳۱۸
۸۸	لغات گبری (نجیب اشرف)	کلیات سراج (سروری)
۱۱۰	لکار (شار)	۳۸۹
۹۳	لغات (عراقی)	کلیل بن لیل (ناطق)
۲۱۳	لکھن لکھا (منقذ)	۱۱۹
۱۹۹	لیا یا سامو غراط (تاج)	۲۱۳
۱۶۵	لیلی بھون مشنری	کنز المطالب، شرح دیوان غالب (ناطق)
	م	۱۱۹
		۱۲۵
۱۰۷	ادبی مسامحات (ذاکر حسین)	کوش و تسنیم (الم)
	ارشد شیوا اور جہوریہ یوگوسلاویہ	۱۶۳
۲۹۳	آذان	کوفہ (مصطفیٰ زیدی)
		۲۶۰
۱۵۵	اشا (راز)	کیف سروری (ناشار)
۲۱۳	القی ادمو (منقذ)	۲۹۷
۲۱۳	الویکا گنی نتر (منقذ)	ح
۳۳۲۰۳۳۰	تاج تسکین (تسکین)	حاصلے امان حسین
۲۵۰۰۲۳۹	تاج شوق (شافی)	۱۹۲
۲۰۹۳	حاجن کلام غالب (بھونری)	۲۱۳
۱۱۰	حاجرات غالب (شار)	۱۹۰
۲۰۲۰۳۰	حجاب غزل (روش)	۸۱
۷	حسن اعظم (فیروز و میدانی)	۱۳۸
۳۰	مہر و فری (علی بیگ خان)	۲۱۹
۳۷۹	نقشہ سرختری باقی دارت علی شاہ (افقر)	۳۳۲
		۲۸
		۳۷۹
		۱۹۹
		۱۲۵
		۱۲۵

معاشیات: مقصد و منہاج	۲۱۱، ۱۱۹	فرین، امانہ، لاہور،
۱۰۷ (ذاکر حسین)	۲۱۲	عبدالکاشف (منٹو)
۱۰۷ معاشیات قومی (بکرمین)	۲۹	درین (بجنور)
۱۲۵ معرکہ ٹنگرہ (الم)	۱۹۹	ڈوسرہائے قدیم (حکیم)
۲۱۲ معروضات (سختہ)	۲۷	ذہب اور عشق (نذہد جبار)
۳۰ معین انسان (امانہ اسمی)	۲۲۵	فرہنگ قصائد (اختر تلہری)
۲۷۹، ۲۷۵ مفید و فکار (ہفتہ وار اسمی)	۲۱۸	مراقبہ الامرار (شاہ صدر الدین)
۲۲۵ مقالات تلہری (اختر تلہری)	۲۹۰، ۲۵۹	مرقعہ انکار (طالب)
۸۷ مقدور قعات مانگیر (نجیب اخرف)	۲۲۱	مرقعہ شہادت (منیا)
۲۱۹ مقدور شعرو شاعری (حال)	۲۵۲	مرقعہ غالب (خیر)
۲۲۲ مکاتیب بکر (تکین)	۳۰	مزامیر (اثر)
۲۰۹ مکالمات ابوالکلام (مقتل معمری)	مسلمانوں کا امن، حال اور مستقبل	
۲۱۹ مکتبہ امانہ جدید بازار	۲۱۲	(بشیر احمد)
۲۲۲ مکتوبات مرزا (تکین)	۲۸۷	مسلم لیگ انڈیا (لطیف)
۲۲۱ مناقب اولیائے قادریہ (ضیا)	۱۳۷	مشرق پاکستان (روزنامہ، ڈھاکہ)
۱۸۲ منزل کی طرف (جامی)	۲۱۸	مشورہ (آگرو)
۲۸ من موہنی (آفتاب)	۲۷۲، ۲۷۱	مقصود (امانہ اسمی)
۱۹۹، ۱۹۳ موت کا راگ (ناج)	۲۰۸	مضامین اصلاح و ترقی (شمسین)
موج میری صدف صدف	۱۳۲	مطالعہ انیس (ناظر)
۲۹۰ (مصلحی زیدی)	۱۳۲	مطالعہ حالی (ناظر)
۲۲۲ مولانا ابوالکلام آزاد (حبیب)	۳۳	مطالعہ شبلی (ناظر)
۲۷۹ مولانا بیچ (ہفتہ وار، بیچ)	۳۰	مطالعہ غالب (اثر)
مولانا سوری کی اسلامی نقطہ نظر پر مبنی	۱۳۲	مطالعہ وحدت (برجود)
۲۲۵ (اختر تلہری)	۱۱۰	مطالعہ (شمار)
۱۸ مہاجرات (نگ)	۹۱	مطلع الانوار (امیر خسرو)

۳۷۹	نظر کاوا (افقر)
۳۳۳	نظم و نسق ایران (حبیب)
۳۰	نغمہ سفار و نسق (اثر)
۲۲۱	نغمہ ربانی (خیا)
۲۰۴	نغمہ فردوس (شکیل)
۱۹۳	نقاد (ماہنامہ، آگرہ)
۲۸۲	نقش آئندہ (باسط)
۱۳۷	نقش بدیع (عندلیب)
۳۵۵	نگار (ماہنامہ، لکھنؤ)
۲۵۹	نوائے ادب (ماہنامہ، بمبئی)
۱۵۵	نوائے راز (راز)
۲۱۲	نوائے کفر (منوذر)
۳۰	نوبادوں (اثر)
۱۹۳	نور تجل (مبین)
۲۸۱	نیا قدم (ہندی)
۲۹۷	نیرنگ عشق (غنیہ)
۳۸۷	نیو ایر (ہفتہ وار، جید آباد)

و

واقعات و ادارات حکومت دہلی

۲۵	(بشیر الدین احمد)
۱۹۲	والڈی (تھوڈ)
۱۱۰	وہدائی (شار)
۲۱۳	وہدائی حافظ (منوذر)
۲۱۲	وہدائی (منوذر)
۲۱۰	وطن (روزنامہ، دہلی)

۲۱۸	مہتاب سخن (سرمدی)
۲۱۲	مہر منتقد (منوذر)
۲۳۲	مہات طاہر الدین غلی (حبیب)
۱۱۰	میر اکرام نوین (شار)
۱۱۰	میرا تہب کلام (شار)
۲۱۳	میری یاد (ماہنامہ، منوذر)
۱۹۳	میر گھوڑی (مبین)

ن

۲۸۱	ناغدا (ہفتہ وار)
۲۱۲	نالہ بیکس (منوذر)
۱۹۳	نادول کی تاریخ و تنقید (مبین)
۷۴	نابین حیات (خفا)
۳۰۶	نظر و رائے خیر آبادی (شکیل جعفری)
۳۷	نجم (نند تھان)
۱۹۳	نجم اکسرس (مبین)
۲۸۱	نجم (روزنامہ)
۲۱۲	نقد ادب (منوذر)
۱۹۹	نقد و فکر (الک رام)
۱۶۶	نقد و روشنی (الک و منوذر)
۲۲۰	نہیم سحر (جلالوں)
۲۱۲	نہیم مرغان (منوذر)
۱۳۷	نشا و رفقا (عندلیب)
۱۸۲	نشان (روہ جامی)
۳۹	نصرت (بیک)
۱۱۹	نظریں ناظر (ناظر)

۴۴۴	ہندستان اقبال تاریخ (حبیب)	۱۴۴	ملی انجمن تحریک (آظر)
	ہندستان میں تعلیم کی ارسیر تنظیم	۳۹	دیر چترائی (آفتاب)
۱۰۸	(زاگر حسین)		۵
۳۹	ہندستانی سورا (آفتاب)	۹۵	ہزار داستان (ماہنامہ لاہور)
۴۴	ہندوؤں میں گورو (رضی)	۲۹۲	ہندی آف غلامی
	می	۲۴۱	ہفت احمد (ضیا)
۱۸۲	یاد کی خوشبو (جامی)	۳۰	پلاک قریب (اثر)
۱۰۳	یادگار غالب (حالی)	۳۰	پلال (روزنامہ بجلی)
۱۹۰	یادگار میکہ (عبدالشکور)	۱۹۳	پیارا گائون (حسینی)
۲۱۳	یوگ سار (منور)	۱۹۳	پماری اردو شاعری (حسینی)
		۳۱۲، ۳۱۱	پہا یوں (ماہنامہ لاہور)

### پروسی کے خطوط



مصنف: میرزا اسد اللہ خاں

صفحات: 216

قیمت: 65 روپے

### تعلیم و تربیت اور والدین



مصنف: میرزا اسد اللہ خاں

صفحات: 176

قیمت: 68 روپے

### رائگ فہر



مصنف: خلیفہ فرحت

صفحات: 96

قیمت: 43 روپے

### گنودان



مصنف: میرزا اسد اللہ خاں

صفحات: 464

قیمت: 110 روپے

### قالب اردو کلام کا انتخاب



مصنف: محمد حبیب

صفحات: 132

قیمت: 59 روپے

### مسلمان اور عصری مسائل



مصنف: سید عابد حسین

صفحات: 168

قیمت: 67 روپے

### اپنے دکھ بھگتے دو



مصنف: راجندر سنگھ بیدی

صفحات: 240

قیمت: 70 روپے

### معارفان جامعہ



مصنف: مظفر احمد گھامی

صفحات: 288

قیمت: 95 روپے

₹ 136/-

ISBN : 978-81-7367-658-3

